قسطنطنیہ

تصنیف : ہیرلڈ لیم
ترجمہ و تالیف : غلام رسول مہر



عہدِ ماقبلِ اسلام
سے
اسلامی عہد تک
کی
مکمل تاریخ

قسطنطنیہ یا استنبول

(اڑھائی ہزار سال کی سرگزشت)

قسطنطنیہ یا استنبول

(اڑھائی ہزار سال کی سرگزشت)

جو

تین حصّوں پر مشتمل ہے اور جس میں پانچویں صدی قبل مسیح سے
اب تک اِس شہرۂ آفاق شہر کی مکمّل داستان پیش کی گئی ہے

تصنیف: ——— ہیرلڈ لیمب

ترجمہ بہ تلخیص و اضافۂ ابواب: ——— مولانا غلام رسول مہر

ناشرات

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

کشمیری بازار	خیبر روڈ	ہسپتال روڈ	بندر روڈ	اُردو بازار
لاہور	پشاور	حیدرآباد	کراچی	لاہور

This is an authorized Urdu translation in condensation of Constantinople: BIRTH OF AN EMPIRE by Harold Lamb. Copyright 1957 by Harold Lamb. Published by Alfred A. Knopf Inc., New York. Urdu Chapters have been added on the later history of the City.

طبعِ اوّل .... سنہ ۱۹۶۳ء

تعداد .... دو ہزار ایک سو

طابع .... شیخ نیاز احمد

مطبع .... علمی پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت فی جلد .... [illegible] روپے

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور

باشتراک

مؤسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن - لاہور — نیویارک

فہرست ابواب

پہلا حصہ

(از ہیرلڈ لیم)

سنہ ۶۵۰ ق-م — سنہ ۶۶۵ء

دوسرا حصہ

(از مؤلف)

سنہ ۶۶۵ء — سنہ ۱۹۲۴ء

تیسرا حصّہ

(از مؤلف)

(استنبول کے مناظر اور گرد و پیش)

مقدّمہ

یہ کتاب ایک شہر کی سرگزشت ہے۔ پہلے بھی دُنیا میں اس سے زیادہ مقدس اور زیادہ عظیم المنزلت شہر موجود تھے، اور آج بھی موجود ہیں۔ لیکن اس شہر کو جن نادر خصوصیّتوں سے قدرت نے نوازا، وہ غالباً کسی دوسرے شہر کو حاصل نہ ہو سکیں۔ مثلاً موقع، محل اور ماحول کے اعتبار سے روئے زمین پر اپنی مثال آپ ہے۔ پھر ایسے شہر بہت کم نکلیں گے جن کی اڑھائی ہزار سال کی سرگزشت کسی نہ کسی نقطۂ نگاہ سے بندگانِ خدا کے لیے مفید نیز اقوام و امم کے لیے محلِ رشک اور جاذبِ توجہ رہی ہو۔ ابتدائی سات آٹھ سو سال میں اس شہر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ شرق و غرب کے درمیان ایک موزوں تجارتی مرکز تھا۔ اور یہاں کے صرف تاجر ہی نہیں۔ بلکہ ماہی گیر بھی خوب دولت کماتے تھے۔ چوتھی صدی عیسوی کے ربعِ اوّل میں اس نے یکایک ایک بڑی سلطنت کے پائے تخت کی حیثیت حاصل کر لی۔ پھر ہمارے زمانے تک اس کی یہ حیثیت قائم رہی۔ سلطنتیں بنیں اور بگڑیں۔ بادشاہ زینتِ آرائے تاج و تخت ہوئے اور باری باری رخصت ہو گئے۔ لیکن اس شہر کی بلند پایہ مرکزیّت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ یہاں تک کہ دائرۂ فاتح حکومت کی اضافی اہمیت چھن جانے کے باوجود اس کا طرّۂ عظمت بدستور آسمان بوس ہے۔

مسیحیّت کو فروغ و ہردلعزیزی حاصل ہوئی تو یہ شہر آرتھوڈکس یا مسیحیّت کی مشرقی شاخ کا سب سے بڑا مرکز بن گیا اور اس کی یہ حیثیّت وقتی تغیّرات کے باوجود اُس وقت تک قائم رہی، جب تک یہ عثمانیوں کے قبضے میں نہ آیا۔ عثمانیوں نے بھی اس کی بلند مذہبی حیثیت سے قطعاً تعرّض نہ کیا۔ لیکن عثمانی سلطنت کا پائے تخت بن جانے کے بعد اس کی مذہبی مرکزیت کا وہ مرتبہ قائم نہ رہا، جو اسے پہلے حاصل تھا۔ اگرچہ پیشتر کے اکثر مرکزی شہنشاہ نہ مسیحیت کے لیے باعثِ فخر تھے اور نہ شہنشاہی کے لیے۔ عثمانیوں کے قبضے میں آجانے کے چونسٹھ سال بعد یہ شہر مقامِ خلافت ہونے کے اعتبار سے دُنیائے اسلام کی عقیدتوں کا مرجع بن گیا اور یہ حالت ۱۹۲۴ء تک قائم رہی۔ یقیناً اس شہر کی یہ آخری خصوصیت زائل ہو جانے کے بعد اس کے وقار، وقعت اور اک گونہ تقدّس کو نقصان پہنچا۔ لیکن جو شہر اڑھائی ہزار سال سے تاریخِ عالم میں ممتاز رہا اس کی شانِ امتیاز وہ رتبہ حاصل کر گئی تھی جس کے بعد اس کی عزّت یا شہرت سنگ و خشت کی معجز کاریوں یا دوسری ضمنی و ذیلی خصوصیتوں سے بالکل بے نیاز ہو گئی تھی۔ قسطنطنیہ یا استنبول بھی درجہ حاصل کر چکا ہے۔ یقیناً اس کی سرگزشت قوموں اور ملکوں کی سرگزشت کی طرح ہر صاحبِ ذوق کو دعوتِ

نظر و فکر دے رہا ہے۔

کتاب کی ترتیب بھی تھوڑی سی تفصیل کی متقاضی ہے۔ یعنی قارئین کرام کی خدمت میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے، کہ کتاب ملاحظہ فرمانے سے پیشتر وہ جان لیں، اس کی تدوین کن کن مراحل سے گزری۔ امریکہ کے مشہور مصنف ہیرلڈ لیم نے جو چنگیز، تیمور، سکندر وغیرہ کے متعلق کتابیں لکھ کر خاص شہرت حاصل کر چکا ہے۔ ایک مختصر سی کتاب کانسٹینٹینوپل (قسطنطنیہ) کے نام سے بھی لکھی تھی۔ جس میں اصلاً قیصر جسٹینین کے عہد کی کیفیت پیش کرنا منظور تھا اور ضمناً ابتدائی حالات بھی اختصار سے بیان کر دیئے گئے تھے۔ پیش نظر کتاب کا پہلا حصہ ہیرلڈ لیم کی اس کتاب کی تلخیص ہے۔ جس میں کوئی ضروری واقعہ حتی الامکان نظر انداز نہیں کیا گیا۔ یہ سرگذشت ۵۶۵ء پر ختم ہو گئی

دوسرے حصے میں ساتویں صدی عیسوی کے وسط سے ۱۹۲۴ء تک وہ تاریخی حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ جن کے بغیر شہر کی سرگذشت پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ کم و بیش بارہ سو سال کے اہم تاریخی واقعات کا ایسا مرقع ہے۔ جس کی آرائش کے لیے بیسیوں تاریخی دفتروں کی ورق گردانی کرنی پڑی۔ پھر جو حقائق اس میں آگئے ہیں۔ وہ ہر تاریخی کتاب میں نہ مل سکیں گے۔ جس طرح پہلے حصے میں گوناگوں اصطلاحات اور غریب الاسماء مقامات کے متعلق حواشی میں پوری تشریح کر دی گئی تھی۔ اسی طرح دوسرے حصے میں بھی ایسی تصریحات کا خاص خیال رکھا گیا ہے، تاکہ خوانندگانِ محترم بہ سہولت کتاب سے استفادہ فرما سکیں۔ بے شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس مرقع میں جو کچھ آگیا ہے، اس سے بعض بڑی اور مفصل تاریخوں کے اوراق بھی آپ خالی پائیں گے۔

تیسرے حصے میں شہر کے مناظر، ماحول، اہم مقامات، تاریخی مساجد و عمارات نیز علمی و فنی نوادر کا اجمالی نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ نقشہ ان تمام سیاحت ناموں اور مرقعوں کا نچوڑ ہے، جو استنبول کی سیر کرنے والوں نے لکھے غالباً بہت ہی کم مقامات ہوں گے جن کے تقریباً ہر دور میں ان کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا گیا، لیکن استنبول کا کوئی بھی دور ایسے مرقعوں سے خالی نہ رہا۔ اس ذخیرے میں سے جو کچھ دستیاب ہو سکا، میں نے اس سے استفادے میں کوتاہی نہ کی اور یہ تمام معلومات تیسرے حصے کے سات ابواب میں پھیلا دی ہیں۔ یہ عرض کرنا غیر ضروری ہے کہ ان مطالب کے اخذ و بیان میں یہ امر پیش نظر رہا کہ وہی چیزیں مذکور ہوں، جن کی اہمیت مسلم ہے اور ان سے بیرونی اہل نظر کو خاص دلچسپی ہو سکتی ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اپنے مقاصد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں۔ اتنا جانتا ہوں کہ استنبول کے متعلق اس قسم کی جامع اور مختصر تاریخی و معلوماتی کتاب میرے علم کے مطابق اُردو زبان میں کوئی نہ تھی اور میں نے اپنی بساط کے مطابق اس ضرورت کو پورا کرنے کی سعی کی خدا کرے میری یہ سعی مشکور ہو، آمین!

پیش لفظ

یہ ایک ایسے شہر کی داستان ہے، جسے ایک بہت بڑے حادثے کے نیچے کھچے آدمیوں نے تعمیر کیا۔ بڑے حادثوں کے نیچے کھچے آدمی، اکثر و بیشتر بہ لحاظ نسل ایک نہیں ہوتے، بلکہ ان میں مختلف نسلوں کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ جان و مال کی حفاظت کے لیے نہیں، اپنے طریق زندگی کی حفاظت کے لیے متحد ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے خاصی تمرد اور ہٹ کا مظاہرہ کیا اور شہر کی حوالگی سے ہمیشہ انکار کرتے رہے۔ انکار کا یہ دور تقریباً ایک ہزار سال پر پھیلا ہوا ہے۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے تاریخ میں بیزنطینیوں کا نام پایا۔ رومی سلطنت کے مغربی حصّے پر ۴۰۰ء اور ۴۵۰ء کے درمیان طویل مدت تک دھندلکا چھایا رہا۔ پھر وہ تاریکی پھیل گئی۔ جسے قرونِ وسطیٰ کے ابتدائی دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تاہم مشرق میں بیزنطینیوں کا شہر مصائب و حوادث کے تلخ تجربات سے گزرتا رہا، اور ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح رات کے سائے دُور رکھنے کا انتظام کر ہی لیا۔

اس شہر کے متعدد نام رکھے گئے، جن میں "قسطنطنیہ" اور "شہرِ محفوظ" بھی شامل ہیں۔ پھر اسے سب بیزنطیم[۱] کہنے لگے۔ اپنے باشندوں کی طرح شہر میں بھی ایک خصوصیت تھی۔ یہ خشکی کی ایک چھوٹی سی نوک پر واقع تھا، جو مدوجزر سے محفوظ زمین بند سمندروں[۲] میں آگے بڑھی ہوئی تھی۔ اور یہی وہ مقام ہے، جہاں تین براعظم ——— یورپ، ایشیا اور افریقہ ——— زیادہ سے زیادہ قریب آگئے تھے۔[۳] عہدِ قدیم کی کاروانی شاہراہیں اس کی طرف جاتی تھیں۔ اور یہیں سے بڑے دریا خشکی میں اندر کی طرف حمل و نقل کا ذریعہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں جن آبی راستوں کے ذریعے سے براعظموں کے اندر پہنچنا ممکن تھا، وہ خشکی کے اس خطّے کی حفاظت کا فرض بھی انجام دے رہے تھے، جس پر قسطنطنیہ واقع تھا۔ بحیرۂ روم کی قدیم تہذیب کو غالباً اور کسی مقام پر محفوظ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

---

[۱] BYZANTIUM یونانیوں نے باہر کے ملکوں میں نو آبادیاں قائم کیں تو اہلِ میگارا (جنوبی یونان) نے ایک بستی آبنائے باسفورس کے دہانے پر بسائی۔ یہ ایشیائی ساحل پر تھی۔ جو آگے چل کر کیلسی ڈون (موجودہ قاضی کوئی) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ۶۵۸ ق م کا واقعہ ہے۔ تقریباً تیس سال بعد بیزاس (BYZAS) شاہ میگارا نے قسطنطنیہ کے مقام پر ایک نئی بستی بسائی اور اس کا نام بیزنطیم رکھا۔ [۲] زمین بند سمندروں سے بحیرہ مرمرا اور آس پاس کی کھاڑیاں نیز باسفورس اور بحیرۂ اسود مراد ہیں جہاں بڑے سمندروں کی طرح موجیں نہیں اٹھتیں۔ [۳] ایشیا اور یورپ تو آبنائے باسفورس پر تقریباً مل گئے ہیں۔ صرف آٹھ سو گز سمندر بیچ میں رہ جاتا ہے۔ افریقہ اور ایشیا جزیرہ نمائے سینا پر (نہر سویز سے

اس شہر کی حفاظت کا فرض انجام دینے والے آدمیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، جنہوں نے طویل زندگیاں اسی کام کی نذر کر دیں۔ ہماری داستان کا تعلق صرف ایک صدی سے ہے۔ یعنی چھٹی صدی عیسوی سے اس صدی کے بڑے حصّے کو بجا طور پر "عہد جسٹینین"[1] کہا جاتا ہے۔ یقیناً یہ زرّیں دور نہ تھا، جیسا کہ اُسے سمجھا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کی قدریں محفوظ رکھنے کے لیئے انتہائی جد و جہد سے اس دور کی تشکیل ہوئی اور اسی سے ایک غیر متوقع شئے برآمد ہوئی۔ جس کا پورا اندازہ اب تک نہیں کیا جا سکا۔

قسطنطنیہ کے باشندوں نے اپنی فضا کے دھندلکے کو ایک نئے دور کی صبح صادق میں تبدیل کر دیا۔ وہی صبح صادق جس سے قرونِ حاضرہ کا آفتاب طلوع ہوا۔ ہم یونان کے اوج و عروج یا روم کے جاہ و جلال کے وارث نہیں بلکہ اس جد و جہد کے وارث ہیں، جو سمندروں کے درمیان اس شہر میں چودہ سو سال پیشتر ہوئی

پیشتر ماٹے ہوئے تھے۔ اور یقیناً تین برّاعظموں میں زیادہ سے زیادہ قریب یہی مقام ہے۔

THE AGE OF JUSTINIAN [1]

پہلا حصّہ

۶۵۰ ق۔م۔ ۶۶۵ء

پہلا باب

ایک دور کا اختتام

مغربی یورپ میں ہمارے اجداد کی پہلی تہذیب کا آغاز شہروں میں ہوا اور وہیں یہ ٹھہری رہی۔ یہ تاریخی دور سے پیشتر کریٹ سے مائیسی نا[1] اور وہاں سے ایتھنز پہنچی۔ منوی اور یونانی تہذیب کی آغوش میں پرورش پانے والے لوگوں کے اوضاع و اطوار شہری ریاستوں کے ذریعے سے صورت پذیر ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو اپنے سے باہر دنیا کی وسعت کا ابتداء میں کوئی صحیح اندازہ نہ تھا۔

منوی اور یونانی تہذیب اصلاً بحری تہذیب تھی اور وہ بندرگاہوں کی محفوظ دیواروں میں پناہ لیتی رہی۔ غالباً خود بحیرۂ روم شہری ریاستوں کی علیحدگی کا باعث بنا۔ عہد قدیم کے ملاح جو کھلی کشتیوں میں سفر کرتے تھے۔ سمندر میں دُور دُور تک نہیں جا سکتے تھے۔ جگہ جگہ جزیرہ نما، جزیرے اور مجمع الجزائر موجود تھے۔ بحیرۂ روم کی مختلف شاخیں خشکی کے اندر گھسی ہوئی تھیں۔ عہد قدیم کے ہئیت دان انہیں الگ الگ سمندر سمجھتے تھے۔ مثلاً بحیرۂ ایجئین، آئی اونیا، بحیرۂ ایڈریاٹک، اسی طرح یہ تقسیم بحیرۂ اسود تک چلی جاتی تھی۔

اگرچہ بحیرۂ روم اس طرح منقسم ہو گیا تھا، تاہم وہ اپنے سواحل پر بسنے والے باشندوں کے لئے قدرت کی ایک حیات بخش نعمت تھا۔ اس کی حرارت چھوٹے چھوٹے دریاؤں کو برف سے پاک رکھتی تھی۔ آس پاس کی زمین بارشوں کی کثرت کے باعث زرخیز تھی اور جگہ جگہ گھنے جنگل موجود تھے۔ سب سے پہلے قرطاجنہ کے بحر پیماؤں نے اس سمندر کے سواحل پر جابجا تجارتی مرکزوں کا سلسلہ قائم کیا۔ رومیوں نے ایک بیڑا تعمیر کر کے پہلے پہل قوت حاصل کی اور قرطاجنہ کو بے دردی سے تباہ کر دیا، جسے بحیرۂ روم پر اقتدار حاصل تھا۔ رومی شہنشاہوں کی قوت شمال میں دریائے ڈینیوب نیز دریائے رھائن اور جنوب میں صحرائے اعظم سے آگے نہ بڑھی۔ اگر بڑھتی تو اس کا انجام اچھا نہ ہوا۔

روما کی قوت ایک اور تفریق کو ختم کرتی ہوئی معرض ظہور میں آئی تھی۔ اس سے مراد انسانی اوہام ہیں۔ مغرب میں قدیم شہری ریاستیں "عبادت گاہوں" کے اردگرد وجود پذیر ہوئی تھیں، جہاں ہر وقت مقدس آگ

---

[1] MYCENAE جنوبی یونان کا ایک قدیم شہر۔

روشن رہتی تھی۔ ہر ریاست اپنے دیوتاؤں اور اپنی سرزمین میں مدفون اجداد کے لئے قربانیاں کرتی۔ پانچویں صدی قبل مسیح کو یونان کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں بھی اہل ایتھنز اپنے غیر مرئی حکمرانوں یعنی دیوتاؤں کے لیے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ یہ دیوتا اپنی رضامندی کا اظہار شگونوں کے ذریعے کرتے تھے۔ اسلاف کی روحوں کی یہ پرستش عرصہ دراز تک قائم رہی۔ لیکن شہری ریاست کے اقتدار کی گرفت بھی ان غیر مرئی طاقتوں سے کم نہ تھی۔ افلاطون جیسا فلسفی بھی بچوں کو والدین سے زیادہ شہری ریاست کی ملکیت قرار دیتا ہے۔

روما کے اندر مختلف قوموں اور گروہوں کے لوگ رہتے تھے۔ اور اس کے قدیم چوک کے آس پاس جتنی عبادت گاہیں تھیں۔ ان میں بہت سے معبود موجود تھے۔ مثلاً لیٹیم[1] سے مشتری اور اٹرووریا سے زہرہ کی پرستش روما میں پہنچی تھی۔ لہذا قانون سازی میں بھی اٹروریا[2] یا لیٹیم کے قواعد و ضوابط کو ترجیح دی گئی۔ اس طرح یونان کی دھلانی شہری ریاستوں کے برعکس روما کی طاقت نے ایک مرکزی ریاست کی حیثیت سے نشو و نما پائی۔ یونان کی شہری ریاستوں میں سقراط یہ وعظ کر سکتا تھا کہ جو روایتیں ظلم و استبداد پر مبنی ہیں ان کے خلاف انسان کو ضمیر کی آواز پر کان دھرنا چاہیئے۔ جب یونانیوں میں روشن خیالی پیدا ہوئی تو انہوں نے شہروں کے بجائے سیاسی مقاصد یا مجلسی طبقات کو اپنی عقیدت کا مرکز بنا لیا۔ لیکن روما میں ایسا کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔ جب سلطنت کی حدیں بہت پھیل گئیں تو رومی شہریت کے حقوق نے بھی بے حد وسعت اختیار کر لی۔ شہریت کی بدولت ہر شخص کو دوسرے لوگوں پر محض فوقیت ہی حاصل نہ ہوتی تھی بلکہ زندگی کی راحتیں بھی بڑھ جاتی تھیں۔ اگرچہ نچلے طبقے میں روایات کا چنداں احترام نہ کیا جاتا تھا۔ تاہم وہ دولت مندوں کے زیر سایہ آرام کی زندگی بسر کرنے پر مطمئن تھے۔

مفتوحہ علاقوں میں کبھی کوئی ایسی بغاوت نہ اٹھی جو حکمران شہر کے لئے خطرے کا باعث بن جاتی۔ روما ابتدا میں رواداری کے مسلک پہ کاربند تھا۔ اس نے مفتوحہ علاقوں کو حق دے دیا تھا کہ اپنی انتظامی مجلسیں قائم رکھیں بلکہ ان کے رسم و رواج سے بھی تعرض نہ کیا جاتا تھا۔ ان کے مقامی دیوتاؤں کو روما کے دارالاصنام میں عزت کی جگہ مل گئی تھی۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ تمام حقوق صرف شہریوں کو حاصل تھے، اور محنت و مشقت یا تو غلاموں سے لی جاتی تھی یا دوسرے طبقوں کے آدمیوں سے۔

رومی سلطنت کو کسی زبردست دشمن سے سابقہ نہ پڑا۔ قرطاجنہ کی تباہی سے پورا بحیرۂ روم روما کے قبضے میں آگیا تھا۔ پھر منصوبے کے مطابق فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ روما کے شہری اس امر کے عادی

---

[1] LATIUM اٹلی کا ایک صوبہ جو کمپانیا اور ٹرولریا کے درمیان ہے۔ [2] ETRURIA

ہو گئے کہ ان کے شہنشاہ مختلف علاقے فتح کر کے آئیں تو شان و شکوہ سے ان کا استقبال کیا جائے۔

سنہ ۱۱۷ء تک روما ایک بہت بڑی مغربی سلطنت کا مرکز بن چکا تھا۔ کوئی حریف قوت موجود نہ تھی، جو اہل روما کو سرگرم عمل رکھتی۔ کوئی حریف ثقافت موجود نہ تھی۔ جو انہیں تن آسانی کے بستر سے اُٹھا دیتی رومی ثقافت کی توسیع و اشاعت کے لئے نہ مشنری موجود تھے، نہ جہاں گرد فلسفی۔ یونانی ہر لحظہ نئی زمینوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ رومیوں کو قدرت نے اس ذوق سے بھی بہرہ یاب نہیں کیا تھا۔ ان کی میکانکی ترقی کے ثبوت یعنی پانی کے بند اور شاہراہیں دور دراز سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن انھوں نے دُنیا کا جو نقشہ بنایا اس میں سلطنت کی صرف سڑکیں دکھائی گئی تھیں۔ جن لوگوں نے طبعیات کی اعلیٰ تربیت پائی تھی، وہ سڑکوں کی مساحت میں مصروف رہے۔ انھوں نے زندہ دل یونانیوں سے صرف تفریحی کھیل سیکھے اور یونانی موسیقی سے وہ اپنی دعوتوں میں رنگینی پیدا کرتے تھے۔ ارسطو نے مدّت العمر کی چھان بین سے جو کچھ فراہم کیا رومیوں نے اس میں سے صرف وہ چیزیں لے لیں، جو انھیں کار آمد نظر آئیں۔ مثلاً بھاپ کی ایجاد کا ہیولیٰ تیار ہو چکا تھا۔ رومیوں نے اس سے اپنے فرش گرم رکھنے کا کام لیا۔ ورجل[1] اپنے شعروں میں ان کا پروپیگنڈا کرتا رہا۔ اس نے کہا کہ رومیوں نے ستاروں کے نقشے بنانے اور کانسی سے زندہ چہرے پیدا کرنے کا کام" دوسروں کے لیئے چھوڑ دیا۔ یونانی خطیب رومی نوجوانوں کو تعلیم دیتے تھے۔ کریٹ کے ماہی گیر سمندر سے نادر چیزیں پکڑ کر لاتے۔ جو اربابِ ثروت کے دستر خوانوں کی زینت بنتیں۔ شام کے تاجر قسم قسم کے ریشمی پارچے، دولت مند خواتین کے مکانوں میں پہنچاتے۔ بحیرۂ روم کے مختلف حصّوں میں جو ثقافتیں پہلے تربیت پا چکی تھیں، انہیں رومیوں کے لیے کار آمد بنا دیا گیا۔ بربروں کے قافلے صحراؤں سے ہاتھی دانت زیورات کے لیئے اور سیاہ فام غلام محنت و مشقت کے لئے مہیّا کرتے۔ رومی جہاز ران نہیں بلکہ ایشیا کے ملّاح دُور افتادہ سمندروں سے ہندوستان کا سامان عیش و راحت روما پہنچاتے۔ رومی بیڑوں کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً افریقہ اور بحیرۂ اسود کے ساحلوں سے غلّہ لاتے رہیں۔ مصنوعات صوبوں میں بہت عمدہ بنتی تھیں۔ اور روما پہنچائی جاتی تھیں۔ دولت کی فراوانی تھی اور ہر درآمد کے لیئے قیمت ادا کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ موٹے کی بہم رسانی ختم ہو گئی اور مسلّح فوجوں کے لیئے آدمی بھی انہیں غیر متمدّن اقوام سے بھرتی کئے جاتے، جو مختلف صوبوں میں آباد تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فوجی قوّت کا اصل سہارا صرف وحشی اقوام

---

[1] VIRGIL مشہور رومی شاعر جو سنہ ق۔م میں پیدا ہوا اور ۱۹ سنہ ق۔م میں وفات پائی۔

کے لوگ رہ گئے ـــه۔

ان حقائق نے خطرے کے متعلق ایک حد تک احساس پیدا کر دیا اور بار بار کوشش کی گئی کہ روما کو ابتدائی دور کی سرگرمیوں سے از سر نو آشنا کیا جائے۔ لیکن خرابیوں کا جو دروازہ کھل چکا تھا، وہ بند نہ ہوا۔ انتظامات پہلے صرف امراء کے قبضے میں تھے۔ پھر دولت مند عوام اور زبردست فوجی قوت والے اشخاص ان انتظامات میں شریک ہو گئے۔ رومی کسان پہلے کھیتی باڑی میں حصہ داری پر لوگوں کو ملازم رکھنے لگے، پھر کھیتی باڑی غلاموں کے حوالے کر دی گئی۔ اس طرح یہ عظیم الشان شہر صوبوں اور غلاموں کا محتاج بن کر رہ گیا۔ اور اس کے باشندوں میں روح احساس پیدا کرنے کا خیال کسی کو نہ آیا۔ اگرچہ اس پر جانکنی کی حالت طاری تھی۔ لیکن یہ اندازہ کسی کو نہ ہو سکا کہ اندر ہی اندر شکست کے آثار نمودار ہو چکے ہیں۔ تیسری صدی عیسوی میں سلطنت کا پورا ڈھانچا داخلی کشمکشوں اور ان کی بدولت پیش آنے والی جنگوں میں ٹوٹ گیا۔ جنگوں سے اہل روما کو یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ ان کی تہذیب ختم ہو جائے گی۔ سلطنت کا ضعف و انحطاط ان وحشیوں پر زیادہ آشکارا تھا جو سرحدوں کے باہر رہتے تھے۔ تیسری صدی عیسوی کے داخلی صدمات کے بعد باہر کے لوگوں نے حملہ شروع کر دیا۔ مشرق میں صحرائی باشندوں نے قیصروں کی مزاحمت کی۔ شمالی سمت سے خانہ بدوشوں نے دریائی سرحدوں پر دباؤ ڈالا۔ اہل روما دنیا کے متعلق بے خبری کے باعث تکلیفیں اٹھا رہے تھے، تاہم انہیں فوجی خطرے کا اندازہ ہو گیا اور بڑی تیزی سے ان میں ردِ عمل شروع ہوا۔ صاف نظر آتا تھا کہ روما محصور ہوا جا رہا ہے۔ قیصر آریلین ـــه۱ (۲۷۰ء، ۲۷۵ء) نے جنگی محاذ مستحکم کر دیئے۔ شہر کے گرد ایک فصیل بنوا دی، جسے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ یہ آج بھی قائم ہے، لیکن آریلین کو فوجی افسروں کے ایک گروہ نے قتل کر دیا۔

اب بیرونی مذاہب کا اثر روما پر پڑنے لگا۔ ایشیا کے بڑے بڑے شہر فتح ہو چکے تھے۔ لیکن ان کی ثقافتیں باقی رہیں۔ صور نینوا کی طرح برباد ہو چکا تھا۔ لیکن وہ دوسرے کے لیے ایک اچھی میراث چھوڑ گیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ سلطنت کی تباہی سے تہذیب ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کا کوئی سبب ہم پر واضح نہیں۔ شاید ایشیائی قوموں نے ایک دوسرے سے وہ کچھ حاصل کیا تھا، جو ہمیں معلوم نہیں۔ شاید ان لوگوں کی بہبود شہر کی عادی زندگی پر اس حد تک منحصر نہ تھی۔ قوم موسیٰ مصر کے تعیشات چھوڑ کر اس لئے نکلی تھی کہ

ـــه مورخین کا بیان ہے کہ رومی تن آسانی اور راحت پسندی کے باعث فوجی خدمت سے نفور تھے۔ یہاں تک کہ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں بے طرح زخمی کر لیتے تھے۔ تاکہ فوجی خدمت کے قابل نہ رہیں مجبوراً وحشی اقوام کو بھرتی کیا جانے لگا۔ ـــه۱ AURELIAN

اپنا وطن حاصل کرے۔ یقیناً مشرق کے تمام بڑے بڑے مذاہب سیاسی حکومتوں کے حدود سے باہر رہے اور یہ تمام مذاہب خفیہ خفیہ لامذہب رُومہ میں پہنچ گئے۔ تکلیفیں بڑھ گئیں تو عوام روحانی مشاغل کے ذریعے سے اطمینان حاصل کرنے لگے۔ اب نہ شہر کے قدیم دیوتا ان کے تقاضوں کا جواب دیتے تھے، نہ عقل و دانش کی راہنمائی ان کے لئے تسلی کا کوئی وسیلہ بن سکتی تھی۔ تعلیم یافتہ متشککین تباہی کے اسباب واضح کر سکتے تھے۔ روایتی فلسفی نئی قدروں کی ضرورت کے حق میں دلیلیں دے سکتے تھے۔ لیکن ان پڑھ عوام کو صرف یہ آرزو تھی کہ کہیں سے امداد و اعانت میسّر ہو۔ یہ امداد ان مذاہب سے حاصل ہوئی جو خفیہ خفیہ رُومہ پہنچے تھے۔ جو لوگ ہر طرف سے نا اُمید ہو چکے تھے۔ انہیں ان مذاہب نے کسی غار یا کسی پوشیدہ مقام یا ہیکل میں مانی یا میتھرا (آفتاب)، یا یہوا یا حضرت مسیحؑ سے دعائیں کرنے کا طریقہ سکھا دیا۔ جو لوگ دعائیں کرتے تھے۔ ان کے دل میں ایک اُمید پیدا ہوئی۔ جس سے وہ پیشتر بالکل محروم تھے۔ تیسری صدی عیسوی کے اواخر میں ڈلمیشیا کے ایک فرومایہ فرد کو رومی سلطنت کا انجام نظر آگیا۔ اس نے سرگرمی سے اپنی پیش بینی کے مطابق کام شروع کر دیا اور بہ زورِ شمشیر اپنا راستہ صاف کرتا ہوا قیصروں کے تخت پر جا بیٹھا۔ یہ گیئس آریلیئس ڈایوکلیشن[1] تھا (۲۸۴ء ہ ۳۰۵ء) جس نے اپنی ساری جد و جہد رومی سلطنت کی بقا کے لئے وقف کر دی۔ عالمگیر رومی سلطنت کی اعلیٰ تہذیب میں ایسے جوہر موجود تھے۔ جن سے کام لے کر حملہ آوروں کو پسپا کر دیا گیا۔ ڈایوکلیشن نے پورے نظامِ حکومت کو فوجی رنگ دے دیا۔ تمام سرکاری کارکن اس کے تابع فرمان ہو گئے۔ وہ عوام سے الگ تھلگ رہنے لگا اور مشرقی بادشاہوں کی طرح فاخرہ ریشمی لباس پہنتا۔ جو لوگ اس کی بارگاہ میں پیش ہوتے۔ ان کے لئے لازم قرار دیا گیا کہ زمین چومیں اور سجدہ کریں۔ اس نے بعض قدیم روایتیں برقرار رکھیں۔ مثلاً اپنے لئے شہنشاہ کا نہیں بلکہ آقا اور مالک کا لقب تجویز کیا۔ لیکن اپنے ہر حکم کو آسمانی حکم کا درجہ دے دیا۔ اور اس طرح ابتدائی دور کے قیصروں کی شانِ مطلق العنانی بحال کر دی۔ جنسوں کی قیمتیں مقرر کر دی گئیں۔ محافظ شہنشاہی فوج کی بارکیں توڑ کر بڑے بڑے حمام بنا دیئے گئے۔ لیکن خود اپنے لئے اس نے نکومیڈیا[2] میں ایک مرکز تعمیر کرایا اور تیز رفتار جہازوں

---

[1] GAIUS AURELIUS DIOCLETION

[2] NICOMEDIA بحیرۂ مرمرا کی ایک خلیج پر واقع ہے۔ جو بیزنطیم کے سامنے ایشیائی علاقے میں ہے۔ آج کل اس مقام کو اسمد کہتے ہیں۔

میں سوار ہو کر وہاں پہنچ گیا۔ ان وجوہ سے ان مذاہب کو تقویت حاصل ہوئی۔ جو خفیہ خفیہ رُومہ پہنچے تھے۔ ڈایوکلیشن کو مسیحیت کے خطرے کا احساس ہو گیا اور اس نے اس مذہب کے پیروؤں کی تعزیر و تعذیب کا حکم دے دیا۔ مگر اس طرح مسیحی کلیسا کو کوئی ضعف نہ پہنچا۔ آخر اس نے اپنے نو تعمیر محل میں بند ہو جانا مناسب سمجھا اور اپنے قائم کردہ نظام کی بقا کے لیے ایک اور شخص کو شریک اختیارات کر لیا اور دو شخصوں کو نائب شہنشاہ مقرر کیا۔ تاہم تاج و تخت کے لیے جو کشمکش شروع ہوئی، اس میں ڈایوکلیشن کا طے کیا ہوا منصوبہ برباد ہو گیا۔ اس ہنگامہ زار سے جو شخص کامیاب و فائز المرام نکلا، وہ بلقان کا ایک دوغلا تھا، جس نے قسطنطین کے نام سے دنیا میں شہرت پائی۔

دوسرا باب

قسطنطین اور قسطنطنیہ

قسطنطین[1] (۳۱۱ء – ۳۳۷ء) کے پاس ڈایوکلیشن سے زیادہ جنگی قوت تھی اور حقائق کا احساس بھی زیادہ تھا۔ اس نے فوج کو نئے مذہب (مسیحیت) سے پاک کرنے کی کوشش چھوڑ دی۔ اس کے برعکس مسیحیوں کی حفاظت کا اعلان کر دیا۔ اُسے صاف نظر آ رہا تھا کہ مسلح فوج کے بہترین آدمی اسی مذہب کو اچھا سمجھتے ہیں۔ غالباً اسے کچھ اندازہ نہ ہوگا کہ مسیحیت کے قبول کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ تاہم اس نے بڑے بڑے اسقفوں اور بطریقوں کی ایک مجلس بلائی۔ اس طرح کلیسا کے اقتدار پر رضائے شاہی کی مُہر ثبت کر دی۔ اس مجلس سے آئندہ صدیوں میں سراسر غیر متوقع نتیجے نکلے۔

جس حد تک عمائد و عوام رومہ کے احساس کا تعلق تھا، انہیں اپنے اقتدار میں کوئی کمی نظر نہ آتی تھی۔ قسطنطین بہ حیثیتِ شہنشاہ پہلی مرتبہ رُومہ پہنچا تو حسبِ دستور اس کے لیئے قدیم چوک کے پاس ایک محراب فتح تعمیر کر دی گئی۔ قسطنطین دیکھ رہا تھا کہ مغربی شہروں میں سکون و جمود پیدا ہو چلا ہے۔ میلان[2] سے کولون[3] تک جتنے شہر وجود پذیر ہوئے تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ فوج رہ سکے اور تجارتی قافلوں کی آمد و رفت میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ جب تجارت میں کمی آگئی تو شہروں کی رونق اور چہل پہل بھی ختم ہوگئی۔ بہرحال اُس نے فیصلہ کر لیا کہ پوری سلطنت کو اکٹھا رکھنے کی کوشش بالکل فضول ہے۔ اگرچہ وجوہ کی تصریح کبھی نہ کی۔ ساتھ ہی یہ طے کر لیا کہ مشرق میں ایک نئے شہر کی بنیاد رکھ دینی چاہیئے۔ جن آدمیوں کو سپہ گری کی بدولت تختِ حکومت ملا تھا، انہوں نے بھی رُومہ سے باہر میلان یا ریونا[4] میں اپنے لیئے مستقر بنوائے تھے، کیونکہ یہ مقامات ان سرحدوں سے قریب تھے، جہاں حملے کا خطرہ موجود تھا۔ ڈایوکلیشن نے بھی بحیرۂ ایڈریاٹک کے کنارے محل تعمیر کرایا تھا۔ تاہم وہ نکومیڈیا میں بیٹھ کر کاروبارِ حکومت کی نگرانی کرتا رہا۔ پہلے قسطنطین

---

[1] CONSTANTINE [2] MILAN شمالی اٹلی کا مشہور شہر [3] COLOGNE جرمنی کا شہر جو دریائے رھائن کے کنارے واقع ہے۔ [4] RAVENNA اٹلی کا ایک مشہور مقام، جو بولون سے مشرق میں بحیرہ ایڈریاٹک کے قریب واقع ہے۔

کا ارادہ تھا کہ اپنا مستقر ڈینیوب کے کنارے اپنے مولد سرسیم کے قریب قائم کرے۔ ممکن ہے، فوجی نقطۂ نگاہ سے یہ طریقِ عمل مناسب سمجھا گیا ہو کیونکہ جس میدانی فوج پر ہر طرف سے شدید دباؤ پڑ رہا تھا۔ اُس کے بیئے قابلِ اعتماد سپاہی صرف ڈلیشیا کے ساحل اور بلقان کی وادیوں سے ملتے تھے۔

قسطنطین نے نیئے دارالحکومت کے لیئے مناسب مقام کا انتخاب کرنا چاہا تو ڈلیشیا اور بلقان کے علاوہ اسکندریہ، افی سوس[1] اور انطاکیہ کی پُر رونق بندرگاہیں موجود تھیں۔ رومہ کو بھی ضرورت کی تمام چیزیں یا تو اندرونِ ملک سے ملتی تھیں یا افریقہ کے ساحل سے۔ یقیناً دانش و تدبّر کا تقاضا یہی تھا کہ نیا دارالحکومت اس مقام پر بنایا جاتا، جسے مشرق کی تجارت میں مرکز کی حیثیت حاصل ہوتی اور جو بیرونی حملوں کے تلاطم سے محفوظ ہوتا۔ قسطنطین کی توجہ کچھ مدّت کے لیئے اس پہاڑی پر جمی رہی جس پر کبھی ٹرائے[2] واقع تھا۔ اس نے کبھی نہ بتایا کہ ٹرائے کو کیوں ترک کیا یا انطاکیہ کو نظر انداز کرنے کی کون سی وجہ تھی، لیکن وہ اپنے اعمال کے لیئے وجوہ پیش کرنے پر کبھی مائل نہ ہوا۔ اس نے اپنے قابل ترین فرزند کو موت کے گھاٹ اُتروا دیا[3] اور اپنی بیوی کو حمام میں مروا دیا[4]۔ لیکن ان اعمال کے لیئے کبھی کوئی وجہ پیش نہ کی۔

وہ ایک کشتی میں سوار ہوا اور نیلے سمندر سے گزرتا ہوا خشکی کے ایک تنگ قطع پر پہنچا، جہاں تیز و تند ہوائیں چلتی تھیں۔ یہ قطع ایک چھوٹے سے سمندر کے کنارے پر واقع تھا۔ جسے شرق و غرب سے دو بڑے سمندروں نے گھیر رکھا تھا اور اس مقام کے قریب ہی قسطنطین نے آخری بڑی فتح حاصل کی تھی۔ اس جگہ پہلے سے بیزنطیم موجود تھا جس نے رومی سلطنت کے نشو وارتقاء میں کبھی کوئی حصّہ نہ لیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ قسطنطین رومہ کو اس لیئے چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہاں بت پرستی کی بے شمار یادگاریں

---

[1] EPHESUS افی سوس قدیم زمانے کا شہر جو موجودہ ایشیائے کوچک میں واقع تھا۔ ازمیر (سمرنا) سے پچاس میل کے فاصلے پر سلجوق ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس سے دو میل پرافی سوس کے کھنڈر ہیں۔ بعض لوگ اُسے افیس بھی لکھتے ہیں اور بعض نے "افوس" لکھا۔ میرے نزدیک زیادہ مناسب املا وہی ہے جو میں نے اختیار کیا۔ [2] TROY زمانہ قدیم کا مشہور شہر، جس کی لڑائی کے متعلق ہومر کی شہرہ آفاق نظم ایلیڈ لکھی گئی۔ اس شہر کو ایلیم بھی کہتے تھے۔ اسی وجہ سے ہومر نے نظم کا نام ایلیڈ رکھا۔ [3] اس فرزند کا نام کرسپس تھا۔ کہا جاتا ہے کہ قسطنطین کی دوسری بیوی فاسٹا اس سے ناجائز تعلقات کی خواہاں تھی۔ کرسپس نے انکار کر دیا تو فاسٹا نے الٹا اس پر الزام لگا دیا۔ اس طرح وہ بیچارہ مارا گیا۔ [4] فاسٹا پر یہ الزام لگا تھا کہ اس کا تعلق محل کے ایک غلام سے ہے۔ حمام کو خوب گرم کرا کے فاسٹا کو اس میں بند کر دیا گیا، یہاں تک کہ وہ مر گئی۔

موجود تھیں۔ اور وہ اس شہر میں جانا چاہتا تھا جس کے ساتھ مسیحی روایات وابستہ تھیں۔ ممکن ہے، یہ درست ہو لیکن بیزنطینی لوگ نہایت عجیب و غریب تھے۔ وہ اپنے آبی راستوں کے تمام مقامات سے تجارتی کاروبار کرتے رہے۔ لیکن انہوں نے کبھی کسی سے خلا ملا گوارا نہ کیا۔ وہ مقدونیہ کے فیلقوس سے قسطنطین تک، ہر فوجی ڈکٹیٹر کا مقابلہ کرتے رہے۔ لوگوں نے شگونوں کے افسانے وضع کر لیے۔ یہ داستان بھی تراش لی گئی کہ قسطنطین کو خواب میں اس جگہ کے انتخاب کا اشارہ ہوا تھا۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ نئے شہر کی تعمیر کے دوران میں قسطنطین کا دل مطمئن نہ تھا۔ اس نے مصر سے سنگ سماق کا ایک ستون منگوایا اور اسے اس جگہ نصب کرایا۔ جہاں اپنے نام کا چوک[1] بنوا رہا تھا۔ اور وہ مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس نے روما سے خفیہ خفیہ مقدس پیلیڈیم[2] کا بت منگوایا اور اسے ستون کے نیچے دفن کرا دیا۔ یہ درست ہو یا نہ ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس نے قسمت کی دیوی کا ایک مندر ضرور بنوایا تھا۔ اگرچہ بعد میں دیوی کی پیشانی پر صلیب پیوست کر دی گئی۔ اس نے اپنا بھی مجسمہ بنوایا۔ اپولو[3] دیوتا کے ایک بڑے بت کا سر کاٹ کر اس کی جگہ اپنا سر لگوا دیا۔ اور اس کے ساتھ سورج کی کرنوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ شہر کو مکمل کر لینے کی اتنی جلدی تھی کہ جہاں سے جو چیز ملی منگوائی گئی۔ یہاں تک کہ ڈیلفی کے مندر سے سانپوں والا ستون بھی اٹھا کر نئے شہر میں لے گئے۔

بیزنطیم چھوٹا سا شہر تھا۔ قسطنطین نے اپنے شہر کی حد اس سے بہت آگے رکھی۔ آخر ۱۱ مئی ۳۳۰ء کو پرانی رسم کے مطابق شہر کا افتتاح ہوا۔ اس وقت آفتاب برج قوس میں تھا۔ اور یونانیوں کے حساب کے مطابق دو سو چھہترواں اولمپیاڈ[4] تھا۔ قسطنطین نے شہر کا نام اینتھوسا[5] رکھا، جو خود روما کا ایک نام تھا لیکن وہ اسے نیا روما کہنے لگا۔ آخر لوگ اسے کانسٹنٹی نوپل (قسطنطنیہ) یعنی "شہر قسطنطین" کہنے لگے۔

---

[1] FORUM روما میں اس مقام کو کہتے تھے، جہاں عام لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ مختلف مسائل پر بحثیں ہوتی، تقریریں ہوتیں اور عدالتی مقدمات بھی وہیں فیصل کیے جاتے تھے۔ میں نے اس کے لیے چوک کا لفظ استعمال کیا۔ جس میں اجتماع کا مفہوم بھی شامل ہے۔

[2] PALLADIUM یہ لکڑی کا ایک بت تھا۔ جو اہل ٹرائے کے عقیدے کے مطابق آسمان سے اترا تھا۔ اور اس کی تاثیر یہ تھی کہ جب تک وہ بت ٹرائے میں رہے گا، شہر فتح نہ ہوگا۔ یونانی فتح ٹرائے کے بعد یہ بت نکال کر لے گئے۔ خود روما میں پیلیڈیم ایک ڈھال تھی اور اسے چوری سے محفوظ رکھنے کے لیے ویسی ہی چھ اور ڈھالیں بنا دی گئی تھیں۔ جن کا جلوس ہر سال نکالا کرتا تھا۔ قسطنطین نے نئے شہر کو تغیر سے محفوظ رکھنے کے لیے پیلیڈیم کو ستون کے نیچے دفن کرایا تھا۔

[3] APOLLO سورج دیوتا۔

[4] OLYMPIAD اولمپیائی کھیلوں کا آغاز ۷۷۶ ق۔م میں ہوا تھا۔ چار سال کے بعد یہ کھیل ہوتے تھے۔ یونان میں مدت تک سنین کے حساب کا سلسلہ اولمپیائی کھیلوں کی بنا پر

بہرحال قسطنطین مرکزِ حکومت نئے شہر میں منتقل کرنے کا عزم کیے بیٹھا تھا۔ بیزنطیم کے بالاحصار کی جگہ ایوانِ عمائد (سینیٹ[۱]) تعمیر ہوا جس کے آس پاس متعارف مجسموں کا ایک جنگل آراستہ کر دیا گیا۔ ہپوڈروم[۲] کے دوسری طرف منتخب رومی خاندانوں کے لیئے عمارتیں بنا دی گئیں۔ رومہ کے مکانوں کی طرح ان کے ساتھ خانہ باغ بھی تھے، لیکن بہت کم عمائد منتقل ہوئے۔ یقیناً نیا شہر دوسرا رومہ نہیں بن سکتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس مشرقی نوآبادی میں ویسے خنک، خوشگوار اور دلکش مقامات کہاں مل سکتے تھے۔ جو رومہ کے اردگرد موجود تھے۔ البتہ عوام کا خاصا بڑا حصّہ رومہ کو چھوڑ کر نئے شہر میں پہنچ گیا۔ کیونکہ شہنشاہ نے سب کے لیئے روٹی۔ روغن زیتون۔ شراب۔ لحم خنزیر اور لحم بقر کا اچھا انتظام کر دیا تھا۔ ۳۳۷ء میں اس نے یہ کہ کر تمام لوگوں کو "متحیر" کر دیا کہ میری وفات پر مسیحی رسمیں ادا کی جائیں۔ اس موقع پر اس نے اپنے آپ کو بندۂ خدا کہا۔ کسی کو احساس نہ تھا کہ قسطنطین نے ایک بالکل نئی اور حیرت انگیز چیز پیدا کر دی ہے۔ یعنی ایک مسیحی شہر کی بنیاد رکھ دی ہے، جہاں سے اس کے بیٹے فرمانروائی کریں گے۔

جیساکہ دُور اندیش آدمیوں کا خیال تھا، قسطنطین کے بیٹے کمزور ثابت ہوئے اور افراتفری پھیلی رہی۔ باہر سے بربریوں نے ہجوم کیا۔ پھر جولین تخت پر بیٹھا۔ جو بڑا فاضل تھا۔ اس نے فرنگیوں پر فتح حاصل کی۔ مسیحی اُسے "مرتد" قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اس نے مسیحی طور طریقوں کو ختم کر کے قدیم دیوتاؤں کی پرستش بحال کر دی تھی۔ یہ ۳۶۱ء سے ۳۶۳ء تک حکمران رہا۔ اور مشرقی سمت میں پیش قدمی کر رہا تھا کہ دریائے فرات کے کنارے ایک تیر لگنے سے مارا گیا۔

رومہ کے ذی اثر عمائد اسے "تقدیر کا چکر" سمجھتے رہے۔ انہیں یہ خیال بھی نہ ہُوا کہ باسفورس[۳] پر جو عارضی مرکزِ حکومت بنایا گیا ہے، وہاں رہنے والے شہنشاہ تقدیر سے مستحکم تر ثابت ہوں گے۔ جولین کی وفات پر صرف دس سال گزرے تھے، جب مشرق کا شہنشاہ ویلنز[۴] ہیڈریَن[۵] کے شہر میں گاتھوں کی تلواروں کا

جاری رہا۔ ۶۰، ۲ کو ۴ سے ضرب دے کر ۷۷۶ سے حساب کیا جائے تو ۳۲۸ نکلتے ہیں۔ گویا یہ دو سو چھہترواں اولمپیاڈ تھا۔ ؎

[۱] ANTHUSA [۱] SENATE [۲] HIPPODROME یعنی گھڑدوڑ کا میدان۔ اس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔

[۳] BOSPHORUS اس کے لفظی معنی ہیں راہ گاؤ۔ تفصیل آگے آئے گی۔ [۴] VALENS (۳۶۴ء - ۳۷۸ء)

[۵] HADRIAN اس نے جس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ اب تک ایڈریانوپل (شہر ہیڈرین) کے نام سے مشہور ہے۔ ترک اسے ادرنا کہتے ہیں۔

شکار ہوگیا تھا۔ عمائدین نے پرانے طریقے کے مطابق تقدیر اور فتح کی دیویوں کے لیے قربانی کی رسمیں ادا کیں۔ آخر کار ایک ہسپانوی نژاد شخص کو جس کا نام تھیوڈوسیس[1] تھا۔ فوج نے شہنشاہ بنا لیا۔ تھیوڈوسیس نیا مرکز چھوڑ کر روم چلا گیا۔ اور وہاں اس نے جرمن قبیلے ساتھ ملا کر دور دراز علاقوں کی وحشی قوموں کی پیش قدمی روک دی۔ دس سال تک یہ شخص تنہا حکمران رہا اور دریائے رھائن کی نہیں تو کم از کم دریائے ڈینیوب کی سرحد پختہ ہوگئی۔ یہی تھیوڈوسیس ہے جسے 'اعظم' کا لقب دیا گیا۔

۳۹۰ء میں ایک بغاوت تھسالونیکا میں پھوٹ پڑی۔ تھیوڈوسیس نے باغیوں کو شکست دی اور بہت بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میلان کے اسقف نے اس پر تھیوڈوسیس کو تاکید کی کہ اس ظلم کے لیے کفارہ ادا کرے۔ چنانچہ بادشاہ نے یہ حکم مان لیا۔ اس طرح کلیسا کا اقتدار شہنشاہوں پر پختہ ہو گیا۔ یہی تھیوڈوسیس تھا۔ جس نے قسطنطنیہ کے اردگرد فصیل تعمیر کرائی۔

اس شاہنشاہ نے ۳۹۵ء میں بعارضہ استسقاء وفات پائی۔ اس کے ایک کمسن بیٹے کو شہنشاہ بنا دیا گیا۔ نئے شہنشاہ کی بہن نے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور سنگین سہ گانہ فصیل تعمیر کرائی تاکہ قسطنطنیہ پر حملہ نہ ہو سکے۔ مگر ایک نوخیز لڑکا اور ایک عورت نازک وقت میں کس طرح حفظ و دفاع کا فرض انجام دے سکتے تھے؟ ادھر روم وحشیوں کی یورشوں کی جولان گاہ بن گیا تھا۔ ۴۱۰ء میں وزیگاتھوں (مغربی گاتھ) کا سردار ایلارک[2] پہریداروں کو رشوت دے کر شہر میں داخل ہوگیا اور تین روز تک غارت گری کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس غارت گری کے بعد روم کی حالت بے حد نازک ہوگئی۔ مشہور مسیحی بزرگ سینٹ جیروم[3] اس وقت بیت اللحم (فلسطین) کے ایک حجرے میں مقیم تھا۔ اس نے لکھا:

> جس عظیم الشان شہر نے دنیا بھر کو قبضے میں لے لیا تھا۔ وہ غیروں
> کے ہاتھوں مسخر ہوگیا ...... رومی دنیا تباہی کے غار میں گری جا رہی ہے۔
> لیکن ہمارے دماغ ہے میوں کے، سر بدستور بلند ہیں۔

اہل روم میں سے خدا جانے کتنے مرد و زن حملہ آوروں نے گرفتار کیے اور انہیں گراں قدر فدیے لے کر چھوڑا۔ ایک قونصل کی بیٹی نے لکھا کہ میں نے رقم دے کر اپنی دادی کو گاتھوں سے چھڑایا اور اس کے لیے ایک سفینہ کرایے پر لیا تاکہ وہ افریقہ پہنچ جائے۔ وہاں پہنچتے ہی مقامی گورنر نے اسے گرفتار کر لیا اور رقم لیے

---

[1] THEODOSIUS (۳۷۹ء - ۳۹۵ء) [2] ALARIC مغربی گاتھوں کا بادشاہ [3] ST. JEROME (۳۳۱ء - ۴۲۰ء)

پیچھا نہ چھوڑا۔ کہا جاتا ہے کہ اس گورنر نے ان رومی لڑکیوں کو جو اس نازک دور میں روما سے نکل کر افریقہ پہنچی تھیں، شامی بردہ فروشوں کے ہاتھ فروخت کرکے بے اندازہ دولت جمع کر لی۔ گال میں کوئی رومی حاکم باقی نہ رہا تھا۔ وینیشیا کی جاگیروں میں ہن گھوڑے چرلتے تھے۔ ہسپانیہ یا برطانیہ سے رسل و رسائل کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا (یہاں مصنف کے بیان کو تاریخی اعتبار سے مکمل کرنے کے لیئے اتنا بتا دینا چاہیئے کہ تھیوڈوسیس اعظم کے بعد اس کا بیٹا آرکیڈیئس[1] شہنشاہ بنا اور سنہ ۴۰۸ء میں وفات پائی۔ پھر آرکیڈیس کا بیٹا تھیوڈوسیس ثانی کے لقب سے شہنشاہ بنا۔ وہ بہت کمزور تھا۔ اس کے عہد میں وحشیوں کے حملے جاری رہے سنہ ۴۵۰ء میں تھیوڈوسیس کا داماد مارسیئن[2] شہنشاہ مشرق بن گیا۔ اور سات سال حکومت کی پھر لیو اول[3] لیو دوم اور زینو[4] یکے بعد دیگرے حکمراں ہوئے۔ سنہ ۴۹۱ء میں انسطاسیوس[5] کے سر پر تاج رکھا گیا۔ اس کے حالات مصنف نے خود بیان کئے ہیں۔)

---

[1] ARCADIUS (۳۹۵ء - ۴۰۸ء) [2] MARCIAN (۴۵۰ء - ۴۵۷ء) اس نے مشرقی گاتھوں، آسٹروگاتھ کو فوجی حلیف بنا کر اپنے علاقوں میں آباد ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ [3] LEO (۴۵۷ء - ۴۷۴ء) [4] ZENO (۴۷۴ء - ۴۹۱ء) لیو دوم اس کا بیٹا تھا۔ لیو اوّل نے اسے اپنا شریک کار بنا لیا تھا۔ لیکن وہ بہت جلد فوت ہو گیا۔

[5] ANASTASIUS (۴۹۱ء - ۵۱۸ء) سلافیوں کے حملے سے شہر کو بچانے کے لیئے اس نے بھی ایک فصیل بنائی تھی۔

تیسرا باب

جسٹینین کی ابتدائی زندگی

جس فرد نے جسٹینین کے لقب سے شہنشاہی تخت پر قدم رکھا، اس کی ابتدائی زندگی بالکل گمنامی میں گزری بلکہ وہ اس وقت تک گمنامی ہی کے دھندلکے میں رہا، جب تک اس کے با اقتدار بننے اور سلطنت کے لیے نیا نظامِ حکومت آراستہ کر دینے کا وقت نہ آیا۔ اس کا نام پیٹروس سبیٹیس[1] تھا۔ اس کے ماموں جسٹن کے سوا کسی کو اس کا خیال نہ تھا۔ سنہ ۵۰۰ء کے آس پاس وہ اپنے وطن مقدونیہ سے قسطنطنیہ پہنچا، جب اس کی عمر اٹھارہ سال کی ہو گی یعنی وہ نوجوان تھا اور یقیناً نئے ماحول سے متاثر ہوا ہو گا، لیکن اتنی عمر ہو چکی تھی کہ اس کے اوضاع و اطوار میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ وہ مقدونیہ کی چٹانوں اور خاموش چراگاہوں میں کسانوں کے درمیان پیدا ہوا، جہاں تمام لوگ ہاتھ کی محنت و مشقت سے روزی پیدا کرتے تھے۔ قسطنطنیہ آیا تو وہ اپنے اوصاف و خصائص ساتھ لایا۔ اس کا عزم چٹان کی طرح محکم تھا۔ ساتھ ہی وہ تخیّل سے بھی بہرہ مند تھا یعنی سوچ سکتا تھا کہ پہاڑیوں کے پیچھے کیا ہے۔

پیٹروس سبیٹیس (جسٹینین کا اصل نام) اپنے ماموں کے بلاوے پر وطن سے آیا تھا۔ روما کے نام کے لیے اس کے دل میں انتہائی عقیدت موجود تھی۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ جب ایٹیلا کے بلغاری ہنوں کی ترکتازیں شروع ہوئی تھیں تو بڑے بوڑھے بہت خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اس کا حافظہ غیر معمولی تھا اور حافظے کے سوا اس میں کوئی صلاحیت نظر نہیں آتی تھی، جو قسطنطین کے شہر میں ناموری حاصل کرنے کے لیے اس کی معاون بن سکتی۔

پیٹروس وطن سے قسطنطنیہ کی جانب روانہ ہوا تو شاہراہ پر پتھروں کا فرش بچھا ہوا تھا اور جگہ جگہ سنگہائے میل نصب تھے۔ قاصد گھوڑے دوڑاتے ہوئے آتے جاتے تھے اور جہاں چوکی آ جاتی، رک جاتے

---

[1] PETRUS SABBATIUS یہ جسٹینین کا اصل نام تھا۔ جسٹن کی ایک بہن بگلینیزا BIGLENIZA تھی، جس کی شادی سبیٹیس سے ہوئی تھی۔ اسی کا بیٹا پیٹروس تھا، جو اپنے چچا کے بعد شہنشاہ بنا۔

تاکہ نئی سواری لے کر آگے چلیں۔ جگہ جگہ شراب خانے بنے ہوئے تھے، جن کے دروازوں پر انگور کی بیلیں سایہ کر رہی تھیں۔ ان سے تیز رفتار گاڑیاں نکلتیں، جن کے روپہلی کنارے خوب چمکتے۔ اسی طرح یہ شاہراہ تاریک اور پُرسکون سمندر کے قریب پہنچ گئی، جہاں سرخ بادبانوں والے جہاز طلوع ہونے والے آفتاب کے پیامیوں کی صورت چلتے پھرتے نظر آتے۔

یقیناً مقدونیہ کے دہقان نے ایسا ساحل اور اس قسم کا سمندر کبھی نہ دیکھا تھا۔ شہر کے مضافات میں سب سے پہلے ہیبڈومون[1] آیا، جہاں شاہراہ پر درختوں کا گھنا سایہ تھا۔ سامنے میدان میں ارغوانی پتھروں کا ایک کوشک تھا، جس کے اردگرد لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ یکایک سانولے رنگ کے ایک راہب نے پکار کر کہا: "چلو، اپنی میراث کو سنبھالو۔ بھکاریوں کو کھانا کھلاؤ اور عذابِ دوزخ سے بچنے کا انتظام کرلو۔" جو لوگ کشتیوں میں بیٹھے جشن منا رہے تھے (اور کشتیاں کنارے آ گئی تھیں) انھوں نے اس داعیِ برکات کی طرف روپے پیسے پھینکنے شروع کیے۔

شاہراہ جس سہ گانہ دروازے پر ختم ہوئی، شہر وہاں سے بھی نظر نہ آتا تھا۔ اردگرد دہری فصیل کھڑی تھی۔ آخری دیوار کے بُرج انسانی قامت سے دہ چند بلند تھے۔ بیچ میں گہری خندق تھی، جسے ضرورت کے وقت پانی سے بھرا جا سکتا تھا۔ یہ فصیل "محفوظ شہر" کے اردگرد ستّرہ میل سے کم لمبی نہ ہوگی۔ اس کے اکثر حصّوں سے سمندر کا پانی ٹکرا رہا تھا۔

دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی رہگیر کی آنکھیں جگمگاتی مرمریں دیواروں سے چندھیا جاتی تھیں۔ سامنے اندرونی دروازہ تھا، جس میں سے کسانوں کی گاڑیاں اور تاجروں کے خچروں کی قطاریں لہروں کی طرح نکل رہی تھیں۔ ان پر خوشبودار مسالے اور صندل لدا ہوا تھا۔ یہ بابِ زرّیں[2] تھا جس کے اوپر تھیوڈوسیس کا مجسّمہ نصب تھا۔ اسی نے یہ دروازہ بنوایا تھا۔ مجسّمے کے ساتھ ہی نئے شہر کے خاص نشان بھی نصب تھے۔ یعنی دو سروالا برنجی رومی عقاب اور ایک پردار عورت، جسے فتح یا قسمت کی دیوی سمجھنا چاہیے، اس

---

[1] HEBDOMON فصیل سے باہر قسطنطنیہ کے مضافات کی ایک بستی، اس کا مقام نقشے میں ملاحظہ فرمائیے

[2] GOLDEN GATE اسے بابِ زرّیں غالباً اس لیے کہتے تھے کہ اس پر تھیوڈوسیس کا زرّیں مجسّمہ نصب تھا۔ بحرۂ مرمرا کی طرف سے فصیل کا یہ پہلا دروازہ تھا۔

نشان کے نیچے سنہری حروف میں مرقوم تھا: "جس نے یہ سنہری دروازہ بنوایا، وہ تمہارے لیے عہدِ زرّیں واپس لے آئے گا"۔ یہاں سے جو بازار شروع ہوتا تھا، اسے "شارعِ فتح"[1] کہتے تھے۔ لیکن لوگوں نے اس کا نام شارعِ اوسط[2] قرار دے لیا تھا۔ اس کے دونوں طرف ریشم، جواہرات اور ہاتھی دانت کے نوادر کی دکانیں تھیں۔ جگہ جگہ صراف ترازو لیے بیٹھے تھے۔ کہیں کہیں جوتشیوں نے مٹکوں کے سامنے بخور سلگا رکھے تھے اور پسی ہوئی پھٹکری انگاروں پر ڈالتے جاتے تھے۔

قسطنطین کے اس شہر کو پرانے روم سے کوئی مشابہت نہ تھی۔ یہ تجارتی شاہراہ پر واقع تھا اور سیلانی لوگ یہاں ٹھہر جاتے تھے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے گنبدوں والے گرجے تھے۔ البتہ رومی انجینئروں نے وسیع حوض بنا دیے تھے، جن میں سے بعض اوپر سے ڈھنپے ہوئے تھے۔ گہری بدروئیں تیار کر دی گئی تھیں، جو گندہ پانی سمندر میں پہنچا دیتی تھیں۔ ایک بلند مجسمہ تھا، جو ہوا سے گھومتا تھا۔ سیمسن نام ایک مخیّر نے ایک شفاخانہ بھی بنوا دیا تھا۔ تاہم ابھی سب کچھ ابتدائی حالت میں تھا۔ بندرگاہ کی حفاظت کے لیے صرف ایک بھاری زنجیر لگا دی گئی تھی، لیکن خود بندرگاہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ایک تنگ کھاڑی اندر کی طرف مڑ گئی تھی۔ شفق کا عکس اس کے پانی پر پڑتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ سمندر میں شفق پھوٹ ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے کھاڑی کا نام "شاخِ زرّیں"[3] مشہور ہو گیا۔ خود شہر اُس وقت تک آدمیوں کا ایک انبوہ تھا، جو فصیل کے اندر جمع ہو گیا تھا۔

جس سال پیٹروس قسطنطنیہ پہنچا، سرکاری آدمی شام کے وقت شہر کے ہر ضلع میں پھرتے اور ہر دروازے پر پکار پکار کر کہتے: "عالی منزلت شہنشاہ کا حکم ہے کہ تمام سنگ تراش، تمام معمار، نیلی پوشوں، سبز پوشوں اور سفید پوشوں کے تمام افراد صبح کے وقت طویل فصیل پر پہنچ جائیں۔ خدا تمہارے ساتھ ہو۔ شہنشاہ کا حکم مانو"۔ نیلی پوش اور سبز پوش جمہورِ شہر کے نمائندہ فریق تھے۔

لے TRIUMPHAL WAY   ۲ے MIDDLE WAY

۳ے GOLDEN HORN اس کی تفصیل موقع پر آئے گی۔ نام کی ایک توجیہ تو وہ ہے جو مصنّف نے پیش کر دی۔ ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ یہاں مچھلیاں بہ آسانی اور بکثرت پکڑی جاتی تھیں، جن سے بڑی دولت حاصل ہوتی تھی۔ اس وجہ سے کھاڑی کا نام شاخِ زرّیں پڑ گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "باب زرّین" سے چالیس میل کے فاصلے پر جزیرہ نما کے آخری حصّے میں ایک طویل فصیل تعمیر ہو رہی تھی تاکہ بلغاری ہنوں کی یورشیں روکی جا سکیں جو تھریس کی حدیں توڑ کر اندر آ گئے تھے۔ یورشوں کی روک تھام کے لیے جلد سے جلد فصیل تیار کر دینے کا کام زیادہ سے زیادہ کاریگروں کا متقاضی تھا اور شہنشاہ یعنی اناسٹاسیوس خود اس کام میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔

باب زرّیں کے قریب ایک پرانا گرجا تھا، جس کے پاس ایک باغ اور ایک خانقاہ بھی تھی۔ اس گرجے کو سٹوڈیون[1] کہتے تھے۔ وہاں ہر شخص کو پناہ مل جاتی۔ جو بھی دروازہ کھٹکھٹاتا اسے شوربا، روٹی، زیتون اور سونے کے لیے ایک گدّا ضرور مل جاتا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ گرجا ایک ممتاز قونسل نے بنوایا تھا جس کا نام سٹوڈیس[2] تھا اور ایلگزانڈر نام ایک بادشاہ راہبوں کو یہاں لایا تھا۔ ایلگزانڈر تاج و تخت چھوڑ کر امن و اطمینان کی تلاش میں ایشیا چلا گیا تھا اور وہاں ایک خانقاہ میں رہنے لگا۔ اس نے چاروں انجیلیں پڑھیں تو پوچھا: کیا یہ سب کچھ سچ ہے؟ جواب اثبات میں ملا تو اس نے کہا: "پھر ہم یسوع مسیحؑ کے ارشادات پر عمل کیوں نہیں کرتے؟"

غرض ایلگزانڈر نے ایک بڑا پیپا لے لیا اور اس میں دریائے فرات کے کنارے رہنے لگا۔ اپنے ہاتھ سے محنت کرتا۔ جو کچھ پاتا، لوگوں کی خدمت میں صرف کر دیتا۔ اس کے پاس بہت سے لوگ پہنچ گئے تو انھیں لے کر مناسب قیام گاہ کی تلاش میں نکلا۔ کسی ناظمِ خانقاہ نے بھوکے خانہ بدوشوں کے اس گروہِ عظیم کو پناہ نہ دی بلکہ انھیں مخلِ امن قرار دے کر گرفتار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ گشت کرتے کرتے ایلگزانڈر سٹوڈین پہنچ گیا۔ وہاں اسے اور اس کے ساتھیوں کو پناہ مل گئی اور گرجے کا دروازہ ہمیشہ کے لیے سب کے واسطے کھل گیا۔ پیٹروس کو اس گرجے اور خانقاہ کا امن و سکون بہت اچھا معلوم ہوا۔ چنانچہ وہاں وہ مطالعۂ کتب میں مصروف رہتا۔ اس وقت قسطنطنیہ کی آبادی سات لاکھ سے زیادہ تھی اور شہر انتظامی لحاظ سے چودہ ضلعوں میں منقسم تھا۔ ہر ضلع کا الگ ناظم، الگ ڈھنڈورچی اور پولیس کے الگ دستے تھے۔ پولیس کے ہر جوان کے پاس صرف ایک نیزہ ہوتا۔ وہ صیقل شدہ خود اور چمڑے کا کرتا پہنتا، جس پر ارغوانی رنگ کے عقاب کی تصویر چھپی ہوتی۔

---

[1] STUDION اس کا مقام نقشہ میں ملاحظہ فرمائیے۔ [2] STUDIUS

پیڑوس کے قسطنطنیہ پہنچنے کے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چودہ مختلف قوموں نے الگ الگ وطن بنا لیے ہیں۔ اصل شہرِ قسطنطنیہ کے پُرانے بازار اس وجہ سے تنگ و تاریک ہو گئے تھے کہ لوگوں نے مکانوں کے سامنے لکڑی کے سائبان بنا لیے تھے اور مکانوں کی کھڑکیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ آزاد کردہ غلام کارکنوں کے بال بچے بازاروں ہی میں رہتے تھے۔ بندرگاہ کا جو حصہ جہازوں کے قیام کے لیے مخصوص تھا، وہاں یونانی جزیروں کے نیم برہنہ ماہی گیر دھوپ تاپتے اور جال سُکھاتے۔

صبح کے وقت تھریس کے کسان گاڑیوں سے انگور یا انجیر کی ٹوکریاں اُتارتے، جن کے اندر پھلوں کی حفاظت کے لیے گھاس رکھی ہوتی۔ بازاروں میں بیٹھ کر پھل بیچتے۔ پیڑوس نے ایک روز صبح کو ایک لڑکے سے پھل خریدا اور پُوچھا کہ شہر پر حکومت کس کی ہے؟ لڑکے نے بے تکلف جواب دیا: "تین کی۔ محل کا مالک شہنشاہ ہے۔ کلیسا کا مالک خدا ہے اور گھڑ دوڑ کے میدان پر ہماری حکومت ہے۔ کیا تھیں علم نہ تھا کہ یہ تین یکساں حکمراں ہیں اور تین کا عدد بہترین عدد ہے؟"

پیڑوس کو کتب خانے سے خاص دلچسپی تھی، جس کے وسیع مستطیل ہال میں روشنی کے لیے فانوس آویزاں تھے۔ دیواروں کے ساتھ کتابیں آراستہ تھیں۔ ان میں ہر قسم کی کتابیں شامل تھیں۔ کتب خانے کے محافظوں نے بتایا کہ سب سے پہلے ڈیڑھ لاکھ جلدیں رس جولیس نے مہیا کی تھیں، جسے مرتد و ملعون سمجھا جاتا تھا۔ شہر کا حقیقی قابلِ فخر خزانہ یہی تھا۔ جو طلبہ مطالعے کے لیے آتے، یونانیوں کی طرح انھوں نے گھاگرا اور چھوٹا سا فرغل پہننا ہوتا۔

قسطنطنیہ کا کوئی بھی مقام پانی سے زیادہ دور نہ تھا۔ مشہور مضافات "شاخِ زرّیں" کے پار پہاڑیوں پر واقع تھے، جہاں تاجر سائی کائی[1] کی گودیوں کے قریب رہتے یا انھوں نے باسفورس کے پار کرسوپولس[2] کی سرسبز بلندیوں پر مکان بنا لیے تھے۔ جہاں باسفورس مرمرا سے ملتی تھی، وہاں کیلسی ڈون[3] کے گرجے اور پارک تھے۔ نکومیڈیا کی کھاڑی سے کشتیاں یہیں پہنچتی تھیں۔ سمندر میں جزیرے سب کے سب تقریباً یکساں تھے۔ ہر جزیرے کے ساحل پر ماہی گیروں کے بیڑے مقیم رہتے تھے اور پہاڑیوں کی

---

[1] SYCAE اس کا موجودہ نام غلطہ ہے۔ [2] CHRYSOPOLIS لفظی معنی شہرِ زریں یا بلدۃ الذہب۔ آج کل اسے اسکدار کہتے ہیں۔ [3] CHALCEDON یہ مقام آج کل قاضی کوئی کہلاتا ہے۔

چوٹیوں پر خانقاہیں بنی ہوئی تھیں۔

پیٹروس کا مکان ایک پہاڑی کی ڈھلان پر تھا، جو شاخِ زرّیں سے قریب تھی۔ یہاں اسے معلوم ہوا کہ شہر میں باشندوں کے لیے بعض غیر متوقع نعمتیں مہیا ہیں، مثلاً اس کے ضلعے میں ایک چھتّا تھا جہاں لکڑی کا ایک نمبر والا نشان دکھا کر دن بھر کے لیے شراب، روٹی اور روغن زیتون لیا جا سکتا تھا۔ کوئی بیمار ہو جاتا تو چوک میں پہنچ جاتا اور وہاں سرکاری طبیب سے نسخہ لکھوا لیتا۔ جو سپاہی رات کو پہرہ دیتے تھے، وہ آگ لگنے پر اسے بجھانے کا کام بھی انجام دیتے۔ سمندر کے کنارے ایک شفاخانہ تھا، جو دو نیک دل طبیبوں کے نام پر بنایا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک باغ تھا۔ بیمار کو کشتی پر سوار کرا کے وہاں لاتے اور باغ میں ٹھہراتے۔ معالج کہہ دیتے کہ رات کو یہیں آرام کرو۔ صبح کو اسے شراب اور پھل پیش کیے جاتے اور پوچھا جاتا کہ رات کو کوئی خواب دیکھا ہو تو بتاؤ۔ دل میں جو خیالات آئے ہیں، ان کا ذکر کرو۔ وہ بڑے اطمینان سے سب کچھ سنتے، پھر دوا تجویز کر دیتے اور بیمار صحت یابی کی امید لے کر واپس جاتا۔ پیٹروس کو بعض اوقات خیال ہوتا کہ یہ شفاخانہ مسیحیت کے لباس میں حکیم بقراط کے طور طریقوں سے کام لے رہا ہے۔

پیٹروس زیادہ وقت کتب خانے میں گزارتا اور وہ اسی طرح محنت کرتا، جس طرح اس کے ہم وطن کسان کھیتوں میں محنت کرتے تھے۔ اندھیرا چھا جاتا تو وہ نصف گھنٹہ آرام کرتا۔ روٹی اور روغنِ زیتون لے کر سیڑھی کے ذریعے سے اس مینار پر چلا جاتا، جس پر شہنشاہ تھیوڈوسیس کا برنجی مجسمہ نصب تھا۔ اسی نے یونیورسٹی کا بڑا حصہ تعمیر کرایا تھا۔ اس بلند اور ہوادار جگہ سے شہر کا بڑا حصہ نظر آتا تھا۔ رات کو شہر بھر میں روشنی ہوتی تو پیٹروس کو ایسا معلوم ہوتا کہ قسطنطنیہ دنیا کے ظلمت زار میں روشنی کا ایک جزیرہ ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، پیٹروس کے دل میں شہر سے محبت پیدا ہو گئی۔ وہ اس کی اچھی اور بری تمام جگہوں سے یکساں محبت کرنے لگا۔

چوتھا باب

شہنشاہ اور عوام

سبیٹیس کے فرزند (پیڑوس) نے دس سال گمنامی میں گزار دیے اور شہر قسطنطین کے اضناع و افکار سے مانوس ہوگیا۔ وہ دیہاتیوں کا سا لباس پہنتا اور اکھڑ وحشیوں کے لہجے میں گفتگو کرتا جو کچھ سُنتا، وہ اس طرح دل میں بٹھا لیتا کہ دوسرے اس کا پُورا اندازہ نہ کر سکتے۔ اس نے شہر کے عوام کی زندگی کے طور طریقوں اور ان کے احساسات و افکار سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ شہری نظم و نسق کے بے شمار اچھے اور بُرے پہلو اس کی نظر سے گزرتے رہتے تھے۔ وہ اپنے مشاہدات کے بارے میں سوچتا رہتا اور اس کا متجسّس ذہن خاموشی کے ساتھ ان سے نتائج اخذ کرتا رہتا تھا۔ چاند قدیم بیزنطیم کا خاص نشان تھا۔ قصّہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جب مقدونیہ کے بادشاہ فیلقوس نے شہر کا محاصرہ کیا تو وہ رات کی تاریکی میں پرانے بالاحصار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک بادل سے چاند نکل آیا اور اس کی روشنی میں اہلِ شہر کو فیلقوس کی پیشقدمی سے آگاہی ہو گئی۔ انھوں نے قبروں کے پتھر اکھاڑ اکھاڑ کر حصار کی دیواروں کے شگاف بند کر دیے۔ اس طرح شہر کی آزادی محفوظ رہی۔ ویسپیشین[1] قسطنطنیہ سے اتنا خفا ہوگیا تھا کہ شہر کے تمام حقوق چھین لیے تھے۔ سیورس[2] نے اسے بُری طرح تباہ کیا اور اس کے تمام دفاعی مورچے برباد کر دیے مگر بعد ازاں اسی نے قسطنطنیہ کی از سرِ نو تعمیر کا انتظام کیا اور اپنی طرف سے ایک سرکس بھی بنوا دیا۔ بہرحال بالاحصار کی طرح، جو شاخِ زرّیں کے دہانے پر واقع تھا، اہلِ قسطنطنیہ کے طور طریقوں میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ انھوں نے یونانیوں کی طرح یہ حق ہمیشہ محفوظ رکھا کہ جب کسی حکمران سے بدنظمی صادر ہو تو اس کا تختہ الٹ دیں۔

ایک شام تھیوڈومیس کے چوک کا رنگ دیکھتے دیکھتے بدل گیا۔ غیر مسلّح آدمیوں کی ایک فوج بازاروں سے نکل کر چوک میں جمع ہوگئی اور جگہ جگہ الاؤ جلا کر بیٹھ گئی۔ راستے کے دوسری طرف گرجا تھا،

---

[1] VESPASIAN شاہنشاہ (۶۹ء – ۷۹ء) [2] SEVERUS شاہنشاہ (۱۹۳ء – ۲۱۱ء)

جسے سیاہ ماتمی لباس پہنا رکھا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر سمندر میں سے کشتیاں گودیوں کی طرف آرہی تھیں، اور ملاح سمندر کے کنارے اکٹھے ہو رہے تھے تاکہ چوک میں پہنچ جائیں۔ شہر میں یہ خبر پھیلا دی گئی تھی کہ لوگوں کو نیا بادشاہ تجویز کر لینا چاہیے۔ حقیقت یہ تھی کہ بادشاہ کے حکم سے یونانیوں کی وہ مناجات بدل دی گئی تھی، جسے ٹرائی ساجیون[1] کہتے تھے۔ اور اسقفِ اعظم کو معزول کر دیا گیا تھا۔ لوگوں نے باہم کہنا شروع کیا: یہ کھوسٹ اناسٹاسیوس ہماری مناجات کے الفاظ بدل رہا ہے۔ اب ہمیں پتا چلا کہ اس کا باپ واقعی آریوسی اور اس کا چچا مانوی تھا۔

اناسٹاسیوس عوام میں یقیناً ہر دلعزیز تھا، لیکن اس نے ایک مذہبی معاملے میں مداخلت کی تو اکثریت بگڑ گئی۔ مظاہرین میں زیادہ جوش اسقف کی معزولی اور مناجات میں تبدیلی کی وجہ سے تھا۔ چنانچہ وہ بازاروں میں مقدس و مقتدر خدائے لایزال کے نعرے لگا رہے تھے۔ اسی طرح وہ ہجوم کی شکل میں محل کے پاس سے گزرتے ہوئے ایا صوفیہ کے گرجے میں پہنچ گئے۔ وہ کہتے تھے: یہ گرجا ہمارا ہے۔ اس شخص کا نہیں، جو ارغوانی شاہی لباس پہن لے۔

وہ سب یک آہنگ ہو کر نعرے لگانے لگے: "رومیوں کو نیا بادشاہ دو" اس طرح وہ شارع اوسط پر چل پڑے۔ اناسٹاسیوس کا مجسمہ گرا دیا۔ سالارِ فوج کے گھر کو آگ لگا دی۔ دو فوجی کماندار وہاں پہنچے تو ان پر پتھر برسائے گئے۔ یہ حالات پیش آچکے تو سرکاری آدمی ہر ضلع میں منادی کرنے لگے کہ شہنشاہ صبح کو ہپوڈروم میں عوام سے خطاب کریں گے۔

اگلے روز چالیس ہزار افراد جمع ہو گئے اور ان کی نگاہیں شاہی نشستگاہ[2] کے پردوں پر جمی ہوئی تھیں۔ مسلح محافظ فوج وہاں منتظر کھڑی تھی۔ ان کے پرچم سرنگوں تھے۔ سب سے پہلے یہ آوازہ بلند ہوا کہ شاہنشاہ نے انکم ٹیکس کی تمام دستاویزیں جلا دی ہیں اور ٹیکس منسوخ کر دیا گیا ہے۔ شمالی جانب سے صدا بلند ہوئی: "رومیوں کو نیا بادشاہ دو"۔ جنوب سے جواب میں یہ صدا اٹھی: "سالارِ فوج کو درندوں کے حوالے کر دو"۔

---

[1] TRISAGION ایک یونانی مناجات، جس کے ابتدائی الفاظ ہیں: "اے تین مرتبہ مقدس ذات!"

[2] اسے کیتھسما KATHISMA کہتے تھے۔

آخر محافظ فوج کے عَلَم بلند ہوئے۔ جھانج اور شہنائیاں بجنے لگیں۔ شاہی نشست گاہ کے پردے اٹھا دیے گئے۔ ایک سفید مُو آدمی چُپ چاپ آگے بڑھا۔ ہر طرف سکوت چھا گیا۔ اناسٹاسیوس نے نہ شاہی تاج زیبِ سر کیا تھا، نہ سنہری پٹی لگائی تھی، نہ گلناری موزے پہنے تھے۔ وہ عام شہریوں کے سے لباس میں تھا۔ اس حال میں سرکاری نقیب آگے بڑھ کر اناسٹاسیوس کے پہلو میں کھڑا ہو گیا اور واضح الفاظ میں اس نے پکارا:

عالی منزلت شہنشاہ سمجھتا ہے، اس نے کوئی جرم نہیں کیا...

تاہم عوام اسے مجرم سمجھتے ہیں.... وہ شاہنشاہی سے دست بردار

ہوتا ہے۔ بتاؤ! تم کسے شاہنشاہ بنانا چاہتے ہو؟"

اس پر سب کے سب پیکرِ حیرت بن گئے۔ ایک شخص آگے بڑھا اور بلند آواز سے کہا: "اناسٹاسیوس تم جیت گئے"۔ ایک لمحے کے بعد پورے مجمے سے آواز بلند ہوئی: "واہ واہ! تم بڑے بلند حوصلہ ہو۔ عالی منزلت اناسٹاسیوس! جب تک زندہ ہو، ہم پر حکمران رہو"۔

شہریوں کو یاد آ گیا کہ بعض معاملات میں خود رائی کے باوجود ان کا بوڑھا شہنشاہ مذہبی آدمی ہے۔ وہ گھروں کو لوٹ گئے۔ شہر میں کامل سکون ہو گیا۔ مناجات پہلی ہی شکل میں دُہرائی جاتی رہی۔ اناسٹاسیوس نے دانشمندی سے عوام کے رُوبرو سر جُھکا دیا۔

اس ہنگامے کے بعد ایک اور جگہ سے خطرے کا طوفان اٹھا۔ اس مرتبہ پیٹروس بلٹیس بھی اس میں اُلجھ گیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے: پیٹروس کے ماموں جسٹن کے اپنے کوئی اولاد نہ تھی اور اکثر بلقانیوں کی طرح اسے خاندان سے بڑی دلبستگی تھی۔ وہ بڑا خوب صورت اور جواں ہمت آدمی تھا۔ ایک نسل پیشتر چند سُوکھی روٹیاں اور ایک لبادہ لے کر پیدل قسطنطنیہ پہنچا تھا اور اسے مشرقی محاذ پر ایک افسر کی جگہ مل گئی۔ پھر ذی اثر دوستوں کی مدد سے وہ محل کی محافظ فوج میں شامل ہو گیا۔ جب اس نے معزز حیثیت حاصل کر لی تو اپنی ایک بہن کو بھی بُلا لیا اور اونچے خاندان میں اس کی شادی کر دی۔ بہن کے ہاں بیٹا پیدا ہُوا تو اس کا نام جرمانوس[1] رکھا گیا۔ اسے بڑی اچھی تعلیم

---

[1] GERMANUS

دی گئی، لیکن اس کی عادتیں امیروں کی سی رہیں۔ پھر جسٹن نے اپنی دوسری بہن کو لکھا کہ اپنے بیٹے پیٹروس کو بھیج دو، اسے میں تعلیم دلاؤں گا۔ اس طرح پیٹروس قسطنطنیہ آیا اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، تعلیم میں مصروف ہو گیا۔

قسطنطنیہ میں تعلیم کی ابتدا گھر کے اندر ہی ہوتی تھی۔ لڑکا یا لڑکی پانچ سال کی عمر تک پڑھنا سیکھ لیتے تھے۔ پھر ایک استاد مقرر ہو جاتا جو دوسرے بچوں کے ساتھ قواعدِ زبان کی تعلیم دیتا۔ اس کا مُدعا یہ تھا کہ ہومر اور دوسرے شاعروں کا کلام سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اُستاد قدیم یونانی زبان کی تشریح مروّجہ لاطینی یا عام بازاری یونانی میں کرتا تھا۔ دس سال کی عمر میں لڑکیاں تعلیم چھوڑ کر زنانخانے کے اندر خانہ داری کا کاروبار سیکھتیں۔ چودہ یا پندرہ سال کی عمر میں لڑکے خطابت کی تعلیم شروع کر دیتے۔ خاندانی اتالیق ان کے ساتھ جاتا۔ خطیب عموماً یونانی ہوتے۔ وہ خطابت کے علاوہ بھی بہت کچھ سکھا دیتے۔ نوجوان عموماً ڈیماستھنیز[۱] کا مطالعہ کرتے کیونکہ اس نے اپنے خطبوں میں ظلم و استبداد کے خلاف بہت دلیلیں دی تھیں۔ نیز وہ تھیوسیڈائڈز[۲] کے اسلوب کی نقل کرتے۔ خطیب عموماً سیاہ بھورے رنگ کے چوغے پہنتے اور دیکھنے میں مذہبی پیشوا معلوم ہوتے۔ دوسرے علوم کے علاوہ موسیقی اور طب کی تعلیم بھی دی جاتی۔ صبح اور بعد دوپہر دونوں وقت درس دیا جاتا۔

اُس وقت قسطنطنیہ میں پرانے امراء کا کوئی طبقہ نہ تھا۔ نودولتیے موجود تھے، جنھوں نے تنخواہ دار اتالیقوں سے ادھر اُدھر کی چیزیں سیکھ لی تھیں۔ شرفاء کی جو لڑکیاں چیزیں خریدنے کو دکانوں پر جاتیں، وہ نقاب پہنے ہوتیں۔ حاجب ان کے ساتھ ہوتا۔ وہ سب کی سب ملکہ کی ملازمات ہوتیں۔

جب وٹالین[۳] کی بغاوت نے شہر کے لیے خطرہ پیدا کر دیا تو جسٹینین شاہی محل کی محافظ فوج میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ یقیناً جسٹن اس کے لیے بہتر منصب کا انتظام کر سکتا تھا، لیکن نہ ماموں نے کبھی یہ بتایا کہ کیوں بھانجے کے لیے اچھے منصب کی کوشش نہ کی، نہ ضدی بھانجے نے کبھی یہ پسند

---

[۱] DEMOSTHENES یونان کے شہرۂ آفاق خطیب۔ [۲] THUCIDIDES [۳] VITALIAN یہ شخص سلطنت کا مدعی تھا اور اسے بلغاروی اتحاد کا رئیس بنا دیا گیا تھا۔

کیا کہ ماموں کا دست نگر بن کر رہے۔

وٹالین ہنرمند سالار اور بے پناہ قمار باز تھا۔ وہ اپنی فوج کو ڈینیوب سے یہ کہہ کر قسطنطنیہ لے آیا کہ میں پرانا مذہب بحال کر دینا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ وحشیوں کی بھی خاصی بڑی فوج آگئی جس میں بلغاری ہَن بھی شامل تھے کیونکہ انھیں یقین دلایا گیا تھا کہ شہنشاہ سے خاصی رقم مل جائے گی۔ وٹالین نے رقم فراہم کر کے فوج میں بانٹ دی۔ پھر خلافِ معاہدہ باسفورس کی طرف بڑھا اور مضافاتِ شہر کے بنگلوں اور خانقاہوں میں خیمہ زن ہو گیا۔ بڑے بڑے سالار خفیہ خفیہ اس سے نامہ و پیام کرنے لگے۔ ممتاز سپہ سالاروں نے وٹالین سے دوستی کا عُذر پیش کر دیا اور درخواست کی کہ انھیں خدمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ اناسٹاسیوس نے تمام عہدے غیر مصافی وزیروں کو دے دیے اور جن لوگوں کو کچھ نہ کچھ تعلق وٹالین سے تھا، انھیں گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ ان میں جسٹن اور اس کا بھانجا بھی شامل تھے۔

ان کے لیے سزائے موت کا حکم صادر ہونے ہی والا تھا کہ سپاہیوں کے پانچ بڑے سالاروں میں سے ایک —— جس کا نام جان تھا اور اسے کُبڑا کہتے تھے —— جسٹن اور اس کے بھانجے کا سفارشی بن گیا کیونکہ جسٹن نے ایران کے جنگی میدانوں میں مشکلات کے وقت کُبڑے کی امداد کی تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جان نے خواب میں دیکھا تھا، کہ جسٹن اور اس کا بھانجا ایک دن سلطنت کو مشکلات سے نجات دلائیں گے۔

چنانچہ جسٹن اور اس کا بھانجا رہا ہو گئے۔ وٹالین سے جنگ ہوئی۔ جسٹن نے اس کے رسالے کو شکست دے کر بھگا دیا۔ جنگی بیڑا موقع پر پہنچ گیا اور باسفورس کو باغیوں کے جہازوں سے پاک کر دیا گیا۔ اسی موقع پر وہ نیا حربہ استعمال ہُوا، جسے "نفت" کہتے تھے اور جو پانی پر بھی جلتی رہتی تھی۔ ایک غیر معروف یونانی نے یہ پُراسرار چیز کارخانۂ اسلحہ میں پہنچائی۔ جب معاوضے میں اسے سنہری توڑا دیا گیا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ یہی سیّال آتش گیر مادّہ آگے چل کر "یونانی آگ" کے نام سے موسوم ہُوا۔

GREEK FIRE ؂ JOHN THE HUNCHBACK ؁

ان خدمات کے صلے میں جسٹن کو محل کے تین سو منتخب محافظوں کا سالار بنا دیا گیا۔ وٹالین بھاگ کر سرحد پار پہنچ گیا۔ بغاوت کے دوسرے سرغنے موت کی سزا پا گئے۔ نجات کی خوشی میں اناسٹاسیوس شاہی لباس پہن کر جسٹن کے مقام فتح پر گیا اور اس نے میکائیل فرشتے کے معبد پر نذر پیش کی، جسے شہر کو دشمن سے محفوظ رکھنے کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔

پانچواں باب

نئے شہنشاہ کا انتخاب

جس ہنگامے کا ذکر گزشتہ باب میں ہو چکا ہے، اس سے تین سال بعد ـــــ ۵۱۸ء ـــــ موسم گرما کی ایک رات "آناً فاناً" اناستاسیوس نے وفات پائی۔ ساتھ ہی تھیوڈوسیس کے خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ اناستاسیوس کی عمر اٹھاسی سال کی ہو چکی تھی اور اس کی موت غیر متوقع نہ تھی، لہٰذا قصرِ شاہی کے کارکن اپنے اپنے فرائض بجا لانے کے لیے بالکل تیار تھے۔

مشیروں نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ شہنشاہ کی میت کو جواہر سے مرصع لباس پہنایا۔ اس کے سر اور پاؤں کی طرف شمعیں روشن کر دیں۔ باقی ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر وہ اس افسر کے پاس پہنچے، جو گیلری میں پہرے پر مامور تھا اور رسمی الفاظ میں اسے خبر دی: "ہمارے شہنشاہ بہ حیثیت انسان فوت ہو چکے ہیں، اب خدا کی رہنمائی میں نئے شہنشاہ کے انتخاب کے لیے غور و مشورہ ہونا چاہیے۔"

جس افسر کو خبر دی گئی، وہ خود جسٹن تھا۔ اس نے قاعدے کے مطابق اپنے سپاہی بلائے اور حکم دے دیا کہ امن قائم رکھیں۔ ساتھ ہی ناظم اعلیٰ کو اطلاع دی، جو دورانِ جنگ میں جسٹن کا دوست بن چکا تھا۔ اپنے بھانجے جسٹینین کو بھی بلا لیا، جو محل کی محافظ فوج میں شامل ہونے کا امیدوار تھا۔ حاجب سنہری پیٹی، گلناری موزے اور ارغوانی جبہ لے کر آ گئے تاکہ جس شخص کو شہنشاہ منتخب کیا جائے، اسے یہ چیزیں پہنا دیں۔ قاصدوں نے اسقفِ اعظم، وزراء اور ممتاز عمائد کو بھی یہ خبر پہنچا دی۔

سرکاری کاغذات سے اس کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ خاصی افراتفری پھیلی رہی۔ اس اثناء میں جسٹینین نے ایک فیصلہ کن قدم اٹھا لیا۔ اسے شاہی محل کے اندر کوئی اثر و رسوخ حاصل نہ تھا، لیکن رومی روایات اور عوام کے احساسات سے پوری آگاہی تھی۔ پھر تین اعلیٰ عہدہ داروں سے اس کے حلیفانہ تعلقات تھے۔ ایک سیلر[1]، جو تمام دفاتر کا ناظمِ اعلیٰ تھا۔ دوسرا جسٹن۔ تیسرا اکبر اجان

[1] CELER

اور شہنشاہی کا فیصلہ ہونے تک فوج پر انھیں تین آدمیوں کا قبضہ تھا۔

آفتاب طلوع ہوا تو ممتاز مذہبی پیشوا اور مدبّر سیاہ ماتمی لباس پہنے ہوئے برنجی[1] دروازے پر پہنچ گئے۔ صدر دروازہ کھلا اور انھیں ایوانِ ضیافت میں بٹھا دیا گیا۔ ساتھ ہی بتا دیا گیا کہ جلد سے جلد شہنشاہ کے نام کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔ اس صورت میں سب لوگ ہمارا ساتھ دیں گے۔ اگر جلد فیصلہ نہ کیا تو ہمیں دوسروں کا ساتھ دینا پڑے گا۔

دستور یہ تھا کہ نئے شہنشاہ کی نامزدگی کا فیصلہ وزراء اور عمائد مل کر کرتے اور اسقفِ اعظم اس پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دیتا۔ علاوہ بریں لازم تھا کہ فوج اس نامزدگی پر راضی ہوتی۔ پھر نامزد کو شہری عوام کے مجمعِ عظیم میں لایا جاتا تھا۔ اگر وہ لوگ محل کا انتخاب رد کر دیتے تو نتائج بہت تباہی خیز ہوتے۔

اس اثناء میں ہپوڈروم لوگوں سے بھر گیا۔ شاہی نشست گاہ کے پردے گرے ہوئے تھے اور نعرے لگ رہے تھے "سینٹ (ایوانِ عمائد) زندہ باد۔ رومی سینٹ! جلد فیصلہ کرو۔ ہمارا شہنشاہ کہاں ہے؟ عطیۂ خدا فوج اور عوام کے لیے۔" اُدھر کوئی فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ اناستاسیوس کے کوئی اولاد ہی نہ تھی۔ اس کے تین بھتیجے تھے، جن میں سے ہائی پیٹیس[2] امیدوار بن سکتا تھا۔ لیکن وہ وٹالین کے خلاف جنگ کرتا ہوا گرفتار ہو گیا تھا اور نوے ہزار سنہری دینار اس کا فدیہ مقرر ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں وہ شہنشاہی کے لیے موزوں نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ سیلر کوئی نام تجویز نہ کر سکا۔ اسقفِ اعظم خاموش بیٹھا ہوا مدبّروں کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔ جسٹن بحث میں شریک ہی نہ تھا اور فرضِ منصبی انجام دے رہا تھا۔ غور و فکر کرنے والے لوگ مناجات کے مذہبی ہنگامے سے بخوبی آگاہ تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ نیا شہنشاہ آرتھوڈوکس[3] عقیدے کا حامل ہونا چاہیے۔ پھر انھیں وہ ہنگامہ بھی فراموش نہ ہوا تھا جو وٹالین نے برپا کیا تھا۔ شہنشاہ ایسا ہونا چاہیے تھا جو وٹالین سے عہدہ برآ ہو سکے۔

---

[1] BRONZE GATE یہ محل کا ایک دروازہ تھا۔ [2] HYPATIUS [3] ORTHODOX

اس سے مراد یونانی یا مشرقی کلیسا کا عقیدہ ہے۔ مسیحی کلیسا ابتداءً دو بڑے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک آرتھوڈوکس، دوسرا رومن کیتھولک۔ ایک کا مرکز قسطنطنیہ تھا اور دوسرے کا رومہ۔ مشرق کے اکثر مسیحی نیز روسی آرتھوڈوکس عقیدے ہی کے ہیں۔

اُدھر ہپوڈروم میں شور و غوغا بپا تھا۔ حاجب شاہنشاہی نشانات لیے ہوئے بابُ العاج[1] کے پاس کھڑے تھے۔ اس دروازے کے باہر فوج مقیم تھی، اس سے بھی نعرے بلند ہو رہے تھے۔ جسٹینین اسی جگہ سپاہیوں کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔

شاہی محل اور ہپوڈروم کے درمیان جو سپاہی تھے، انھوں نے خود نامزدگی کا کام شروع کر دیا چنانچہ ایک گروہ نے کبڑے جان کو کندھوں پر اُٹھا لیا۔ نیلی پوشوں نے یہ دیکھا تو پتھر برسانے شروع کر دیے۔ جسٹینین نے مداخلت کر کے امن بحال کیا۔ محافظ فوج نے خود جسٹینین کا نام پیش کرنا چاہا، لیکن وہ وہاں سے کھسک گیا۔ پھر سپاہیوں نے باب العاج پر ضربیں لگانی شروع کیں کہ شاہی نشانات باہر لاؤ۔

اُدھر کسی ایک نام پر اتفاق کر لینے کے لیے اصرار جاری تھا۔ حاجبِ اعلیٰ جواہرات کا ایک تھیلا لے کر آیا تاکہ جس شخص کو شہنشاہ نامزد کیا جائے، وہ یہ جواہرات، سب میں تقسیم کر دے۔ جسٹن نے یہ تھیلا حاجبِ اعلیٰ سے لے لیا اور چُپ چاپ جواہرات تقسیم کر دیے۔ حاجبِ اعلیٰ زیرِ لب کہہ رہا تھا کہ جلدی کرو، ایک ثانیہ بھی ضائع نہ ہونے پائے۔ آخر اسقفِ اعظم کچھ کہنے کے لیے کھڑا ہوا۔ ابھی وہ کچھ بولنے نہ پایا تھا کہ ایک صدا بلند ہوئی: "زندہ باد جسٹن! ہمارا شہنشاہ، عطیۂ خدا"۔ سینیٹ نے یہ نعرہ دُہرایا۔ جو عمائد موقع پر موجود تھے، انھوں نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ محافظ فوج کا سالار آزمودہ کار سپاہی تھا۔ وہ لوگ وسیع جاگیروں کے مالک تھے اور سمجھتے تھے کہ جسٹن ان کے املاک میں مداخلت نہ کرے گا۔ اسقفِ اعظم نے اپنی دو انگلیاں برکت دینے کے لیے اُٹھا دیں۔ اسے یقین تھا کہ جسٹن کا تعلق آرتھوڈوکس کلیسا سے ہے اور وہ امن قائم رکھ سکے گا۔

سینیٹ نے مزید انتظار نہ کیا۔ جسٹن اور ہم نوا عمائد کو لے کر باب العاج کے راستے ہپوڈروم پہنچ گیا۔ مجمع میں سے کسی نے جسٹن کے منہ پر ضرب لگائی۔ وہ شاہی نشست گاہ میں پہنچا تو مقامِ ضرب سے خون بہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر محافظ فوج نے اپنے سالار کے لیے نعرہ لگایا۔ نیلی پوشوں نے اس پر شادمانی کا اظہار کیا۔ عوام کو صرف یہ یاد تھا کہ جسٹن ہی نے

---

[1] IVORY GATE شاہی محل کا دروازہ جس سے ہپوڈروم جاتے تھے۔

ہُنوں کے رسالے پر فتح پائی تھی۔ اگرچہ خون بہ رہا تھا، لیکن وہ بڑے اطمینان سے کھڑا تھا اور دیکھنے میں خوب صورت معلوم ہوتا تھا۔ ساتھ ہی نعرہ لگا: "عالی منزلت جسٹن! تم ضرور فتح حاصل کرو گے۔" چنانچہ محافظ فوج نے عَلَم بلند کیے۔ جسٹن کے اوپر ڈھالوں کا سایہ ہو گیا۔ سُنہری زنجیر اس کے سر پر رکھ دی گئی اور شاہی طیلسان پہنا دیا گیا۔ جسٹن نے جواب میں مختصر سی تقریر کی۔ اس نے کہا کہ جو سپاہی موقع پر موجود ہے، اسے پانچ سنہری سکّے اور نصف سیر چاندی ملے گی۔ امید ہے کہ ہر فرد امن اور خوشحالی سے شاد کام ہوگا۔

اِس طرح جسٹن آرتھوڈکس کلیسا کی حمایت، وزراء و عمائد کے فیصلے اور فوج کے انتخاب سے شہنشاہ بن گیا۔ اس سلسلے میں جسٹینین کی کوششوں کے متعلق کچھ نہ کہا گیا۔ بہ ہر حال وہ انتخاب کے وقت شاہی نشست گاہ میں اپنے ماموں کے پاس موجود نہ تھا اور نہ ایا صوفیہ گیا، جہاں ماموں نے بطورِ شہنشاہ برکت حاصل کی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ جسٹینین نے تخت کے پسِ پردہ وہ قوّت حاصل کر لی تھی جو باغی وٹالین حاصل نہیں کر سکا تھا۔ یہ قوّت نمایاں نہ تھی اور جسٹینین نے اسے نمایاں کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے اپنے طریقے کے مطابق فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔

چھٹا باب

جسٹینین کی تخت نشینی

ایا صوفیہ، ایوانِ عمائد اور محل کے درمیان ایک چوک تھا، جس سے شاہراہِ اوسط نکلتا تھا۔ اس کے چاروں طرف محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ اس وجہ سے یہ شروع میں "چار محراب" کہلاتا تھا، بعد میں اسے آگسٹیم کہنے لگے کیونکہ یہاں سنہری سنگِ میل کے پاس قیصر آگسٹس کا ایک بہت بڑا مجسمہ نصب تھا۔ یہی مقام تھا، جہاں سے سلطنت کی تمام شاہراہوں کا آغاز ہوتا تھا، یا اسے ان کا منتہا کہہ لیجیے۔

اس چوک میں سے آبادی کے ہر طبقے کے اہم لوگ آتے جاتے تھے۔ فوجی افسر اور عمائد سرکاری فرائض کے سلسلے میں اور عام شہری لوگ درخواستیں پیش کرنے کے سلسلے میں یا مختلف ایجادیں اور کتابوں کے مخطوطے فروخت کرنے کی غرض سے۔ اس کی شمالی جانب سایہ دار جگہ میں بنچ رکھ دیے گئے تھے تاکہ برنجی دروازے میں داخلے کے خواہشمند اپنی باری کا انتظار کر سکیں۔ یہاں جہاں گرد مبلغ بھی آ جاتے تھے اور شہر کی افواہیں بھی ایک دوسرے کو پہنچائی جاتی تھیں۔

فوجی افسروں میں سے دو نوجوان بھی تھے، جو آپس میں گہرے دوست تھے۔ ایک کا نام منڈس[1] تھا، جس نے مسیحیت کا بپتسمہ لے لیا تھا۔ دوسرا ڈلمیشیا کا ایک خاموش جوان بیلی سارئیس[2] تھا، جس نے فوجی اکاڈمی میں اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ یہ دونوں جسٹینین کے فوجی مشیر تھے۔ انھیں اندازہ ہو چکا تھا کہ جسٹن بڑی سختی سے نظامِ حکومت چلاتا ہے اور کسی کی رو رعایت کی کوئی گنجائش نہیں۔ جس خواجہ سرا نے جسٹن کے انتخاب کے خلاف سازش کی تھی، وہ مارا گیا۔ بازاروں میں ہنگامہ بپا ہو جاتا تو تمام فریقوں کے لیڈروں کو قید میں ڈال دیا جاتا۔ ڈٹالین کی طرف سے خطرہ باقی تھا۔ اسے قسطنطنیہ بلایا گیا اور سالارِ فوج اور قونصل کے خطابات سے نوازا گیا۔ وہ آتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ یقین دلایا گیا کہ اسے کوئی

---

[1] MENDUS
[2] BELISARIUS

آزار نہ پہنچے گا۔ وہ آگیا، محل میں داخل ہونے لگا تو رات کی تاریکی میں دروازے ہی پر معمولی سی کشمکش ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وٹالین مارا گیا۔ دو آدمی اس کے ساتھ تھے۔ وہ بھی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ کسی کو کچھ پتا نہ چلا کہ کیا واقعہ ہوا۔ کیا صورت پیش آئی۔ کئی سال گزر گئے تو لوگ سرگوشیوں میں جسٹینین پر قتل کا الزام لگانے لگے۔ تاہم تاریخی اعتبار سے وٹالین کا معما لاینحل ہی رہا۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ جسٹن بوڑھا ہو چکا ہے اور پڑھا لکھا بھی نہیں، لہٰذا وہ صرف برائے نام شہنشاہ بنا رہنا کافی سمجھے گا اور کاروبارِ حکومت میں مداخلت نہ کرے گا۔ عمائدین سے جو لوگ اس کے ہم نوا تھے، وہ سمجھتے کہ ہم جس طرح چاہیں گے، کرتے رہیں گے۔ تاہم تھوڑی ہی مدت میں واضح ہو گیا کہ یہ خیال درست نہ تھا۔ بلاشبہ وہ سٹنسل[۱] کے ذریعے سے دستخط کرتا تھا اور بظاہر فوجی معاملات کے سوا اسے کسی چیز سے چنداں دلچسپی نہ تھی لیکن اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی ایسی قوت موجود تھی، جو ہر معاملے میں قطعی اور فیصلہ کن رائے رکھتی تھی۔ جسٹینین کو کوئی بلند حیثیت حاصل نہ تھی۔ وہ رسمی طور پر امراء میں شمار ہوتا تھا۔ محل کی محافظ فوج میں اسے ایک عہدہ بھی حاصل تھا۔ ماموں اور بھانجا بہت تھوڑی دیر کے بعد ملتے۔ تاہم جسٹینین جو کچھ چاہتا، وہی کچھ ہوتا۔ مثلاً ایک مرتبہ وہ بیمار تھا اور جسٹن نے نیلی پوشوں کے لیڈروں کو تازیانے لگانے کی سزا سنا دی۔ جسٹینین نے یہ حکم منسوخ کرا دیا۔ جسٹن نے رومہ کے اسقفوں کو اس غرض سے قسطنطنیہ بلایا تھا کہ مشرق و مغرب کے مذہبی پیشواؤں کا تفرقہ ختم ہو جائے۔ قسطنطنیہ کے اسقفِ اعظم نے انھیں نہیں بلایا تھا۔ تاہم جسٹینین نے اسقفِ اعظم ہی کی طرف سے ان کا استقبال شہر سے دس میل باہر نکل کر کیا۔

جسٹینین کی عمر اس وقت سینتیس سال کی تھی۔ وہ سردیوں میں ایک موٹا سا اونی جبہ پہن لیتا۔ شارعِ اوسط کے دکان داروں میں اسے خاصی ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ وہ شام کی عبادت کے لیے ایا صوفیہ بھی نہ جاتا بلکہ سٹوڈین میں عبادت کر لیتا۔ دکانوں کے پیچھے رہنے کے مکانات تھے۔ جسٹینین ان میں بھی پہنچ جاتا اور سب سے عوامی زبان میں بات چیت کرتا۔ وہ لوگ اسے اپنا محافظ کہتے۔ ایک موقع پر جب اون بیچنے والے دکانیں بند کر رہے تھے کیونکہ شام ہو چکی تھی اور چراغ جلنے والے

---

[۱] STENCIL ایک پتلی سی تختی، جس میں حروف کندہ ہوتے ہیں۔

تھے۔ اس نے دیکھا کہ ایک دُبلی پتلی عورت بہ دستور کام میں مصروف ہے۔ وہ جوان تھی اور تھیوڈورا اس کا نام تھا۔ کسی زمانے میں وہ ایکٹرس رہ چکی تھی اور اس کا چلن بھی داغدار سمجھا جاتا تھا۔ وہ غریب تھی اور جب اس سے کچھ پُوچھا جاتا تو جواب دیتے وقت بھی اس کی نگاہیں اور انگلیاں کام ہی میں مشغول رہتیں۔

ایک شام جسٹنین تھیوڈورا کو ساتھ لے گیا اور دونوں ایک زینے کے ذریعے سے تھیوڈوسیس کے ستون پر چڑھ گئے تاکہ بازاروں کی روشنیاں دیکھیں۔ جسٹنین جب اس مقام سے شہر کی روشنیاں دیکھتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا گویا گرد و پیش کی تاریکی میں یہ روشنی کا ایک جزیرہ ہے۔ وہ اکثر اپنے خیالات کی رو میں بہہ جاتا اور مستقبل کے بارے میں عجیب خواب دیکھنے لگتا۔ اس نے تھیوڈورا کو بھی اپنے خوابوں میں شریک کر لیا۔ اُس وقت سے دونوں میں گہرا تعلق پیدا ہو گیا، جو آخر دم تک قائم رہا۔ اس واقعے کے بعد سے جسٹنین نے بہت محنت شروع کر دی۔ شاہنشاہ کے لیے جو روئدادیں اور فرمان دن بھر میں تیار ہوتے، جسٹنین شمع کی روشنی میں انھیں پڑھتا اور جو کچھ پڑھتا اسے حافظے میں محفوظ کر لیتا۔ اسی زمانے میں اس نے ایک ایرانی شہزادے ہرمز کا مکان رہنے کی غرض سے لے لیا، جو شاہی محل اور سمندر کے درمیان واقع تھا۔ تھیوڈرا کو بھی وہ اسی مکان میں لے گیا۔

تھیوڈورا تخیُّل پرست عورت تھی لیکن اپنے تخیلات کو اپنی ذات تک محدود رکھنے پر قدرت رکھتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ خود فریبی رویت آفرین ہو سکتی ہے۔ اسے یاد تھا کہ ایک صاحبِ ثروت آدمی اسے سمندر پار سائرانیکا لے گیا تھا، پھر اسے نکال دیا تھا اور وہ صحراؤں سے پیدل گزری تھی۔ افلاس کے دنوں میں وہ اپنی ایک بچی دریائے نیل کے کنارے پر رہنے والے ایک رحم دل گھرانے کے پاس چھوڑ آئی تھی[1]۔ اس کا وقت جس طرح گزرا تھا، اس سے اخلاقی حس مُردہ ہو گئی تھی، لیکن وہ جانتی تھی کہ جنھیں وہ پیار کرتی ہے، ان سے وابستہ رہنے کی تدبیر کیا ہے اور جو اس کی ہتک کرتے تھے، ان سے

۱؎ تھیوڈورا کا قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ قبرص کے ایک شخص کی تین لڑکیاں تھیں۔ باپ مر گیا اور غریبی کا دور آیا تو لڑکیوں نے رقص و سرود سے کمانا شروع کیا۔ ان میں سے ایک تھیوڈورا تھی۔ ایک امیر آدمی اسے سائرانیکا لے گیا اور اس سے ایک بچی بھی پیدا ہوئی لیکن تھوڑی دیر بعد اس آدمی نے غریب تھیوڈورا کو نکال دیا۔ وہ پیدل قسطنطنیہ روانہ ہو گئی۔ بچی اسکندریہ میں چھوڑی۔ خود مختلف شہروں میں پھرتی پھراتی قسطنطنیہ گئی تو صاف ستھری زندگی بسر کرنے لگی۔ وہیں جسٹنین سے ملاقات ہو گئی۔

سخت انتقام لینے میں بھی اسے قطعاً تامل نہ تھا۔ وہ افلاس سے بہت ڈرتی تھی۔ کہتے ہیں، اس میں حُسن تھا۔ اُس کی سیاہ سخن گو آنکھوں پر بھویں باہم پیوستہ تھیں۔ اس کا چھریرا جسم شدّتِ احساس سے تن جاتا تھا۔ وہ نقّہ لوگوں کی نقل خوب اتارتی تھی اور اذیّت پہنچنے پر بھی اس نے مسکراتے رہنا سیکھ لیا تھا۔ جسٹینین کے سامنے وہ ہمیشہ خرّم وشاداں رہتی۔ یہی اسے خوش رکھنے کا گُر تھا۔ البتہ اس کے افکار وخیالات کا اندازہ مشکل تھا، لیکن تھیوڈورا نے یہ صلاحیت بھی پیدا کر لی تھی۔ اسے قدرت کی طرف سے خاص بصیرت عطا ہوئی تھی، جو اس کے اجداد کی میراث تھی۔ جسٹینین عمر میں اس سے چودہ سال بڑا تھا لیکن اس کی محبت تھیوڈورا کے آخری سانس تک قائم رہی۔ وہ اسے عطیۂ خداوندی کہا کرتا تھا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ ایسی متضاد فطرتوں کا ملاپ حیرت انگیز ہے۔ یہ فولاد اور پارے کی یکجائی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ان دونوں میں ارادے کی پختگی قدرِ مشترک تھی۔

جب جسٹینین کو امراء کے طبقے میں شامل کیا گیا تو اس کا نام فلیولیس پیٹروس سبٹیس جسٹینیانس رکھا گیا۔ ٹالین کی موت کے بعد اسے قونصل بنا دیا گیا تھا۔ اس نے مصارف سے بالکل بے پروا ہو کر ہپوڈروم میں کھیلوں کا نہایت عمدہ انتظام کیا۔ سرکاری دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی بھاری رقم خرچ کر کے اس نے بیس ببر شیر اور چالیس چیتے مہیا کیے اور دو لاکھ اٹھاسی ہزار سو نڈی (رومی سکہ) اس خزانے سے صرف کر ڈالے جو اناسٹاسیوس نے بڑی محنت سے جمع کیا تھا۔

اب جسٹینین مسلسل کام کرتا اور ہرگز نہ تھکتا۔ جسٹن کے اپنے کوئی بیٹا نہ تھا اور اسے ایک متبنّیٰ کی امداد کی ضرورت تھی۔ اس نے شاہی جاگیریں جسٹینین کے حوالے کر دیں۔ ایک روز جسٹینین کے دوست جسٹن کے پاس پہنچے اور درخواست کی کہ متبنّیٰ کو سلطنت میں سب سے اعلیٰ فوجی عہدہ دے دیا جائے۔ جسٹن نے جواب دیا: "میرے دوستو! اتنا بڑا عہدہ ایک نوجوان کے حوالے کرنا مناسب نہیں۔"

تھوڑی مدت کے بعد وہ قانون بدل دیا گیا، جس کی رُو سے اونچے درجے کے کسی آدمی کو اجازت نہ تھی کہ کسی ایسی عورت سے شادی کرے جو تھیٹر میں ایکٹرس رہ چکی ہو۔ مگر جسٹینین کے اصرار پر شہنشاہ نے فرمان جاری کر دیا کہ اگر کوئی ایسی عورت ایک خاص وقت تک پاکدامنی کی زندگی بسر کر چکی ہے تو اس سے شادی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جسٹینین نے تھیوڈورا سے شادی کر لی۔ اس سے پیشتر جسٹینین نے ہرمز والا مکان تھیوڈورا کو بہ طورِ تحفہ دے دیا تھا۔ جسٹن بیمار تھا، مگر اس نے کسی کو اپنا جانشین نہ

بنایا۔ پھر یکایک بیماری بڑھ گئی۔ اس کے ٹخنے پر ایک پُرانا زخم تھا، جو مندمل نہ ہُوا۔ یہاں تک کہ اس کی ٹانگ خطرے میں پڑ گئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب زندگی برسوں کی نہیں، ہفتوں کی ہے اور سلطنت کو خطرے سے بچانے کی ایک ہی صورت ہے کہ جانشین کا اعلان کر دیا جائے۔ چنانچہ ۵۲۷ء کے ایسٹر (عید الفصح) سے چند روز پیشتر جسٹن تخت پر بیٹھا۔ اس کے محافظ دو رویہ کھڑے تھے۔ ایوانِ عمایدہ کے ممتاز افراد کے علاوہ اسقفِ اعظم بھی موجود تھا۔ جو اعلان ہونے والا تھا اس کا سب کو پہلے سے علم تھا۔ جسٹن نے کہا: "میں عوام کی مرضی کے مطابق اپنے بھانجے اور متبنّیٰ جسٹینین کو اپنے ساتھ شہنشاہ بناتا ہوں"۔ اسقفِ اعظم نے دُعا کی۔ سپاہ کے تمام سالاروں نے آمین کہی۔ جسٹینین اپنے بوڑھے ماموں کے سامنے دو زانو ہو گیا تاکہ سنہری حلقہ اس کے سر پر رکھ دیا جائے، جو شہنشاہی کا خاص نشان تھا۔ گرجے جا کر مذہبی رسم ادا کرنے کی جسٹن میں ہمّت نہ تھی۔ یہ رسم اس کی وفات کے بعد ادا ہوئی۔

پھر اس نے ایک غیر معمولی حرکت کی۔ وہ تاج پہنے، زرتار لباس زیب بر کیے اور ارغوانی لبادہ جس پر شہنشاہی کے نشان کڑھے ہُوئے تھے، کندھوں پر ڈالے شاہی نشست گاہ میں پہنچ گیا اور وہاں ان لوگوں سے سلامی لی، جو ہپوڈروم میں جمع تھے۔ تھیوڈورا اس کے ساتھ تھی۔ وہ پہلی مرتبہ ملکہ کی حیثیت میں عوام کے سامنے گئی تھی۔ بنفشئی ارغوانی لباس، جس کا نچلا حصّہ زرتار تھا، اس کے چھریرے جسم پر خوب زیب دیتا تھا۔ سیاہ بالوں میں موتیوں کی لڑیاں جگمگا رہی تھیں۔ شاید اس کے حسن و جمال نے عوام کا دل موہ لیا اور وہ اپنا نیا کردار بڑی خوبی سے ادا کر سکتی تھی۔ بے حد جوش و خروش سے دعائیہ صدائیں بلند ہوئیں "زندہ باد ہماری حد درجہ نیک اور عالی منزلت ملکہ!"

اس طرح تھیٹر کی ایک ایکٹرس اور پہاڑی علاقے کے ایک کسان کی حکمرانی کا آغاز ہُوا۔ یہ اگست ۵۲۷ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت مغربی دُنیا کا اندھیرا شہر قسطنطنیہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔

ساتواں باب

حکمرانی کا ابتدائی زمانہ

جب جسٹینین اوّل رومیوں کا شہنشاہ بنا تو پینتالیس سال کی عمر ہو چکی تھی۔ اس کے نزدیک تاج پوشی کا مطلب یہ تھا کہ روما کے دورِ عروج کے قیصروں یا نیم افسانوی قسطنطین کی جلیل القدر روایات کے مطابق لوگوں پر حکومت کرے اور یہ کردار ادا کرنے کے لیے سارا سازو سامان اس کے لیے مہیا تھا۔ اس کی حقیقت بیں نظروں نے جلد ہی یہ اندازہ لگا لیا کہ قصرِ شاہی کی یہ شان و شوکت اس وقت تک بے معنی رہے گی جب تک سلطنت کی قوت بحال نہ ہو۔ اس کے ذہن پر یہ خوف مسلّط تھا کہ رومی سلطنت کا انحطاط کہیں موت کا پیش خیمہ نہ ثابت ہو۔ آخر کار اس نے بہت غور و فکر کے بعد سلطنت کی گرتی ہوئی طاقت کو سنبھالنے کے لیے عملی اقدام کرنے کا فیصلہ کیا اور سب سے پہلے اپنے گردو پیش کے لوگوں کی بے حسی اور بے عملی پر توجہ مرکوز کی۔ نظامِ سلطنت پہلے سے مکمل ہو چکا تھا اور گزشتہ دو صدیوں میں کئی نازک موقعے آئے تھے، جن میں اس نظامِ حکومت کی پختگی کا تجربہ کیا جا چکا تھا۔ وہ پہلی صبح کو اپنے مرمریں قصر کی روشنی میں بیدار ہوا تو چھت پر آسمانی رنگ کی میناکاری دیکھ کر اسے ایسا احساس ہوا گویا زیرِ سما سویا ہوا ہے۔ خواب گاہ کا نام مقدّس حُجرہ[1] تھا۔ صبح ہوتے ہی دربانوں کے افسر نے تمام دروازے کھول دیے۔ ایک لڑکے نے پردے ہٹا دیے۔ پھر ایک خادم سفید لباس پہنے ہوئے روپہلی سیلابچی لے کر آ گیا۔ ساتھ ہی پھل اور کھانے کی دوسری چیزیں آ گئیں۔

دوسرا گھنٹہ بجا تو لباس پہنانے والے صبح کی باریابی کا لباس لے کر پہنچ گئے۔ حاجبوں نے سلام کیا اور آہستہ آہستہ ضروری خبریں سُنا دیں۔ حاجبِ اعلیٰ ان افراد کی فہرست لے آیا، جنھیں باریابی کا شرف عطا ہونے والا تھا۔ ساتھ ہی لکھ لایا کہ کس کس کو کون کون سا عطیہ یا انعام دینا مناسب

---

1. SACRED CUBICAL

ہے۔ جسٹینین نے وہ بھاری ارغوانی طیلسان پہن لیا، جو اور کوئی پہننے کا مجاز نہ تھا۔ اس کے دائیں بازو کے نیچے وہ سنہری تختی تھی، جس پر شہنشاہی نشان بنے ہوئے تھے اور دائیں کندھے پر مرصّع کرۂ ارض دمک رہا تھا۔ جس پر صلیب کا نشان بنا ہُوا تھا۔ تاج میں چار بڑے موتی آویزاں تھے۔

نصف گھنٹے میں وہ تیار ہو کر دربار میں پہنچ گیا۔ اس کے سامنے زرتار پردے جگمگا رہے تھے۔ اشارہ ہوتے ہی پردے اُٹھا دیے گئے۔ داروغۂ محل نے دونوں خزانوں کا حساب پیش کیا۔ اس کے بعد پہلا شخص سنگِ سماق کے تین زینوں سے گزرتا ہُوا تختگاہ کے سامنے پہنچا۔ جسٹینین نے اُس وقت تک بات نہ کی، جب تک خاص ضرورت پیش نہ آگئی۔ حاجبِ اعلیٰ ہی رسمی جواب دیتا رہا، تا آنکہ جسٹینین کے اشارے پر پردے گرا دیے گئے۔ حاجب نے اعلان کر دیا کہ دربار برخاست ہو گیا۔ سب کے سر جھک گئے اور زبانوں پر شہنشاہ کے لیے دعائیں جاری ہو گئیں۔

کارکنوں پر بہت جلد واضح ہو گیا کہ جسٹینین انتظامی شعبوں کے کاروبار کا پورا بوجھ خود سنبھال رہا ہے، حالانکہ یہ شعبے اس کے پیشرووں کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے قائم ہوئے تھے۔ اس نے ترجمانوں اور مختصر نویسوں کا ایک حلقہ فراہم کر لیا اور حکم دے دیا کہ جو معاملہ لاینحل نظر آئے، اسے شہنشاہ کے پاس لے آئیں۔ محرّر دستور کے مطابق اپنی رائیں نہایت صاف چرمی کاغذ پر بڑے خوشنما انداز میں لکھ کر پیش کرتے۔ جسٹینین کاغذات پڑھتا تو ساتھ ساتھ استفسار بھی کرتا جاتا۔ مثلاً ایک روداد مظہر تھی کہ باپ کے قاتل کو بوری میں سی کر سمندر میں ڈبوتے تو اس کے ساتھ ایک افعی، ایک مُرغ، ایک کُتا اور ایک بندر بھی سی دیتے۔ جسٹینین نے پوچھا: اس کا کیا مطلب؟ جواب ملا کہ پومپی کا قانون یہی ہے اور صدیوں سے اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ جسٹینین نے حکم دیا کہ آیندہ ایسے قاتل کو بوری میں بند کر کے ڈبو دیا جائے تاکہ اسے زمین پر مدفن نہ ملے، جس کی بے حُرمتی کا وہ مرتکب ہُوا اور کوئی چیز بوری میں نہ رکھی جائے۔

اس نے حکم دے دیا کہ آیندہ تحریر کی خوشنمائی پر وقت نہ ضائع کیا جائے بلکہ معمولی کاغذ پر جلد سے جلد جو کچھ لکھنا ہو، لکھ لیا جائے۔ پھر اس نے پرانی رسموں کو آہستہ آہستہ ختم کیا۔ اس کے ابتدائی فرامین یہ تھے:

۱ - جو غلام قید تھے، وہ سب آزاد کر دیے گئے۔

۲ - جو غلام قید نہیں تھے، ان کے مالکوں کو حق دے دیا گیا کہ جب چاہیں، محض زبانی حکم سے انھیں آزاد کر دیں۔

۳ - اس نے وہ قدیم رومی دستور منسوخ کر دیا جس کی رُو سے باپ خاندان کا مطلق العنان حاکم ہوتا تھا۔ اس نے بچّوں کو خاندانی جائداد کے چوتھائی حصّے کا مالک قرار دیا اور ناجائز اولاد کو بھی حق وراثت عطا کر دیا۔

ٹرائی بونین[1] اس زمانے کا ممتاز ترین قانون دان تھا۔ جسٹینین نے اسے یاد دلایا کہ تمام بچے آزاد پیدا ہوتے ہیں اور قوانین انسانوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ انسان قانونی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے استعمال ہوں۔

قسطنطنیہ میں پرانے قوانین کا ایک مجموعہ موجود تھا، جس میں مختلف ججوں کے فیصلوں اور شہنشاہوں کے فرامین کا اضافہ نسلاً بعد نسلٍ ہوتا رہا۔ رومی سلطنت پھیلی تو مختلف قوموں کے رسم و رواج مجموعۂ قوانین میں شامل ہوتے گئے۔ مسیحی کلیسا نے اس پورے مجموعے کو محل نظر قرار دے دیا۔ یہ قوانین بے شمار دستاویزوں میں اس طرح بکھرے ہوئے تھے کہ بہت تھوڑے لوگ ان تک دسترس حاصل کر سکتے تھے۔ تھیوڈوسیس نے تمام قوانین کا مجموعہ مرتب کرنے کی کوشش کی لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ پرانے قوانین میں نئے شامل ہو گئے۔ جسٹینین نے ٹرائی بونین کی مدد سے رومی قوانین کا نیا مجموعہ مرتب کرایا۔ دس افراد اس کی امداد کے لیے مقرر کر دیے۔ انھیں میں نوجوان یونانی تھیوفلوس[2] بھی شامل تھا۔ مجموعے کی ترتیب میں زیادہ تر کام اسی نے سر انجام دیا، لیکن اس کا اعزاز ٹرائی بونین کو مل گیا۔ ایک سال کی مدّت میں یہ مجموعہ مکمّل ہو گیا اور شہنشاہ نے حکم دے دیا کہ اس مجموعے میں جو قوانین ہیں، ان کے خلاف تمام پرانے قوانین منسوخ سمجھے جائیں۔ پھر اس نے ایتھنز کی فلسفے کی درس گاہیں بند کرا دیں، جو افلاطون کے وقت سے جاری تھیں۔ قانون کی صرف دو درس گاہیں باقی رکھیں۔ ایک بیرتیس کی اور دوسری قسطنطنیہ کی۔ شہر کے وہ تمام کلیسا بند کر دیے، جن میں آرتھوڈوکس طریقے کے

---

[1] TRIBONIAN (وفات ۵۴۶ء) [2] THEOPHILOS (۵۲۷ء - ۵۶۵ء)

خلاف عبادت ہوتی تھی۔ اس طرح ایا صوفیہ کے اسقفِ اعظم کو سب پر برتری حاصل ہوگئی۔ سرکاری آدمیوں نے شہر میں منادی کر دی کہ شہنشاہ خدا کے فضل سے دن رات ایسے منصوبے سوچتا رہتا ہے جن سے عوام کو فائدہ پہنچے۔ امرا و عمائد کے ایوانوں میں یہ بات بہت جلد مشہور ہوگئی کہ نیا شہنشاہ عوام کا شہنشاہ ہے۔

جسٹینین کی مطالعہ گاہ کے پاس ایک وسیع ایوان تھا۔ اس کی ایک دیوار پر ایک نقشہ رنگ روغن سے بنایا گیا تھا۔ اس کی غلام گردش سمندر کی جانب تھی، جہاں سے ایشیا کی سیاہ پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔ یہیں وہ نصف درجن وزراء بیٹھ کر مشورے کرتے تھے، جو تمام انتظامات کے ذمّہ دار تھے۔ وہ لوگ مشوروں کو اپنی ذات تک محدود رکھتے تھے اور کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔ اس مشورت گاہ میں ایوانِ عمائد کے لیڈر اور بڑے بڑے پادری بھی بلائے جاتے۔ سالارِ اعظم بھی ان مشوروں میں شامل ہوتا کیونکہ وہ فوج کے انتظامات اور محاصل کا ذمّہ دار تھا، لیکن بخشی[ے] سب سے بڑھ کر بااختیار تھا۔ سلطنت کے ناظمِ اعلیٰ کی حیثیت میں وہ ہر فیصلے کو ردّ کر سکتا تھا۔ جسٹینین نے اس عہدے پر ٹرائی بونین کو مقرر کیا۔

اس کے شہنشاہ بننے سے کچھ مدت پہلے مشرق میں ایک شدید زلزلہ آیا تھا، جس میں انطاکیہ تباہ ہو گیا۔ نیز ایرانی سرحد پر جنگ کی آگ بھڑک اُٹھی۔ مجلس شوریٰ نے یہ تجویز پیش کی کہ انطاکیہ کے آفت رسیدہ باشندوں کے لیے خوراک اور نقد امداد کا انتظام کیا جائے۔ جسٹینین نے صرف اس تجویز پر قناعت نہ کی بلکہ حکم دے دیا کہ پورا شہر از سرِ نو تعمیر کیا جائے اور تمام بازار پختہ ہوں۔ ایرانی محاذ کے لیے اس نے بیلی ساریوس کو سپہ سالار بنا کر بھیجنے کی تجویز کی۔ اس پر اعتراض ہُوا کہ پچھلی مرتبہ جنگ ہوئی تھی تو بیلی ساریوس اپنی چھوٹی سی فوج کے ساتھ دریائے فرات کے جزیروں میں پناہ گزیں ہو گیا تھا۔ جسٹینین نے کہا کہ یہ جزیرے رومی سرحد سے باہر تھے۔ بیلی ساریوس کامیاب ہُوا ہو یا نہ ہُوا ہو، یہ کیا کم ہے کہ اس نے رومی سرزمین کے باہر جنگ کی۔

اب ملکہ کی کیفیت بھی ملاحظہ فرما لینی چاہیے۔ زنانہ حصّے کی حاجبۂ عُلیا سب سے پہلے ملکہ کو جُھک کر سلام کرتی اور بڑی مدھم آواز میں بتا دیتی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ملکہ حمام کے لیے جاتی تو غلاموں کی ایک قطار نمک، اُبٹنے اور خوشبوئیں لیے اس کے ساتھ چلتی۔ نازبردار ہاتھ ہر موقع کے لیے اسے

ے QUAESTOR

مناسب لباس پہناتے۔ اس کے تاج سے جواہر کی لڑیاں آویزاں تھیں، وہ بالوں کو چھوتیں تو ملکہ دم بخود رہ جاتی۔ جسٹینین نے اس کے لیے ایک خاص حاجب مقرر کر دیا تھا، جو ضروری باتیں بتاتا رہتا۔ وہ محل سے نکلتی تو محافظ فوج کے افسر اور سنتری اس کے آگے آگے چلتے۔ بعض اوقات موسیقار ساتھ ہوتے۔ ابتدائی دور میں اسے صرف یہ احساس ہوا کہ ملکہ سلطنت کی شان و شکوہ کا پیکر ہوتی ہے، لیکن وہ اس انتظار میں رہی کہ موقع آئے تو مزید کارنامے انجام دے۔

آہستہ آہستہ اس نے جسٹینین پر اثر ڈالا اور اس کی طرف سے ابتدا میں جو احکام جاری ہوئے ان میں ملکہ تھیوڈورا کا اثر صاف محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً

۱ - بیٹی کو بیٹے کے برابر میراث میں حصّہ ملنا چاہیے۔

۲ - شوہر کی وفات کے بعد بیوی کا جہیز اس کی ملکیت بن جاتا ہے۔

۳ - کنیز کا بچہّ غلام نہیں سمجھا جائے گا۔

۴ - قحبہ خانوں کے مالکوں کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ہمیں معلوم ہے بعض لوگ غریب لڑکیوں کو نئے لباس کا لالچ دے کر خفیہ جگہوں میں لے جاتے ہیں۔ وہاں انھیں بہت کم خوراک اور بہت معمولی لباس دے کر بند رکھتے ہیں اور مختلف لوگوں کی ہوس رانی کا شکار بناتے ہیں۔ مالک ان لڑکیوں سے تحریریں لے لیتے ہیں اور آمدنی خود ہضم کر جاتے ہیں۔ بعض آدمی اتنے ناپاک ہیں کہ وہ دس دس برس کی بچیوں کو بھی ملوّث کرنے میں متأمل نہیں ہوتے۔ ہمیں اس کا پورا علم ہے اور ہم نے عزم کر لیا ہے کہ شہر کو اس آلائش سے پاک کر دیں۔

جسٹینین نے ملکہ کے لیے اناطولیہ میں جاگیریں مقرر کر دی تھیں، جن کی آمدنی اس کے خزانچی کے پاس جمع رہتی تھی۔ شاہی محل میں آجانے کے باوجود اس نے ہرمز دالامکان اپنے ہی قبضے میں رکھا اور شاہی محل کے باغ سے ملا دیا۔ پاس ہی ایک چھوٹا سا گرجا تھا، جس میں ملکہ اور شہنشاہ عبادت کرتے تھے۔ اسے از سرِ نو تعمیر کرا لیا گیا۔

یہ حقیقت واضح ہے کہ شہنشاہ یا ملکہ میں سے کسی کو بھی شہر میں کسی خطرے کا احساس نہ تھا۔ جسٹینین فرصت کے اوقات محل کے باغات کے اندر تنہا ٹہلتا رہتا۔ پاس ہی پُرانے گرجے تھے۔ نیز سرکاری دفاتر، سیمسن کا شفاخانہ اور شاہی اسلحہ خانہ تھا جن تک ایک زمین دوز راستہ بنا ہُوا تھا۔

اسلحہ خانے کے نچلے حصّے میں جنگی سامان کی تجربہ گاہ تھی۔ ساتھ ہی مختلف نقشے اور خفیہ دستاویزیں تھیں۔ ماہرینِ کیمیا اس کوشش میں مصروف تھے کہ یونانی "آگ" کو زیادہ سے زیادہ بے پناہ بنا دیں۔ محل کی بنیادی منزل محراب دار تھی۔ اس حصّے میں شاہی اصطبل تھے۔ پاس ہی ایک چھوٹا سا میدان گھوڑوں کے پھرانے اور سدھانے کے لیے تھا۔ جہاں باغ ختم ہوتا تھا، وہاں سمندر کے کنارے فصیل تھی۔ نیز چھوٹی چھوٹی بندرگاہیں، جہاں شہنشاہ کی تیز رفتار کشتیاں ٹھہری رہتی تھیں۔

جسٹینین چاہتا تھا کہ بہتر جہاز تیار کرائے کیونکہ وہ پرانی رومی سلطنت بحال کر دینے کا خواہاں تھا، جو وحشیوں کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ تقریباً ایک سو سال کا عرصہ گزر چکا تھا، جب گیسرک[1] کے ونڈال سینٹ آگسٹائن کے شہر ہپو[2] اور قرطاجنہ پر قابض ہو چکے تھے۔ وہاں سے انھوں نے روما پر غارت گرانہ حملہ کیا تھا اور شہنشاہی نشانوں کے علاوہ رومی شہزادیوں کو بھی اُٹھا کر لے گئے تھے۔ پھر ریٹیلا نے یورپ کو برباد کیا اور رومی طاقت فنا ہو گئی۔ اب ونڈالوں کے بیڑے ان مُلکوں کے ساحلوں کا چکر لگا رہے تھے، جن پر گاتھ بادشاہ حکمران تھے۔

جسٹینین جب کبھی محل کی بندرگاہ کا معائنہ کرتا تو اسے سمندر پار سے آئے ہوئے پناہ گیر کشتیوں کے ملّاحوں سے پانسے پھینکتے نظر آتے۔ اس وجہ سے چھنی ہوئی سلطنت کی یاد ہر وقت اس کے دل میں تازہ رہتی۔ چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ بیڑے میں فوج سوار کرا کے افریقہ کی تسخیر کے لیے بھیج دے۔ مجلسِ شوریٰ میں یہ تجویز پیش ہوئی تو اس کے لیے کسی کی زبان سے کلمۂ خیر نہ نکلا۔ قسطنطنیہ سے جو آخری جہاز افریقہ کی طرف بھیجے گئے تھے، ونڈالوں نے انھیں راستے ہی میں روک کر جلا ڈالا تھا۔ سالارِ اعظم نے جسٹینین سے کہا: "عالی منزلت! آپ ہمارے مشورے سُنتے ہیں اور بعض اوقات انھیں قبول بھی فرما لیتے ہیں۔ ہم آپ کی رائے کے خلاف بھی کچھ کہیں تو خفگی ظاہر نہیں فرماتے۔ اب میں صاف صاف عرض کروں کہ اس تجویز کے متعلق میری رائے کیا ہے۔ تجویز بڑی اچھی ہے، لیکن اس پر عمل کے وسائل ناپید ہیں۔ ہماری فوجیں سرحدوں کی حفاظت میں خاصی مشقت اٹھا رہی ہیں۔ نئی سپاہ کے لیے نئے ٹیکس درکار ہوں گے۔ عوام ایسی کسی کوشش میں تعاون نہ کریں گے۔ اگر

---

[1] GAISERIC [2] HIPPO یہ الجزائر کا ساحلی شہر تھا۔ اب اس کا نام بُونہ ہے۔

شہریوں نے مخالفت کا علم بلند کر دیا تو شہنشاہی ختم ہو جائے گی۔"

جسٹینین نے کہا کہ اگر میں وسائل مہیا کر لوں؟ سالار نے جواب دیا، کیا آپ جادو کے زور سے مسلح افواج پیدا کر لیں گے؟ اگر یہ ممکن ہے تو بیس ہزار شمشیر زن بلائیے۔ تنخواہ کے بجائے انھیں لوٹ کی امید دلائیے۔ اگر جہاز مل سکتے ہوں تو ان پر سوار کرا دیجئے لیکن کیا وہ ونڈالوں کے جنگی بیڑے سے لڑ کر کامیاب ہو جائیں گے؟ اگر کوئی معجزہ ونڈالوں کو برباد کر سکے تو پھر کیا ہوگا؟ شہنشاہ! کیا آپ کی فوج ایک برِ اعظم کو قبضے میں رکھ کر اس کا انتظام کر سکتی ہے؟ حضرت میکائیل ہمارے سالاروں کو فتح عطا کریں۔ معمولی تنخواہ پر وہ کب تک مطمئن رہیں گے اور کب تک آپ کی خدمت کریں گے، جب افریقہ کے ساحل اور رومہ و یروشلم کے خزانے ان کے قبضے میں ہوں گے؟

جسٹینین نے تسلیم کر لیا کہ سالار نے سچ کہا۔ فتح کا کوئی خواب جنگ کے ٹھوس حقائق کو کالعدم نہیں کر سکتا تھا۔ اُدھر صحرائے طرابلس سے تباہ حال راہب پیدل چل چل کر باسفورس کے گھاٹ پر پہنچ رہے تھے۔ شاہی ایوان میں وہ جسٹینین اور تھیوڈورا کے سامنے آئے تو کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا اور کہا: "تو مسیحی شہنشاہ ہے۔ کیا خدا کو چھوڑ کر دنیوی دیوتاؤں کا خدمت گزار بن گیا ہے؟ کیا تجھے ان مسیحیوں کا کچھ خیال نہیں جو افریقہ میں بے یار و مددگار رہ گئے ہیں؟"

شمال میں ڈینیوب کی فوج منڈس کے زیرِ کمان مغربی جانب پیشقدمی کرتی ہوئی ایڈریاٹک کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ مشرق سے قاصد بیلی ساریوس کی فتحمندی کی خبریں لائے۔ ساتھ ہی یہ افواہ پہنچی کہ ایران کا ساسانی بادشاہ قباد[1] بسترِ مرگ پر ہے۔ ان خبروں سے وزارتِ جنگ اور مجلسِ شوریٰ کو اطمینان حاصل ہوا۔ جسٹینین کے دل میں از سرِ نو یہ امید پیدا ہوئی کہ اب مغرب کی جانب فوجیں بھیجنے کا مناسب وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ اس نے منڈس اور بیلی ساریوس کو قسطنطنیہ بلا لیا اور شہنشاہِ ایران سے مصالحت کے لیے سفیر بھیج دیا۔ اس طرح سب سے بڑھ کر قابلِ اعتماد فوجیں شہر میں واپس آ گئیں اور اسلحہ خانے کو بار برداری کے نئے جہاز تیار کرنے کا حکم مل گیا۔ ان تیاریوں سے عوام میں بے اطمینانی پھیل گئی جسے سرکاری مصارف خیر میں کمی اور نئے ٹیکسوں نے اور بڑھا دیا۔

---

[1] مصنف نے نام غلط لکھا ہے یعنی KAVADH کواذ۔ صحیح نام قباد ہے۔ یہ نوشیرواں کا باپ تھا۔ یہ دو مرتبہ بادشاہ بنا۔ پہلی مرتبہ ۴۸۵ء — ۴۹۸ء، دوسری مرتبہ ۵۰۱ء — ۵۳۱ء

یکایک ایک فساد ہُوا، جس میں چند بے ضرر ناظر مارے گئے۔ شہر کے کوتوال نے ہنگامے کے سات سرغنے گرفتار کر لیے اور ان کے لیے پھانسی کا حکم صادر کر دیا۔ یہ سزا محافظ فوج کی نگرانی میں دی گئی، لیکن کوتوال کی تجویز پیشِ نظر نہ رکھی گئی۔ پھانسی پانے والوں میں سے دو کے رسّے ٹوٹ گئے اور وہ زمین پر گر پڑے۔ تماشائی ان کے ساتھ ہو گئے اور وہ سینٹ لارنس کے مقدس گرجے میں جا بیٹھے، جو دوشیزۂ بلاشرنائی[1] کے دروازے سے قریب تھا۔ ان میں سے ایک کا تعلق سبز پوشوں سے تھا، دوسرے کا نیلی پوشوں سے۔

جنوری ۵۳۲ء کا وسط تھا۔ لوگ ہپوڈرم کے میدان میں شکایتیں لے کر جمع ہوئے۔ دستور یہ تھا کہ ہر سال شہر کے لیے قونصل مقرر ہوتا۔ جسٹینین نے اس سال کوئی قونصل مقرر نہ کیا اور خود ہی قونصل بن گیا۔ ساتھ ہی اعلان کیا کہ کھیل نہیں ہوں گے، البتہ ایک ہفتہ رتھوں کی دوڑ جاری رہے گی۔

---

[1] BLACHERNAI، جیسا کہ نقشے سے واضح ہوگا، یہ دروازہ شہر کے شمال مغرب میں "شاخ زرّیں" سے قریب تھا۔ اسی مقام پر ایک گرجا تھا، جو مریمؑ عذرا کے نام سے موسوم تھا۔

آٹھواں باب

خوفناک بغاوت

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، جنوری ۵۳۲ء کا وسط تھا، منگل کی صبح خنک بادِ شمال چل رہی تھی۔ عوام کا ہجوم شارع اوسط سے ہوتا ہُوا ہپوڈروم کی طرف جا رہا تھا۔ سب نے چغے پہن رکھے تھے اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں ساتھ لے لی تھیں۔ کھیلوں کا یہ پہلا دن تھا اور افواہ گرم تھی کہ آج شہر کے عوامی نمائندوں اور شہنشاہ کے درمیان بحث و گفتگو ہوگی۔ زیادہ تر لوگ قسطنطین کے چوک میں جمع تھے۔ باہر کے کسان اپنے پادریوں کے ہمراہ آئے تھے۔ یہ سال مشکلات میں گزر رہا تھا اور انطاکیہ و طرسوس میں فسادات بھی ہو چکے تھے۔ پادری اپنے حلقوں اور خطیب اضلاعِ شہر کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ایوانِ عدالت بند تھا۔ کوتوالِ شہر کے صدر دفتر پر پولیس کے سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ ہجوم سے تھوڑے فاصلے پر فوج کی بارکیں اور پریڈ کا میدان تھا اور بعض رجمنٹیں وہاں موجود تھیں جو کچھ مدت پیشتر سرحدوں سے آئی تھیں۔ ان لوگوں کا تعلق وحشی اقوام سے تھا۔ ان کی تنخواہیں کم تھیں اور شہر کے دولت مند لوگوں سے انھیں کوئی ہمدردی نہ تھی۔ ان کے سالاروں یعنی منڈس اور بلی ساریوس نے انھیں حکم دے دیا تھا کہ وہ بارکوں ہی میں رہیں۔ چوک سے جو بازار محل کی طرف جاتا تھا، اس کی داہنی جانب ہپوڈروم کی بیرونی دیوار کے نیچے حمام تھے۔ وہیں نیلی پوش اور سبز پوش کھڑے تھے۔

یہ دونوں فریق ابتداءً شہر کی ملیشیا میں رکھے گئے تھے اور فیصلہ کر دیا گیا تھا کہ ضرورت کے وقت انھیں فصیل کے کون کون سے حصے کی حفاظت کا فرض انجام دینا چاہیے۔ ان کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ نازک وقت میں جہازوں اور کشتیوں کے لیے ملاح مہیا کریں، لیکن مدت سے ان خدمات کی ضرورت نہیں پڑی تھی اور انھوں نے مصافی سرگرمیاں چھوڑ کر غیر مصافی مشاغل اختیار کر لیے تھے۔ دستکار اور تاجر سبز پوشوں میں، کسان اور زمیندار نیلی پوشوں میں شامل ہو گئے تھے۔ گویا پہلا گروہ شہری فریق کا اور دوسرا گروہ ملک کے بیرونی حصوں کا نمائندہ تھا۔ موجودہ دور کی طرح شہری سیاستدان

انتہا پسند اور زرعی حلقوں کے سیاستدان قدامت پسند تھے۔ دونوں گروہ حد درجہ مذہب پرست تھے۔ نیلی پوش بہ حیثیتِ مجموعی آرتھوڈکس اور سبز پوش عموماً باغیانہ عقیدوں کی طرف مائل تھے۔

عین اس وقت سبز پوشوں نے جسٹینین کے سامنے شکایت پیش کی کہ ہم بے سروسامان رہ گئے ہیں۔ آپ نیلی پوشوں پر نظرِ لطف رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے آدمیوں کو شہر سے نکل کر مضافات میں جانے کے لیے مجبور کر دیا ہے"۔ دراصل جسٹینین نے دونوں گروہوں کے لیڈروں سے یکساں برتاؤ کیا تھا اور اس روز سب کی توجہ ان دو مجرموں پر جمی ہوئی تھی، جن میں سے ایک نیلی پوش اور دوسرا سبز پوش تھا اور وہ کوتوال کے نیزہ برداروں سے خوف زدہ ہو کر سینٹ لارنس کے گرجے میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔

سبز پوشوں اور نیلی پوشوں میں ایسے آدمی بھی شامل ہو گئے تھے، جو شہر سے چنداں واقف نہ تھے۔ یہ لوگ ان اہلِ ثروت کے آلۂ کار تھے، جن میں سے بعض کو عمائد کا درجہ حاصل تھا۔ وہ اپنی جاگیروں میں بااختیار حاکموں کی طرح رہتے تھے اور ان کے پاس مسلح دستے ملازم تھے۔ پہلی شہنشاہوں میں ان سے کسی نے پورا ٹیکس وصول نہیں کیا تھا۔ جسٹینین کے عہد میں سب سے مالیہ اور ذاتی ٹیکس وصول کیا گیا تو وہ دل میں بگڑے بیٹھے تھے۔ انھیں بار بار اناسٹاسیوس کا دورِ حکومت یاد آ رہا تھا، جس کے تین بھتیجے شہر میں موجود تھے۔ چنانچہ یہ لوگ سوچ رہے تھے کہ کیوں نہ ان میں سے کسی کو جسٹینین کی جگہ تخت پر بٹھا دیا جائے۔ جسٹینین کا حاجبِ اعلیٰ خواجہ سرا نرسی ہجوم میں چکر لگا رہا تھا اور اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ عوام کا مزاج بگڑا ہوا ہے۔

جسٹینین باب الحاج سے باہر نکل کر ایک چکر کھاتی ہوئی سیڑھی کے ذریعے سے ان کمروں میں پہنچ گیا، جو شاہی نشستگاہ سے ملحق تھے۔ آس پاس پہرے دار کھڑے تھے۔ شاہی نشستگاہ اکھاڑے کے شمالی و مشرقی حصے میں تھی۔ شہنشاہ کی داہنی جانب نیلی پوشوں اور بائیں جانب سبز پوشوں کا قیام تھا۔

جسٹینین عوام کے سامنے آیا تو پُرزور نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ دوڑ شروع ہوئی۔ جس رتھ بان نے بازی جیتی، وہ رُکا تو عوام نے اس کے لیے صدائے تحسین بلند کی۔ ساتھ ہی یہ آواز آئی: "عالی منزلت شہنشاہ! آپ کی حکومت ہمیشہ قائم رہے۔ جو آدمی پھانسی سے بچ گئے، ان کا رہائی کا

حکم دے دیجیے۔" پھر ایک گروہ پکارا: "عالی منزلت شہنشاہ! اُن لوگوں کو رہا کر دیجیے، جنھیں کوتوال نے موت کی سزا دینی چاہی، مگر خدا نے انھیں بچالیا۔"

جسٹینین کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ کوتوال کا حکم بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ عوام میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ آخری دوڑ کے اختتام پر پھر ایک نعرہ لگا: "زندہ باد مصیبت زدہ نیلی پوش اور سبز پوش!" یہ دونوں فریقوں کے اتحاد کا اعلان تھا۔

دوڑ ختم ہوگئی۔ ہجوم ہپوڈروم سے نکل کر بازاروں میں پہنچ گیا اور اس نے کوتوال کے صدر مستقر کا رُخ کر لیا۔ مطالبہ یہ تھا کہ سینٹ جارج کے گرجے پر جو پہرے لگائے گئے ہیں، ہٹا دیے جائیں۔ مطالبہ پورا ہوا تو ہجوم نے مزاحم سپاہیوں پر حملے شروع کر دیے۔ اِدھر اُدھر مکانوں میں آگ لگادی۔ جو لوگ آگسٹس کے چوک میں پہنچ گئے، انھوں نے جلتی ہوئی گھاس پھوس سے بھری ہوئی گاڑیاں محل کے برجی دروازے کی طرف دھکیل دیں۔ ہوا نے آگ کے شعلے دُور دُور پہنچا دیے۔ چنانچہ ایوانِ عمائد سے آگ ایا صوفیہ میں جالگی اور رات بھر میں گرجا جل کر خاک ہوگیا۔ اگلی صبح بدھ تھا۔ جسٹینین نے حکم دے دیا کہ دوڑ بہ دستور جاری رہے گی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح لوگ مطمئن ہو جائیں گے، لیکن لوگوں نے مطمئن ہونے کے بجائے مطالبہ شروع کر دیا کہ ان وزیروں کو برطرف کر دیا جائے جو عوام پر ظلم کر رہے ہیں۔ جسٹینین نے شاہی نشستگاہ سے اُٹھ کر ممتاز عمائد سے مشورہ کیا۔ جو لوگ محل کی چھت پر کھڑے تھے، انھیں صاف نظر آرہا تھا کہ مختلف کنبے کشتیوں میں سوار ہو کر ایشیائی ساحل کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ خیر خواہوں نے جسٹینین کو مشورہ دیا کہ وزیروں کو برطرف کر دیجیے۔ بڑے تذبذب کے بعد اس نے یہ رائے قبول کی۔

سرکاری آدمی فوجی کماندار منڈس کی سرکردگی میں یہ اعلان کرنے کے لیے نکلے کہ کوتوال اور وزیر برطرف کر دیے گئے ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ قسطنطین کے چوک میں بہت بڑا جلسہ ہو رہا ہے۔ جب لوگوں نے وزیروں کی برطرفی کا اعلان سُنا تو شکرانے کا گیت گایا، لیکن نمائندوں نے جواب میں اس قدر تاخیر کی منڈس اور اس کے ساتھی غیر مطمئن واپس جانے پر مجبور ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مطالبہ ہپوڈروم میں منظور کر لیا جاتا تو حالات نہ بگڑتے۔ پھر جسٹینین نے ایک اور غلطی کی یعنی اعلان کرا دیا کہ امن قائم رکھا جائے گا اور کھیل اگلے دن بھی جاری رہیں گے۔ اب عوامی

کارکنوں کو اپنی مرضی کے مطابق پروپیگنڈے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ جسٹینین جب چاہتا ہے، رائے بدل لیتا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اب نئے حکمران کے معاملے پر غور کیا جائے۔ چنانچہ عوام کے لیڈران مکانوں کی طرف گئے، جو جنوبی سمندر کے کنارے واقع تھے۔ وہیں اناستاسیوس کا ایک بھتیجا پروبس رہتا تھا۔ اگرچہ وہ جسٹینین کا مخالف تھا لیکن دُور اندیشی کی بنا پر شہر چھوڑ گیا تھا۔ لیڈروں نے غصّے کے جوش میں اس کا گھر جلا دیا اور اس اسلحہ خانے کو جس میں شہری دفاع کے لیے اسلحہ جمع تھے لوٹ لیا۔

جسٹینین نے معمول کے مطابق اپنے سکون میں فرق نہ آنے دیا، لیکن تذبذب اس کے لیے حد درجہ تکلیف دہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ عوام پر قابو پالیا جائے گا۔ اب یہ خیال ہو رہا تھا کہ پہلے ہی مرحلے پر فوج سے کام لینا چاہیے تھا۔ اس صورت میں امن فوراً قائم ہو جاتا، خواہ کتنی ہی جانیں ضائع ہو جاتیں۔ آخر یہ فیصلہ کیا کہ اگلے دن صبح کو منڈس اور بیلی ساریوس مسلح فوج کے ساتھ محل کے سامنے پہنچ جائیں۔ چنانچہ دونوں سالاروں نے چودہ سو رفیقوں کے ساتھ فرمان کی تعمیل کی۔ ملکہ تھیوڈورا بھی زنانہ محل سے نکل کر شوہر کے پاس پہنچ گئی۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ تخت خطرے میں پڑ گیا ہے۔

اگلے تین روز شاہی محل محصور رہا۔ جسٹینین نے بیلی ساریوس کو حکم دیا کہ مسلح ہجوم کو پیچھے ہٹایا جائے۔ بیلی ساریوس اپنے وفادار گھڑسواروں کے ساتھ باہر نکلا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آگسٹس کے چوک میں جنگ ہوئی۔ پھر جگہ جگہ آتش زنی شروع ہو گئی۔ سیمپسن کا شفاخانہ جل گیا۔ بعض پرانے گرجے بھی نذرِ آتش ہو گئے۔ ایا صوفیہ کے پادری اپنی صلیبیں اور خاص بُت لے کر جلوس کی شکل میں باہر نکلے۔ انھیں خیال تھا کہ جلوس کو دیکھتے ہی عوام ہتھیار رکھ دیں گے، لیکن منڈس کے لامذہب سپاہیوں نے یہ سمجھا کہ یہ حملے کا نیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ غریب پادریوں کو مار مار کر پیچھے ہٹا دیا۔ ہفتے کے دن شام کو بیلی ساریوس اور منڈس ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے واپس ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنی تھوڑی فوج ہجوم سے بازاروں کو پاک کرنے کے لیے کافی نہ تھی۔

جسٹینین نے فوج کے استعمال کی ذمّہ داری خود اٹھالی۔ وقت حد درجہ نازک تھا۔ محل میں خوراک اس ہجوم کے لیے کافی نہ تھی جو اندر بند تھا۔ جسٹینین نے ہفتے کی رات کو ان عمائد و امراء کو باہر نکال دیا، جن کی وفاداری مشتبہ تھی۔ اتوار کی صبح کو اس نے بازاروں میں اعلان کر دیا کہ ہپوڈروم میں رعایا سے رُو در رُو گفتگو کی جائے گی۔ مقررّہ وقت آیا تو انجیل کا ایک مطلا مخطوطہ ساتھ لیا اور پورے شاہی لباس میں عوام کے سامنے پہنچ گیا۔ منادی کرنے والے نے اعلان کیا کہ شہنشاہ جسٹینین ان تمام حرکات کے لیے رحم کا وعدہ کرتا ہے، جو گزشتہ ایام میں ہو چکی ہیں۔ کسی کو مجرم نہیں گردانا جائے گا اور نہ کوئی نقصان پہنچایا جائے گا۔ پھر جسٹینین خود انجیل لے کر کھڑا ہُوا اور پُکار کر کہا: صرف مَیں مجرم ہوں اور اس مقدّس کتاب کی قسم کھا کر یہ اقرار کرتا ہوں "۔ مجمعے سے کچھ آوازیں اُٹھنے لگیں، لیکن سب لوگ اس انتظار میں تھے کہ نیلی پوشوں اور سبز پوشوں کے لیڈر کیا کہتے ہیں۔ جو لوگ ہنگامے کی آگ مشتعل رکھنے کے ذمّہ دار تھے، (وہ ادھوری تدبیروں پر قناعت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔) ان کو ڈر تھا کہ امن قائم ہو جانے کے بعد بدلا لیا جائے گا۔ بعض اتنے جوش میں تھے کہ کوئی بات سُننے کو تیار ہی نہ تھے۔ پھر آواز اٹھی: "جسٹینین! اس وعدے کے ایفاء کی ضمانت کیا ہے؟ تم نے ایک دفعہ وٹالین کے ساتھ امن کا عہد کیا تھا اور انجیل ہی کی قسم کھائی تھی۔ وٹالین کہاں ہے؟

گویا یہ تدبیر بھی ناکام رہی۔ باغی لوگ شہریوں کو ساتھ ملانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انھوں نے قسطنطین کے دیو پیکر مجسمے کے نیچے باہم مشورے شروع کیے تو محل تک پورا علاقہ جلا ہُوا نظر آ رہا تھا۔ ان کی امداد کے لیے امراء کی جاگیروں سے جدید مسلّح دستے پہنچ گئے۔ زیادہ تر عمائد کہہ رہے تھے کہ شاہی محل پر حملہ کر دیا جائے۔ صرف ایک شخص نے یہ مشورہ دیا کہ ہمیں انتظار کرو۔ جسٹینین اور تھیوڈورا بچ کر نکل جائیں گے اور شہر مزید جدال و قتال کے بغیر قبضے میں آجائے گا۔

عوام اپنے لیڈروں کے مشورے کے منتظر تھے۔ شہر کے باشندے بڑے بڑے بازاروں کی آتش زدگی سے متاثر تھے۔ سبز پوشوں نے محل پر حملے کے لیے آگے بڑھنا شروع کیا۔ امراء اور عمائد جسٹینین کے جانشین کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ اناسٹاسیوس کا سب سے بڑا بھتیجا ہائی پاٹیئس ادھیڑ عمر کا

آدمی تھا، جو وٹالین کی قید میں رہ چکا تھا۔ اس کی شہنشاہی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کی بیوی نے بہت مزاحمت کی اور یہ بھی کہہ دیا۔ کہ تم لوگ میرے شوہر کو موت کی طرف لیے جا رہے ہو، لیکن کسی نے اس کی باتوں پر کان نہ دھرا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہائی پاٹیٹس کو ہپوڈروم لے جا کر شاہی نشستگاہ پر بٹھا دیا گیا۔ وہاں سے اس نے افرائیم[1] نام ایک شخص کو پیغام دے کر جسٹینین کے پاس بھیجا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ پیغام کیا تھا۔ بہرحال اس شخص کا بھیجا جانا ایک ایسا واقعہ تھا، جس نے تقدیر کا رُخ بدل دیا۔

افرائیم تیزی سے محل کی طرف چلا۔ دروازے پر ایک شاہی دبیر سے مڈبھیڑ ہوئی، جس نے بتایا کہ جسٹینین اور تھیوڈورا محل چھوڑ کر جہاز کی طرف جا چکے ہیں، جو انھیں ایشیا کے ساحل پر لے جائے گا۔ افرائیم وہاں سے پلٹا اور شاہی نشستگاہ میں یہ خبر پہنچا دی۔ جسٹینین کے فرار کی افواہ سُنتے ہی عوام نے فتح کے گیت گائے۔

اُدھر محل کی کیفیت یہ تھی کہ نرسی سائے کی طرح جسٹینین کے ساتھ لگا ہُوا تھا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ زر و جواہر لے کر ہرقلیہ چلے جانا چاہیے۔ بلی ساریوس اس تجویز کا حامی تھا۔ جسٹینین کو اسی طرح مختلف مشورے دیے جا رہے تھے اور وہ خاموش بیٹھا تھا۔ کسی فیصلے پر پہنچنا معلوم نہ ہوتا تھا۔ ہپوڈروم سے شور و غوغا کی آواز برابر آ رہی تھی۔ وہاں فتح پر زور کے نعرے لگ رہے تھے۔

عین اس موقع پر تمام معمولات و آداب کے خلاف تھیوڈورا نے تقریر شروع کی۔ اس نے کہا:

"شہنشاہ! آپ بے تکلف جا سکتے ہیں۔ سمندر کا راستہ کھلا پڑا ہے۔ جہاز تیار ہیں۔ آپ کے پاس خاصا بڑا خزانہ موجود ہے، لیکن اگر آپ چلے جائیں گے تو جلاوطنی میں یہ سوچنے کا کوئی موقع نہ رہے گا کہ یہیں ٹھہرا رہتا تو کیا ہوتا۔ میں تو یہیں رہوں گی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو لوگ ایک مرتبہ ارغوانی شاہی لباس پہن لیتے ہیں، انھیں کبھی وہ لباس اُتارنا نہ چاہیے۔ جس روز لوگ مجھے ملکہ کہنا چھوڑ دیں گے۔ میں سمجھتی ہوں کہ زندگی میں میرے لیے کوئی دلچسپی نہ رہے گی۔

سب کی نظریں چھریرے بدن کی اس عورت کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ

---

[1] EPHRAIM

تھی۔ اس نے بڑے اطمینان سے کہا: میں اس پرانی مثل کو پسند کرتی ہوں کہ ارغوانی رنگ کا کفن بہترین ہوتا ہے۔

کسی نے تھیوڈورا کو اس فیصلے سے ہٹانے کی کوشش نہ کی، البتہ یہ واضح ہوگیا کہ وہ ٹھہری رہے گی اور اس کی حفاظت کا انتظام ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی یہ طے کرلیا گیا کہ اگر جہازوں پر سوار ہوکر بھاگنے کا معاملہ خارج از بحث ہے تو جو بھی تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے، اس میں ایک لمحے کی تاخیر نہ ہونی چاہیے۔ جسٹینین نے فوراً حکم دے دیا کہ منڈس اگسٹس کے چوک والے دروازے کی حفاظت کرے اور بیلی ساریوس اپنے زرہ پوش سپاہیوں کے ہمراہ غلام گردشوں سے ہوتا ہُوا شاہی نشستگاہ پر پہنچ جائے اور باغیوں کے لیڈروں کو گرفتار کرلیا جائے۔

تھیوڈورا نے نرسی کے ذمّے یہ کام لگا دیا کہ بیلی ساریوس کے لیے راستہ ہموار کرتا جائے۔ اُس نے بہت سا روپیہ لے لیا اور نیلی پوشوں کے لیڈروں سے ملا۔ ان سے پوچھا کہ تم ان بازاری لوگوں کے تسلط سے کیا حاصل کروگے؟ پیچھے پیچھے بیلی ساریوس پہنچ گیا۔ چونکہ نرسی پہلے ہی اپنا کام کرچکا تھا، اس لیے کسی نے مزاحمت نہ کی، لیکن جب بیلی ساریوس سیڑھی پر چڑھ کر نشستگاہ کے شمالی دروازے کی طرف گیا تو وہ بند تھا۔ عوام نے سپاہیوں کو دیکھا تو بے حد جوش میں آگئے۔ اب بیلی ساریوس دو مصیبتوں میں گھر گیا تھا۔ ایک طرف شاہی نشستگاہ کی محافظ فوج تھی، دوسری طرف ہزاروں عوام تھے۔ اس نے سپاہیوں کو حملے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ سپاہیوں نے بڑی بے دردی سے مار مار کر عوام کو پیچھے ہٹایا۔ حقیقت یہ ہے کہ عوام تربیت یافتہ جنگ آزماؤں کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ اس اثناء میں منڈس دوسرے دروازے پر پہنچ گیا، جسے باب الموت کہتے تھے۔ کیونکہ وہاں سے مقتول جنگ آزماؤں کی لاشیں باہر نکالی جاتی تھیں۔

غرض اتوار کو دوپہر تک بغاوت فرو ہوگئی۔ شاہی نشستگاہ کے دروازے کھل گئے۔ ہائی پاٹیس اور اس کا بھائی پوپلی گرفتار کرلیے گئے۔ افواہ تھی کہ تیس ہزار آدمی ہپوڈروم میں مارے گئے۔ یہ درست ہو یا نہ ہو لیکن ہزاروں یقیناً مارے گئے۔ کسی نے سُنا کہ ہائی پاٹیس کُشتوں کے پشتے دیکھ کر بھائی سے کہہ رہا تھا، ان پر آنسو نہ بہاؤ۔ جو کچھ انھیں پیش آیا، یہ اسی کے مستحق تھے۔ دونوں بھائیوں کو تھیوڈورا نے موت کی سزا دلائی۔ البتہ تیسرے بھائی پروبس کو جسٹینین نے بے جرم قرار دے کر

ے PROBUS

معاف کردیا۔ جس دبیر نے جسٹینین کے فرار کی جھوٹی کہانی فرائیم کو سُنائی تھی، اسے بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

جسٹینین دل میں سمجھتا تھا کہ ساری مصیبت کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ اس نے ہائی ٹیٹس اور پولپی کے خطابات ان کے بچّوں کو دے دیے اور ضبط شدہ جائدادیں بھی بڑی حد تک بحال کر دیں۔ کھیل غیر مُعیّن مُدت کے لیے ختم کر دیے گئے۔ ہپوڈروم میں عام جلسوں کی ممانعت ہو گئی۔ اس طرح اقتدار کاملاً جسٹینین کے قبضے میں آگیا۔ بازاروں میں ملیشیا کے جلوس روک دیے گئے۔ یہ حکم بھی جاری کر دیا گیا کہ خیرات خانوں میں لوگ خواہ مخواہ نہ داخل ہوں۔ کوئی بھکاری بازاروں میں نہ نظر آئے۔ ہر شخص کام کر کے روزی کمائے اور کام سب کے لیے مہیّا کیا جائے۔

نواں باب

بحیرہ روم اور شمالی افریقہ

بغاوت فرو ہو جانے پر جسٹینین نے عام معافی کا اعلان کر دیا اور شہر کے تباہ شدہ حصّوں کی از سرِ نو تعمیر اور بے خانماں لوگوں کی آبادکاری پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی۔ تھیوڈورا کو یہ اچھی طرح یاد تھا کہ جسٹینین کی سلطنت کو بچانے کی خاطر وہ خود کتنی بڑی قربانی کے لیے آمادہ ہو گئی تھی۔ اب اُس نے اپنی شاہانہ ذمّہ داریوں کو نباہنے کا پوری طرح تہیّہ کر لیا۔ اس نے شہر کے متعلق ہر قسم کی خبریں فراہم کرنے کا پورا اہتمام کیا۔ اس کی ملازمائیں اور خواجہ سرا جگہ جگہ پہنچتے تھے۔ جو کچھ سنتے، ملکہ کو سُنا دیتے۔ خصوصاً تاجروں اور مشرق کی طرف سے آنے والے زائروں کی باتیں ملکہ کے کانوں تک ضرور پہنچتی رہتیں۔ ملکہ نے ہرمزوالامکان، جو ذاتی ملکیت تھا، اُن راہبوں کے حوالے کر دیا، جن کے لیے سر چھپانے کو کوئی جگہ نہ تھی۔ چنانچہ اس جگہ کا نام ہی "بیت رہبان" مشہور ہو گیا۔ کہا جاتا ہے، وہ بڑی دیر تک خواب گاہ میں لیٹی رہتی۔ غسل اور آرائش پر بہت وقت صرف کرتی۔ اس اثنا میں ملازماؤں کی باتیں سنتی رہتی۔ وہ بڑی شان و شوکت سے باہر نکلتی۔ بغاوت فرو ہونے کے بعد اس نے ایشیائی ساحل کا دورہ کیا۔ چنانچہ وہ شہر زرّیں (اسکدار) بھی پہنچی۔ جسٹینین زیادہ وقت سرکاری کاغذات پڑھنے میں صرف کرتا اور اب اُس نے شہر کو از سرِ نو تعمیر کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ ہپوڈروم کے دروازے بند کرا دیے گئے تو جسٹینین نے شہر کی آبادی کے لیے سمندر کے کنارے ایک وسیع پارک بنوایا، جس کے ساتھ غسل کے لیے نہایت عمدہ انتظامات تھے۔ پارک میں سنگِ مرمر کے رواق تیار کرائے۔ ایک ستون پر ملکہ تھیوڈورا کا مجسمہ نصب تھا، جو ارغوانی پتھر کا بنا ہُوا تھا۔ کوئی دُور سے دیکھتا تو معلوم ہوتا، خود ملکہ بیٹھی ہے۔

تھیوڈورا نے ایشیائی ساحل پر ایک گرمائی محل خرید لیا اور وہاں ان عورتوں کے لیے قیام کا انتظام کر دیا، جو گزارے کے لیے عصمت فروشی پر مجبور تھیں۔ وہاں ان عورتوں کو کھانا بھی ملتا اور کشیدہ کاری بھی سکھائی جاتی۔ ملکہ ان کی شادیاں بھی کراتی رہتی۔

تھیوڈورا نے اپنی توجہ باسفورس کے ایشیائی ساحل پر مرکوز کر دی تھی۔ اس نواح کے لوگ

اس کے لیے اجنبی نہ تھے۔ اس کے علاوہ بغاوت کے بعد اسے پرانے شہر اور اس کے لوگوں پر بھروسا بھی نہیں رہا تھا۔ وہ ان کے ساتھ بڑے غرور و تجبر سے پیش آتی تھی۔ اسے اپنے بلند درجے کا اتنا خیال تھا کہ جو بھی ملاقات کو آتا، اس کے لیے لازم تھا کہ زمین پر گر کر اس کی پاپوش کو بوسہ دے۔ اس کے برعکس جسٹینین بہت سادہ زندگی بسر کرتا۔ وہ بہت کم کھاتا۔ اس کی غذا آشِ جو کا ایک پیالہ، روٹی کا ایک ٹکڑا اور سبز ترکاریاں تھیں، جن میں سرکہ یا روغنِ زیتون پڑا ہوتا۔ وہ بہت کم سوتا۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنے پرانے قابلِ اعتماد رفیق جمع کر لیے جن میں اکثر قسطنطنیہ کے رہنے والے نہیں تھے اور انھیں مختلف عہدے دے دیے۔

شہر کی تعمیرِ نو کے سلسلے میں اسے یہ بھی خیال تھا کہ ایا صوفیہ کی عمارت ایسی بنائے، جیسی اہلِ مغرب نے کبھی نہ دیکھی ہو۔ چنانچہ گرد و پیش کی زمین خرید کرنے کا حکم دیا۔ ایک بڑھیا نے اپنے مکان کی فروخت سے انکار کر دیا تو جسٹینین خود درخواست لے کر اس کے دروازے پر پہنچا اور مکان کی فروخت پر راضی کر لیا۔ ایک اور شخص کو کھیلوں کی لت تھی، جسٹینین نے ایک دن کے لیے رتھوں کی دوڑ کا انتظام کیا، لیکن کہہ دیا کہ دوڑ شروع اُس وقت ہوگی، جب فلاں شخص اپنا مکان ایا صوفیہ کی نذر کر دے گا۔

مناسب جگہ کا انتظام ہو گیا تو جسٹینین نے انتھیمیس[1] کو بُلایا، جو اپنے عہد میں فنِ تعمیر کا بہترین ماہر تھا۔ شہنشاہ کا فیصلہ یہ تھا کہ پوری عمارت پتھر اور سنگِ مرمر کی بنے اور بھاری ستونوں کے بغیر اتنی وسیع ہو کہ بڑے بڑے مصری مندروں کی طرح اس میں بہت سے لوگ سما سکیں۔ نیز اس کی چھت سپاٹ نہ ہو۔ مشرقی مسیحیوں کا فنِ تعمیر مذہب کے تابع رہا۔ انھوں نے جو گرجے بنانے شروع کیے، انھیں صلیب کی شکل دے دیتے، یعنی شش پہلو بناتے اور مرکزی قربانگاہ کی شان و شوکت کے شوق میں بیرونی وضع قطع کا کچھ خیال نہ کرتے۔ مغرب میں رومیوں نے بڑے بڑے ستون اور محرابیں بنانی شروع کیں۔ انھوں نے ابتدا میں جو گرجے بنائے، ان کی وضع قطع عدالتوں اور بنکوں کے ایوانوں کی سی تھی۔ اصل قربان گاہ کلیسا کے وسطی ایوان کے سرے پر رکھی جاتی اور اس کے ساتھ ستونوں کی قطاریں ہوتیں۔

---

[1] ANTHEMIUS

انتھیمیس نے نیا نقشہ تیار کیا اور یہ فیصلہ ہُوا کہ گرجے کی وضع قطع نہ تو مستطیل کی ہو اور نہ مربع کی۔ اس کے وسط میں ایک گنبد ہونا چاہیے، جو فرش سے ایک سو ساٹھ فٹ بلند ہو۔ یہ گنبد چار محرابوں کے سہارے استادہ ہو، جن میں دو اس طرح مخفی رکھی جائیں گی کہ گنبد دیکھنے میں معلق نظر آئے۔ چنانچہ عمارت کے لیے نیا مسالا تیار ہونے لگا۔ جسٹینین کو خرچ کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ گرجا ایسا بنے، جو یروشلم کے ہیکل سلیمانی کو بھی پیچھے چھوڑ جائے۔ اسے اسلحہ خانے کے انجینئروں نے بتایا کہ اینتھیمیس جو گنبد تیار کر رہا ہے، وہ قائم نہ رہے گا، گر جائے گا۔ ٹھیکیداروں نے بتایا کہ تھسلی سے سنگ مرمر، جزیروں سے سنگِ یشب اور سنگِ سلیمانی، مصر سے سنگِ سماق لانے اور صاف کرنے میں پانچ سال صرف ہو جائیں گے، لیکن جسٹینین نے سب پر واضح کر دیا کہ پانچ سال میں گرجا مکمل ہو جانا چاہیے۔ سمندر کے راستے چیزیں لانے میں بہت آسانی ہو گی۔ ایک سال کے اندر افریقہ کی تسخیر پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی اور سمندر کے تمام راستے کھُل جائیں گے۔

جون ۵۳۳ء کی ایک صبح کو اسقفِ اعظم اور شہنشاہ جلوس کی شکل میں اس بندرگاہ پر پہنچے، جو محل کے قریب واقع تھی۔ جلوس کے آگے مقدس بُت تھے، جنھیں ریحان کی شاخوں سے ہوا دی جا رہی تھی۔ سامنے ایا صوفیہ کے سنگین ستون بلند ہو رہے تھے۔ جو جنگی جہاز کنارے سے ملا کھڑا تھا، اسقف نے اسے برکت دی۔ لنگر اٹھائے گئے۔ بادبان کھول دیے گئے۔ سب سے اوپر کا بادبان قرمزی رنگ کا تھا۔ ساتھ ایک قندیل بندھی تھی۔ اس جنگی جہاز پر بیلی ساریوس، اس کے رفیق اور ملاح سوار تھے اور وہ اس بیڑے کو افریقہ لے جانے کے لیے مامور ہُوا تھا، جس میں افریقہ پر حملہ کرنے والی فوج سوار تھی۔ بندرگاہوں میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں بیڑے کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ جسٹینین انھیں رخصت کر کے واپس ہُوا تو اسے پُورا احساس تھا کہ فوج کافی نہیں۔ صرف دس ہزار جنگجو بھیجے گئے تھے۔ بار برداری کے لیے پانچ ہزار گھوڑے ساتھ کر دیے گئے تھے۔ اس فوج میں بیلی ساریوس کے خاص رفیق بھی شامل تھے، جن کی تعداد چار ہزار کے قریب تھی۔

بحیرۂ روم کو ایسے جہازوں کے ذریعے سے موسم گرما میں بہ آسانی عبور کیا جا سکتا تھا، یعنی مئی سے نومبر تک۔ پھر طوفان آنے شروع ہو جاتے تھے، ان میں جہاز ایک دوسرے سے الگ ہو کر بکھر جاتے۔ غیر مہذب قومیں رومی سلطنت پر قابض ہو چکی تھیں۔ وینڈال افریقہ میں، آسٹروگاتھ (مشرقی گاتھ) اٹلی میں،

وزی گاتھ (مغربی گاتھ) ہسپانیہ میں حکمران تھے۔ اکھڑ فرینکوں نے گال سے گزرتے ہوئے برگنڈیوں پر دھاوے شروع کر دیے تھے۔ یہ لوگ کھیتی باڑی میں خوب ماہر تھے اور ایک پیغام بھیج کر بڑی بڑی فوجیں جمع کر لیتے تھے۔ جسٹینین ایک مسیحی کی حیثیت میں سوچ رہا تھا کہ مقابلہ ضرور کرنا چاہیے، اگرچہ وہ لوگ شہنشاہ کی عزت کرتے تھے اور کبھی کبھی اس کی شکل بھی اپنے سکوں پر ضرب کرا لیتے تھے، لیکن یہ زبانی جمع خرچ جسٹینین کے نزدیک اطمینان بخش نہ تھا۔

جسٹینین کو یہ بھی اندازہ تھا کہ ان وحشی قوموں کا سیل رُک نہیں سکے گا۔ گاتھوں نے اٹلی میں رومیوں کے طور طریقے ایک حد تک اختیار کر لیے تھے، لیکن ان کے پیچھے جرمن، ہن، لمبارڈ وغیرہ موجود تھے۔ ایک ہٹتا تو دوسرا پہلے کی جگہ لے لیتا۔ بیلی ساریوس کو افریقہ بھیجا گیا تھا تو یہ مقصود نہ تھا کہ اس برِاعظم کو مسخّر کر لیا جائے، صرف یہ مقصود تھا کہ کسی مناسب قدمگاہ کا انتظام کر لیا جائے، جو مغربی علاقوں کی فتح و تسخیر میں سہولت کا باعث ہو۔ جسٹینین کو پورا بھروسا تھا کہ بیلی ساریوس یہ کام ضرور انجام دے سکے گا۔ اُدھر ونڈالوں کو خیال تک نہ تھا کہ رومیوں کا بیڑا یکایک آ پہنچے گا۔ ان کے جہاز بحری قزاقوں کے تعاقب میں اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ اس زرّیں موقع سے فائدہ اُٹھا کر بیلی ساریوس افریقہ پہنچ جانے کا امیدوار تھا۔

جسٹینین نے روانگی سے پیشتر بیلی ساریوس کو پورے اختیارات سونپتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ تمھارا ہر حکم میرا حکم سمجھا جائے گا۔ ساتھ ہی اپنے ایک لائق اور وفادار خواجہ سرا، سالومن[1] کو بھیج دیا تھا کیونکہ اندیشہ تھا، بیلی ساریوس افریقہ پہنچ کر خودسر نہ ہو جائے۔

بیڑے کی طرف سے ابتدائی خبریں چنداں خوشگوار نہ تھیں، تاہم راستے کی مشکلات کے باوجود بیلی ساریوس اپنے تمام جہازوں کے ساتھ سسلی پہنچ گیا اور وہاں کے مشہور آتش فشاں پہاڑ اٹنا[2] کے سامنے لنگر انداز ہُوا۔

بیلی ساریوس نے معمول کے مطابق فوج پر کڑی نگرانی قائم رکھی۔ اس کے پاس روپیہ کافی تھا اس لیے اس نے آدمی بھیج کر دیہات سے غلّہ منگوا لیا۔ دو آدمیوں نے شراب پی کر اپنے ایک رفیق کو

ETNA ۲ — SOLOMON ۱

قتل کر دیا۔ بیلی ساریوس نے دونوں کو فوجی کیمپ کے سامنے عبرتناک سزا دی۔ پھر فوج میں بیماری پھیل گئی۔ اور ارمنی دستے کا سالار اس کی بھینٹ چڑھ گیا۔ بیلی ساریوس کے لیے مایوسی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ونڈالوں کے بیڑے کے متعلق اسے کہیں سے کوئی اطلاع نہ مل سکی اور وہ ان کے طریق جنگ سے بھی بالکل ناواقف تھا۔ اس نے اپنے رفیق پروکوپیس[1] کو سائرا کیوز[2] بھیج دیا تاکہ جو خبریں مل سکیں فراہم کر لائے۔ وہاں اسے ایک غلام مل گیا جو صرف تین روز پیشتر قرطاجنہ[3] سے آیا تھا۔ پروکوپیس اسے ساتھ لایا۔ اس نے بتایا کہ ونڈالوں کو رومیوں کے حملے کے متعلق کوئی اطلاع نہیں۔ وہ خود اندرون ملک میں جھگڑ لگا رہے ہیں اور ان کا بیڑا کہیں اُدھر چلا گیا ہے۔

یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا جسٹینین نے بیلی ساریوس کی امداد کے لیے ایک خاص منصوبہ تیار کر لیا تھا، جس کے مطابق پورا کام ہو رہا تھا۔ جو راہب طرابلس سے قسطنطنیہ پہنچے تھے، انھیں واپس بھیجتے وقت کہہ دیا گیا تھا کہ رومی جہاز پیچھے روانہ ہوں گے۔ چنانچہ ایک جہاز میں ایک سو بیس[120] منتخب آدمی لیبیا کے ساحل پر جا پہنچے اور وہاں ان لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیا، جو رومیوں کے حامی تھے۔ ایک افواہ پھیلا دی گئی کہ سارڈینیا کے گورنر نے بغاوت کر دی ہے اور قسطنطنیہ سے امداد طلب کی گئی ہے۔ چنانچہ ونڈالوں کا بیڑا پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ سارڈینیا روانہ ہو گیا اور کچھ ونڈال لیبیا کی بدامنی فرو کرنے میں مصروف ہو گئے۔ بعض رومی کارندے تاجروں کا بھیس بدل کر قرطاجنہ پہنچ گئے اور وہاں کی مقامی آبادی کو چپکے چپکے آگاہ کر دیا کہ رومیوں کی فوجی قوت پہنچنے ہی والی ہے۔ اسی زمانے میں ایک خودسر ونڈال نے اپنے اصل حکمران کو، جو گیسرک کی نسل سے تھا، قید خانے میں ڈال دیا اور خود تمام اختیارات کا مالک بن گیا۔ رومی کارندوں نے یہ بھی بتایا کہ ہمیں ونڈالوں سے جنگ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم تو اس جابر کا تختہ اُلٹ کر جائز حکمراں کو برسرِ اقتدار لانا چاہتے ہیں۔ رومی فوج اس مقصد کے لیے مقامی لوگوں کی پوری امداد

---

[1] PROCOPIUS یہ فلسطین کا باشندہ تھا اور بیلی ساریوس کے ساتھ رہا۔ اس کی تمام لڑائیوں کی کیفیت، نیز اس کے عہد کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ [2] SYRACUSE سسلی کا مشہور مقام۔ [3] CARTHAGE تونسیہ کا مشہور قدیم شہر جسے فینیقیوں نے آباد کیا تھا۔ پھر روما سے ٹکر ہوئی تو یہ شہر اور اس کی عظمت برباد ہو گئی۔ ہینی بال اسی کا جرنیل تھا۔

کرے گی ۔

پروکوپیس کی کوشش سے جو اطلاعات فراہم ہوئی تھیں، ان کے متعلق اطمینان حاصل کرتے ہی بیلی ساریوس کے جہاز کیٹانہ[1] سے افریقہ کی طرف روانہ ہو گئے ۔ خوش قسمتی سے ہوا موافق تھی اور دوسرے ہی دن سمندر کا سفر طے ہو گیا ۔ ساحل پر پہنچتے ہی بیلی ساریوس کو کوئی خدشہ باقی نہ رہا ۔ اس نے مختلف دیہات سے گھوڑے خریدے ۔ لوٹ مار کی سخت ممانعت کر دی اور اعلان کر دیا کہ ہم بہ یک وقت دو دو دشمنوں سے نہیں لڑ سکتے ۔ اگر لوٹ مار کی گئی تو سب لوگ ونڈالوں کے ساتھ ہو جائیں گے ۔ یہاں اسے ایک اور ہمت افزا خبر ملی اور وہ یہ کہ جب ونڈالوں کو مشرق کی سمت سے حملے کا کوئی اندیشہ نہ رہا تو انھوں نے قرطاجنہ کے سوا تمام شہروں کی فصیلیں گرا دی تھیں ۔ چنانچہ بیلی ساریوس نے فیصلہ کر لیا کہ دشمن فوج کے جمع ہونے سے پیشتر قرطاجنہ کی شہر پناہ کے اندر پہنچ جانا چاہیے ۔

شہر سے دس میل کے فاصلے پر لڑائی ہوئی ۔ اگر متعدد غیر معمولی واقعات پیش نہ آجاتے تو اسی لڑائی میں بیلی ساریوس کی افریقی مہم کا خاتمہ ہو جاتا ۔ اس کے ساتھ ہنوں کے بے قاعدہ دستے بھی تھے جو ہر وقت غارت گری کے انتظار میں رہتے تھے ۔ ان کی نظریں ونڈالوں کے سنہری ساز و سامان اور اعلیٰ ہتھیاروں پر پڑیں تو تیروں کا مینہ برسانا شروع کر دیا ۔ ونڈال بھاگے تو ان کا سخت تعاقب کیا ۔ اُدھر ونڈالوں کی بڑی فوج نے رومی رسالے پر حملہ کر دیا ۔ اس وقت بیلی ساریوس کے ساتھ صرف ایک سو شمشیر زن تھے ۔ اُدھر ونڈالوں کا سردار سمجھ چکا تھا کہ لڑائی ختم ہو گئی ہے اور وہ اپنے مقتول ہم قوموں کی تدفین کا انتظام کر رہا تھا ۔ بیلی ساریوس نے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ اس پر حملہ کر دیا ۔ ونڈال سردار کو خیال ہوا کہ پیچھے بہت بڑی فوج آ رہی ہو گی ۔ چنانچہ وہ بھاگ نکلا اور بیلی ساریوس کامیاب ہو گیا ۔ قسطنطنیہ پیغام بھیج دیا گیا کہ قرطاجنہ پر رومیوں کا قبضہ ہو گیا ۔

---

[1] CATANA یہ سسلی کے مشرقی ساحل کی مشہور بندرگاہ ہے ۔ آج کل اسے کٹانیا کہتے ہیں ۔ جب عرب سسلی پر حکمران تھے تو اسے قطانیہ کہتے تھے ۔

ونڈال رومیوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ اپنے ہی ہاتھوں کچلے گئے۔ اب وہ گیسرک کے زمانے کے بے پناہ جنگجو نہیں رہے تھے۔ افریقہ کی دولت اور عیش رانیوں نے انھیں تن آسان بنا دیا تھا۔ انھیں جب شکست کے بعد ہوش آیا تو وہ قرطاجنہ کی فصیل سے گزر کر شہر میں نہ پہنچ سکتے تھے' جو اب بیلی ساریوس کے قبضے میں تھا۔ موسم سرما میں بیلی ساریوس نے ان کی لشکر گاہ پر شدید حملہ کیا اور ان کا سالار جنوبی پہاڑوں میں بھاگ گیا۔ یوں جنگ ختم ہو گئی۔ ایک پیشگوئی بھی عوام میں مشہور تھی' یعنی یہ کہ ونڈالوں کی حکومت صرف اس وقت تک رہے گی جب تک سمندر سے نئی فوج نہ آئے گی۔ بیلی ساریوس کی فوج آئی اور ان کی حکومت ختم ہو گئی۔

پروکوپیس لکھتا ہے:

"یہ ونڈال ہر روز حمّام پہنچ کر غسل کے عادی ہو چکے تھے۔ خشکی و تری کی بہترین اشیائے خوردنی ان کے دستر خوانوں پر موجود ہوتیں۔ وہ سنہری زیور اور ایرانی ریشم پہنتے۔ تھیٹروں اور گھڑ دوڑوں میں وقت صرف کرتے یا شکار کھیلتے رہتے۔ امراء اپنے باغوں میں پُر تکلف دعوتوں کا انتظام کرتے' جہاں رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتیں اور بھانڈ نقل اُتارتے۔ غرض وہ ہر اُس مصروفیت کے خواہاں رہتے' جو جنسی تحریک کا سر و سامان بہم پہنچاتی۔"

ونڈالوں کا بیڑا سارڈینیا سے لوٹا تو یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ ان کی بندرگاہوں پر رومی قابض ہیں۔ اس طرح بیلی ساریوس کو کار آمد جہاز بھی مل گئے۔ ونڈال حکمران خاندان کا بیش قیمت خزانہ ایک جہاز پر لد کر ہسپانیہ جا رہا تھا۔ راستے میں طوفان آ گیا تو جہاز پھر افریقی ساحل پر پناہ لینے کے لیے مجبور ہُوا۔ وہاں رومی سپاہی اس پر قابض ہو گئے۔

اب جسٹینین نے حکم دیا کہ سمندر میں جتنے جزیرے ہیں' ان پر قبضہ جما لیا جائے۔ چنانچہ بیلی ساریوس نے کارسیکا پر قبضہ کر لیا۔ سارڈینیا اور طرابلس پر رومی پرچم لہرانے لگا۔ جہاز رانی کا موسم آ گیا تو بیلی ساریوس نے بہ یک وقت خشکی اور تری کی مہموں کا انتظام کیا اور رومی فوجیں جبلِ طارق تک جا پہنچیں اور سارا بحیرۂ روم رومی سلطنت کے تسلط میں آ گیا۔

اب رومیوں نے پھر افریقہ میں پُرانے انتظامی حلقے تجویز کر لیے یعنی ٹریپولی ٹینیا طرابلس الغرب

یا لیبیا)، بائیزا لیسیم (مشرقی ٹیونس)، نیومیڈیا (مغربی ٹیونس اور مشرقی الجزائر)، ماری ٹانیا (مغربی الجزائر اور مراکش) اس اثناء میں قرطاجنہ سے یہ اطلاعات قسطنطنیہ پہنچیں کہ بیلی ساریوس شاہی محل میں مقیم ہوگیا اور اس نے خودمختار حکمران کی سی حیثیت اختیار کرلی۔ درباریوں نے اب یہ کہنا شروع کیا کہ بیلی ساریوس شہنشاہ سے آزاد ہوگیا ہے۔ آخر جسٹینین نے پیغام بھیجا کہ بیلی ساریوس گرفتار شدہ ونڈال بادشاہ کے ساتھ واپس آئے۔ چنانچہ وہ واپس آیا اور قسطنطنیہ میں اس موقع پر بڑے اہتمام سے فتح کا جشن منایا گیا۔

اس موقع پر جو جلوس نکلا، اس میں ونڈال حکمران اور شہزادے بھی شامل تھے، جنھیں زنجیریں پہنا رکھی تھیں۔ پیچھے ایک گاڑی تھی، جس میں نہایت قیمتی مال و متاع بھرا تھا۔ ایک گاڑی کے ساتھ ساتھ راہب ننگے پاؤں چل رہے تھے۔ اس میں ہیکل سلیمانی کے تبرکات رکھے تھے، جو یروشلم سے روم پہنچے تھے وہاں ونڈال لوٹ کر لے گئے تھے۔ مثلاً ہفت شاخہ شمعدان، نذر کی روٹیوں[1] کی میز، شہادت کا صندوق اور سرپوش[2]۔ یہ تبرکات یروشلم بھیج دیے گئے۔

اہلِ قسطنطنیہ نے جس گرم جوشی کے ساتھ بیلی ساریوس کا خیر مقدم کیا اس کو دیکھ کر جسٹینین کے دل میں حسد کی آگ مشتعل ہوگئی۔ یہاں یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ قسطنطنیہ کے باشندے ایک حد تک متصوفانہ طریق فکر و نظر اختیار کرچکے تھے۔ وہ سب تثلیث کے قائل تھے یعنی باپ، بیٹے اور رُوح القدس کا اتحاد۔ معمولی مزدور اور نانبائی سے بھی باتیں ہوتیں تو وہ یہی کہتا کہ تثلیث رُوح کی نجات کا ذریعہ ہے۔ ونڈال آریوسی عقیدے کے پابند تھے، لہٰذا اہلِ قسطنطنیہ انھیں کافر اور دشمن دین سمجھتے تھے۔

وہ کہتے، حواریوں نے مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔ پولوس رسول کے وقت سے بُت پرستی کے خلاف وعظ ہوتے رہے۔ پھر مسیحی کلیسا اسی طرح مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا، جس طرح دریا چھوٹی چھوٹی ندیوں میں منقسم ہوجاتا ہے۔ آریوس یہ تلقین کرتا تھا کہ مسیحؑ بہرحال انسان تھا، البتہ اسے نیکی کا غیر معمولی درجہ مل گیا تھا۔ اہل قسطنطنیہ کہتے کہ کیا ایک معمولی انسان، ایک نجار کا بیٹا انسانی نسل کی نجات کا دروازہ کھول سکتا ہے؟ اگر مریمؑ نے ایک معمولی بچہ جنا تو کیا اسے "خدا کی ماں" کہا جا سکتا ہے، جو وہ درحقیقت تھی

---

[1] SHEWBRPAD یہ بارہ روٹیاں تھیں جو صبح کو ہیکل سلیمانی میں رکھ دی جاتیں [2] SEAT OF MERCY
تفصیل کیلئے دیکھئے توریت کتاب خروج باب ۵ (۲) آیت ۱۱ باب ۳۰ آیت ۶ باب ۳۱ آیت ۷

یہ لوگ حقیقی عقیدہ چھوڑ کر ایک متصوّفانہ عقیدے کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ وہ صحرا گرد درویشوں سے برکات کے آرزومند رہتے۔ سینٹ جیروم کا احترام کرتے، جس نے اپنے حجرے میں ایک شیر کو پناہ دے دی تھی۔ ستونوں پر جا بیٹھنے والے راہب جو گرد و غبار نیچے گراتے، یہ لوگ اسے تبرکاً جمع کرتے رہتے۔ وہ نسطوریس کے خلاف سخت غیظ و غضب کا اظہار کرتے، جو قسطنطنیہ میں اسقفِ اعظم رہ چکا تھا اور کہا کرتا تھا کہ مسیحؑ میں انسانی اور الوہی دونوں فطرتیں جمع ہو گئی تھیں۔ زیادہ تر مشرقیوں کا عقیدہ یہی تھا۔ اہلِ شہر اسے وحدتِ فطرت کا عقیدہ کہتے تھے۔ مشرقیوں کا عقیدہ زمانۂ قدیم سے یہی تھا کہ خدا ایک ہے اور اس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں ہو سکتا۔

مسیحیت مشرقی سرزمینوں میں پیدا ہوئی۔ قسطنطنیہ پر انطاکیہ اور اسکندریہ کے کلیساؤں کو تقدّم حاصل تھا، جو وحدتِ[1] فطرت کے قائل تھے۔ پانچویں صدی مسیحی میں کلیسا کے جھگڑے حکومت کے قبضے سے باہر نکل گئے۔ عوام نے مخالف فرقوں کی ان خانقاہوں پر حملے کیے، جہاں کے عام مسلک کی پیروی نہیں ہوتی تھی۔ اسقفوں نے مخالفوں کو ملعون قرار دیا۔ افی سوس (۴۳۱ء) کی مجلس نے نسطوریس اور اس کے پیروؤں کو جلاوطن کر دیا۔ وہ لوگ الرّوحا[2] سے نکل کر ایران اور وہاں سے اور آگے مشرق کی طرف چلے گئے۔ کلیساؤں کی گرمی ہنگامہ سرد کرنے کے لیے مارسین نے کیلسی ڈون میں پیشوایانِ مذہب کی ایک مجلس منعقد کی (۴۵۱ء) جس نے عقیدۂ تثلیث اور مسیحؑ کی الوہیت کا فیصلہ صادر کیا۔ یہ فیصلہ پاپائے روم کی مرضی کے عین مطابق تھا، لیکن قدیم مشرقی کلیسا اس کے خلاف ہو گئے۔ قسطنطنیہ کے شہنشاہ مشرق و مغرب کے مذہبی احساسات کی متخالف لہروں میں پھنس گئے۔ انطاکیہ اور اسکندریہ نے ان پیشواؤں کا اختیار ہی تسلیم نہ کیا، جو پطرس رسول کے مقبرے کے مجاور تھے۔ تاریخی اعتبار سے مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے درمیان افتراق ۴۸۱ء میں ہوا، لیکن اصل میں افتراق پہلے سے چلا آتا تھا۔

مغرب میں آریوسی عقیدہ بڑے عجیب طریقے پر پھیلا۔ قسطنطنیہ کا ایک بشپ ان فوجوں کی تبلیغ کے لیے مقرر ہوا، جو وحشی اقوام سے لڑنے کے لیے بھیجی گئیں۔ بعد ازاں اس نے خود ان وحشیوں میں

---

[1] MONOPHYSITE DOCTRINE یہ لوگ کہتے تھے، حضرت مسیحؑ میں بشریت اور الوہیت مل کر ایک ہو گئیں۔

[2] EDESSA

تبلیغ شروع کردی۔ وہ آریوسی عقیدے کا تھا۔ اس طرح آسٹروگاتھ، وزی گاتھ، ونڈال اور دوسری اقوام آریوسی بن گئیں۔ جب انھیں اقتدار حاصل ہوا تو انھوں نے چند کلیساؤں کے سوا تثلیث کو ماننے والے تمام کلیسا بند کر دیے۔ بیلی ساریوس نے افریقہ کو فتح کیا تو تمام گرجے کھلوائے۔ جسٹینین مذہبی وحدت کے لیے کوشاں تھا اور اس سلسلے میں تمام جھگڑے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس نے مغربی پاپاؤں کی برتری تسلیم کی۔ وحدتِ فطرت کے لیڈروں کو سختیوں کا ہدف بنایا اور اختیار اپنے ہاتھ میں رکھا۔

دسواں باب

نظم و نسق میں اصلاحات

ایا صوفیہ کی تعمیر کا سلسلہ جاری تھا جب اس کے ستون ہپوڈروم سے اونچے اُٹھے تو وہ ملاحوں کو سمندر سے نظر آنے لگے۔ یکایک یہ اطلاع ملی کہ دو ستونوں میں عمودی شگاف پڑ گئے ہیں۔ انھیں کی محرابوں پر ایک سو بیس فٹ اونچا گنبد بننے والا تھا۔ جسٹینین نے تعمیر کے ذمہ داروں سے پوچھا کہ کیا یہ ستون محرابوں کا بوجھ سنبھال لیں گے؟ انھوں نے یقین دلا دیا کہ ضرور سنبھال لیں گے۔ جسٹینین نے حکم دے دیا کہ تعمیر جاری رکھی جائے۔ پھر دیکھا جائے، کیا ہوتا ہے۔ جب بیرونی سنگِ مرمر کی سِلوں سے ٹکڑے گرنے لگے تو فیصلہ کر لیا گیا کہ اس سنگِ مرمر کو اتار لیا جائے اور پوری عمارت مکمل ہو جانے کے بعد اسے پھر لگا دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ گنبد ہلکے پتھر کا بنایا گیا تاکہ محرابوں پر بوجھ کم رہے۔ شگافوں میں پگھلایا ہوا سیسہ بھر دیا گیا۔ چنانچہ یہ عمارت اب تک بدستور قائم ہے۔ ایا صوفیہ کے معماروں نے ایک نیا طرزِ تعمیر پیدا کر لیا تھا۔ جسٹینین ایا صوفیہ کے گرجے کی تعمیر میں عجلت سے کام لے رہا تھا۔ وہ اسے قسطنطنیہ کے پرانے گرجے سے بالکل مختلف رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ یہ گرجا وضع قطع میں سب گرجوں سے الگ تھلگ ہو اور تمام مسیحی گروہوں کا مرکزِ اجتماع بن جائے۔ طرزِ تعمیر کی تبدیلی اور بڑی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ رفتہ رفتہ رومی روایات ختم ہو گئیں۔ لاطینی بول چال کا رواج کم ہو گیا اور یونانی ثقافت کو فروغ حاصل ہوا۔ اب حکمرانی کے مشرقی طور طریقے زندہ کیے گئے۔ گویا قسطنطنیہ نیا رومہ نہ رہا بلکہ نیا قسطنطنیہ بن گیا۔

جسٹینین ۵۳۴ء ۔۔۔ ۵۳۵ء میں ایوانِ عمائدہ کی مداخلت سے آزاد ہو چکا تھا، لہٰذا اس نے نظامِ حکومت کی اصلاح شروع کر دی۔ اس نے شہریوں کے لیے مجسٹریٹ مقرر کر دیے اور حکم دے دیا کہ باہر سے آنے والے لوگوں کا سیل روکا جائے، جن کی وجہ سے مفصلات کی آبادی کم ہو رہی تھی اور شہر کی آبادی بڑھ رہی تھی۔ عام دستور چلا آ رہا تھا کہ دولتمند لوگ بڑی بڑی رقمیں دے کر عہدے خرید لیتے۔ پھر ان عہدوں سے وسیع مالی فائدے اُٹھاتے۔ جسٹینین نے عہدوں کی خرید و فروخت ممنوع قرار دے دی۔ اُس نے اپنے ایک فرمان میں کہا:

"ہم رات دن ان تدبیروں پر غور کرتے رہتے ہیں، جو خدا کے فضل سے ہمارے عوام کے لیے مفید ہوں۔ ہماری یہ جدوجہد بے سود نہیں رہتی۔ ان سے ہمارے عوام کی تشویش ختم ہو جائے گی۔ ہم ایسے ذرائع سوچتے ہیں کہ ہمارے عوام اصل ٹیکس کے سوا تمام واجبات سے آزاد ہو جائیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بعض اوقات سخت بے انصافیاں ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے ہماری رعایا قلاّش ہو گئی ہے، یہاں تک کہ جائز محاصل بھی ادا نہیں کر سکتی۔ سابق شہنشاہ مختلف عہدے لوگوں کے ہاتھ فروخت کر کے خود فائدہ اُٹھاتے تھے اور عہدہ دار عوام سے روپیہ وصول کر لیتے تھے۔ ہر فرد جانتا ہے کہ سرکاری افسر نہ صرف عہدوں کے لیے قیمت ادا کرنے بلکہ مزید روپے ادا کرنے کا حلف اٹھا لیتے تھے جو شخص روپے دے کر عہدے لیتا ہے، اسے قرض کے ساتھ سُود بھی ادا کرنا ہوتا ہے اور وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد اچھی خاصی رقم بچا لے۔ اس طرح وہ عوام سے تگنی رقم وصول کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے سرکاری خزانے کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ حاکم، مالک اور کسان صوبوں سے نکل کر شہر میں پہنچ رہے ہیں تاکہ ان کے خلاف استحصال کا جو سلسلہ جاری ہے، اس کے لیے چارہ جوئی کریں۔ گورنروں کو علم ہے کہ قزاق لوٹ مار کرتے ہیں، لیکن ایک خاص رقم دے کر وہ باز پُرس سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ گورنروں نے استحصال کا یہ سلسلہ کہاں تک پھیلا دیا ہے۔ کوئی شخص ان کے خلاف شہادت دینے کی جرأت نہیں کرتا۔"

جسٹینین نے بار بار عوام سے اپیلیں کیں اور کہا کہ اگر سرکاری افسر صاف نیّت سے کام کریں تو حکومت اور شہریوں کو یکساں فائدہ پہنچے۔ اس نے ابتدا میں رشوت خور افسروں کے خلاف بڑے سخت قوانین جاری کیے۔ مثلاً:۔

۱۔ کوئی شخص عہدے کے لیے کسی کو کچھ نہ دے۔

۲۔ گورنر کو چاہیے کہ اپنے علاقے کے تمام شہروں اور قصبوں میں خود جائے، نائبوں کو

نہ بھیجے۔

۳۔ ہر افسر عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد پچاس روز تک وہیں رہے تاکہ اس سے حساب کتاب لیا جا سکے اور اس کے خلاف شکایات کی سماعت ہو سکے۔

۴۔ مذہبی پیشوا اور مقامی مجلسیں سرمایۂ عامہ کے ذمّہ دار ہوں گے۔

ساتھ ہی اس نے سرکاری ملازمین میں تخفیف کر دی اور ملازمت میں درجے کی برتری کا وہ قاعدہ منسوخ کر دیا جس سے صرف پُرانے باشندے فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ پروکوپیس لکھتا ہے کہ جسٹینین تمام مروّجہ اداروں کو بدل کر دوسری ہی شکل دے دینا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش یہ تھی کہ ہر چیز نئی ہو اور اس پر خود اس کے نام کی چھاپ لگی ہوئی ہو۔ ایک فرمان کے الفاظ یہ ہیں: "کسی بُرائی کو دُور کرنے کے لیے قانون بنانے کی حیثیت بیمار کو دوا دینے کی ہے، یعنی یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اس کا اثر کیا ہو گا۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نہ صرف سابقہ شہنشاہوں کے فرامین بلکہ اپنے فرامین بھی حسبِ ضرورت بدلتے رہیں۔ فطرت مسلسل معرضِ تغیّر میں ہے۔ جب تک سلسلۂ تغیّر جاری ہے، ہم بھی نئے قاعدے بناتے رہیں گے۔"

اس نے اپیلوں کی سماعت کے لیے خاص عدالتیں مقرّر کر دیں، جو دیہات میں دورہ کر کے زیادہ سے زیادہ پچاس روز کے اندر اندر ہر مقدّمے کا آخری فیصلہ سُنا دیتیں۔ مجسٹریٹوں سے یہ حلف لیا جاتا:

"میں خدائے برتر و توانا اور مقدّس میکائیل و جبریل کی قسم ان چار انجیلوں پر کھاتا ہوں، جو میرے ہاتھ میں ہیں کہ میں اپنے آقاؤں جسٹینین اور اس کی ملکہ تھیوڈورا کی خدمت وفادارانہ انجام دوں گا۔ مَیں قسم کھاتا ہوں کہ عہدے کے حصُول و تحفّظ کے لیے نہ کسی کو کچھ دیا ہے اور نہ آیندہ دوں گا۔ مَیں قسم کھاتا ہوں کہ تنخواہ کے سوا نہ کچھ لوں گا اور نہ عہدے سے کوئی اَور فائدہ اٹھاؤں گا۔ اپنے نیک دل آقاؤں کی ساری رعایا کے حقوق کی حفاظت کروں گا۔ اگر یہ حلف پُورا نہ کر سکا تو مَیں اپنے آپ کو نجات دہندہ یسوع مسیحؑ کے خوفناک فیصلے کا مستوجب سمجھوں گا۔ مجھے یہودا اسکریوتی کی بدانجامی، جیزی کا برص اور قائن کی لعنت نصیب ہو۔"

۵۳۵ء کے موسمِ گرما میں جسٹینین نے بلی ساریوس کو دوبارہ سسلی روانہ کر دیا، لیکن اس

سفر کی منزلِ مقصود پر اخفاء کا پردہ ڈالے رکھا۔ عام لوگ سمجھتے تھے کہ ونڈالوں کا فاتح پھر افریقہ گیا ہے۔ جسٹینین اور اس کے وزیروں کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ چپ چاپ سسلی چلا جائے اور جزیرے کو گاتھوں سے چھین کر خود اس پر قابض ہو جائے۔

اس مرتبہ بیلی ساریوس کے لیے تمام انتظامات خاص احتیاط سے کیے گئے۔ جہاز ایسے تھے جو طوفانی سمندروں میں بھی بہ خوبی سفر کر سکتے تھے۔ فوجی افسر ایسے چُنے گئے، جن کی وفاداری اور صلاحیت مسلّم تھی۔ آٹھ ہزار فوج تھی، جس پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ باقاعدہ رسالہ ہمراہ تھا۔ ہنوں اور موروں کے دستوں کی تعداد کم تھی۔ اس مرتبہ بھی بیلی ساریوس کو پہلے کی طرح پورے اختیارات دے دیے گئے اور اسے تاکید کر دی گئی تھی کہ سسلی پہنچ کر جہاں پہلے لنگر انداز ہوئے تھے، وہیں اس مرتبہ جا ٹھہرنا اور طور طریقے ایسے رکھنا گویا تم اتفاقیہ جا ٹھہرے ہو۔ گاتھوں کو احساس تک نہ ہونا چاہیے کہ مقصود جزیرے پر قابض ہونا ہے۔ اگر بہ آسانی تصرّف کی صورت نکل آئے تو وہیں رہنا، ورنہ لنگر اٹھا کر افریقہ چلے جانا۔

بیلی ساریوس پہلے کی طرح کٹانا میں لنگر انداز ہُوا۔ اس نے سپاہیوں کے چھوٹے چھوٹے دستے اطراف میں بھیج دیے۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا تھا کہ وہ سیّاحوں کی حیثیت سے مختلف مقامات کا معائنہ کر رہے ہیں۔ یکایک انھوں نے گاتھوں کی چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ سائراکیوز بھی لے لیا، البتہ پینارمس[1] میں تھوڑی سی کشمکش ہوئی، کیونکہ یہ جزیرے کا مستحکم مقام تھا اور اس کے ارد گرد فصیل تھی۔ بیلی ساریوس کے تیر اندازوں نے گاتھوں کو تھوڑی ہی دیر میں مغلوب کر لیا اور پینارمس بھی قبضے میں آ گیا۔ پروکوپیس نے لکھا ہے کہ بیلی ساریوس شہر میں داخل ہُوا تو اس نے باشندوں پر سُنہری سکّے برسائے۔

اٹلی رومیوں کی آبائی سلطنت کا قلب تھا، جس پر آسٹرو گاتھ قابض تھے۔ ۴۸۷ء میں یہ گاتھ جنگجو قسطنطنیہ کے حوالی میں پہنچ چکے تھے۔ اُس وقت اریاڈنی[2] ملکہ تھی۔ اس نے آسٹرو گاتھوں کے

---

[1] PANORMUS یہ وہی مقام ہے، جسے آج کل پلرمو (PALERMO) کہتے ہیں اور حکومتِ سسلی کا مرکز ہے۔ [2] ARIADNI یہ لیو اوّل شہنشاہ قسطنطنیہ کی بیٹی تھی۔ اس کی شادی پہلے زینو سے ہوئی، جو ۴۷۴ء سے ۴۹۱ء تک بادشاہ رہا، پھر اس نے اناستاسیوس سے شادی کر لی، جو زینو کے بعد شہنشاہ بن گیا تھا۔

سردار تھیوڈورک[1] کو ترغیب دی کہ جاہ و مال کی خواہش ہے تو مغربی جانب پیشقدمی کرو اور اٹلی کو اوڈوآسر[2] کے قبضے سے نکالو۔ تھیوڈورک اُدھر پلٹ گیا اور اس نے اٹلی پر قبضہ کر لیا۔ وہاں شاہانہ حیثیت اختیار کر لی، لیکن اٹلی کا انتظام بڑے اچھے طریقے پر کیا اور سب سے اس کا برتاؤ روادارانہ تھا۔ وہ بہ ظاہر مشرقی شہنشاہوں کا وفادار تھا۔ حق یہ ہے کہ کسی شہنشاہ کو اس کے چالیس ہزار شمشیر زنوں سے مقابلے کی جرأت نہ تھی۔

اُس زمانے میں علم و فضل اور عزّت و احترام کے لحاظ سے دو آدمیوں کو ممتاز ترین حیثیت حاصل تھی، ایک بیتھیوس[3]، دوسرا سمیکس[4]۔ تھیوڈورک نے ابتدا میں ان سے اچھا برتاؤ کیا۔ پھر بیتھیوس کے خلاف غدّاری کا الزام لگا اور تھیوڈورک نے اسے قید میں ڈال دیا۔ قید ہی میں اس نے فلسفے کے متعلق وہ کتاب لکھی، جس کی بنا پر اس کی شہرت آج تک قائم ہے۔ تھیوڈورک نے ایک فرمانِ خاص کے ذریعے سے بیتھیوس کے ساتھ ربط و تعلّق کی ممانعت کر دی۔ ایوانِ عمائد کے ارکان میں سے صرف ایک شخص اس فرمان کے خلاف لب کشا ہُوا اور وہ سمیکس تھا، جس کا پردادا رومہ کے نہایت عظیم المنزلت افراد میں سے تھا۔ تھیوڈورک نے بیتھیوس اور سمیکس دونوں کو ۵۲۵ء میں موت کی سزا دے دی۔ ایک سال بعد خود بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔

وہ مذہباً آریوسی تھا۔ جسٹینین کی رائے تھی کہ آریوسیوں کو ختم کر دینا چاہیئے تاکہ رومی کلیسا کا تفرقہ باقی نہ رہے۔ چنانچہ اس نے پوپ کو سمندر کے راستے قسطنطنیہ بُلایا اور اس کے ساتھ مشورہ کے بعد گاتھوں سے نجات حاصل کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ اس کے لیے بڑی جنگی قوّت درکار تھی، جو نظر نہیں آتی تھی۔ جسٹینین نے فیصلہ کیا کہ سیاسی چالوں سے گاتھوں کو مات دی جائے۔ اس مقصد کے لیے چند افراد چُن لیے گئے۔

ڈینیوب کے محاذ پر جرمانوس نے قرب و جوار کے وحشیوں کے ہنگامے فرو کر کے اپنی فوج اٹلی کی جنگ کے لیے بھیج دی۔ بیلی ساریوس سسلی پر قابض ہو چکا تھا۔ جسٹینین نے منڈس کو حکم دیا کہ دریائے ڈینیوب سے مغرب کی جانب بڑھے۔ چنانچہ وہ پیش قدمی کرتا ہُوا ڈلمیشیا کے ساحل پر اُس جگہ پہنچ گیا،

---

[1] THEODORIC یہ آسٹرو گاتھوں کا سردار تھا اور اٹلی کا بادشاہ بن گیا۔ اگست ۵۲۶ء میں وفات پائی۔

[2] ODOVACER یہ پہلا بربری سردار تھا، جو اٹلی پر قابض ہُوا۔ [3] BOETHIUS [4] SYMMACHUS

جہاں کسی زمانے میں ڈایوکلیشن نے محل تعمیر کیا تھا۔

اس اثنا میں سیاسی چالیں بھی شروع ہو گئیں۔ ایک آدمی کو گال کے فرنگی (فرینک) سرداروں کے پاس بھیج دیا گیا تھا تاکہ گالوں کو شمالی و مشرقی جانب سے گاتھوں پر حملے کے لیے ابھارا جائے۔ چنانچہ سفیر نے فرینک سرداروں سے کہا: ہمارا اور آپ کا مذہب ایک ہے۔ یہ ہماری مشترکہ جنگ ہے۔ گاتھ آریوسی مسلک پر قائم ہیں ہمیں چاہیئے کہ انھیں اٹلی سے نکال دیں۔ اس کے علاوہ جسٹینین کے سفیروں نے انھیں زر و جواہر کی رشوت بھی دی اور فرینک بھی لڑنے پر تیار ہو گئے۔ اب گاتھوں کی آنکھیں کھلیں اور انھیں نظر آیا کہ بہ یک وقت تین طرف سے ان پر حملہ ہو رہا تھا۔ شمال اور مشرق کی طرف سے فرینکوں کا۔ جنوبی سمت سے بیلی ساریوس کا اور مغربی جانب سے منڈس کا۔

جسٹینین نے کمال یہ کیا کہ پیٹر نامی اپنا ایک خاص آدمی خود شاہ گاتھ کے پاس بھیج دیا۔ یہ شخص بڑا قابل اور چرب زبان تھا۔ گوناگوں ہتھکنڈوں میں ماہر تھا۔ سخت نازک حالات میں بھی اس پر کبھی گھبراہٹ طاری نہ ہوتی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کوئی اسے خرید نہیں سکتا تھا۔ اس کا فرض یہ قرار دیا گیا تھا کہ موقع بہ موقع شاہ گاتھ کو جتاتا رہے، کہ اگر شہنشاہ قسطنطنیہ سے مصالحت نہ کی گئی تو خوفناک جنگ شروع ہو جائے گی۔

تھیوڈورک کے صرف ایک بیٹی تھی، امالاسنتھا[1]۔ اس میں قوم کے جنگی جوہر موجود تھے لیکن گاتھ ایک عورت کو حکمران ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ مجبوراً[3] امالاسنتھا نے اپنے خاندان میں تھیوڈاہڈ[2] سے شادی کر لی۔ وہ کتاب کا کیڑا تھا۔ امالاسنتھا اور تھیوڈاہڈ کی طبیعتوں میں کوئی بھی مناسبت نہ تھی۔ احمق شوہر نے جوش کی حالت میں بیوی کو قتل کرا دیا، جب وہ ایک جھیل میں نہا رہی تھی اور تنہا حکومت کرنے لگا۔ گاتھوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ جس بیوی کی بدولت اسے تخت ملا تھا اور جو ان کے محبوب سردار کی بیٹی تھی، اسے قتل کرایا گیا تھا۔ اس وجہ سے وہ تھیوڈاہڈ کے دشمن بن گئے تھے اور اسے ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا کہ گاتھ موقع پاتے ہی مار ڈالیں گے۔ جسٹینین کے کارندے نے اس

---

[1] AMALASUNTHA [2] THEODAHAD [3] مصنف نے حالات اتنے مختصر کر دیے ہیں کہ صحیح نقشہ سامنے نہیں آتا۔ واقعات یوں ہیں: امالاسنتھا کی پہلی شادی یوتھارک EUTHARIC سے

واقعے سے بھی اپنے مقاصد کی تکمیل کا کام لیا۔

گاتھوں کے یہ داخلی جھگڑے جسٹینین کے منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے بالخصوص سازگار تھے۔ آخر تھیوڈاہڈ اس بات پر آمادہ ہوگیا کہ جسٹینین کا باج گزار بن جائے اور تین ہزار گاتھ جنگجو شہنشاہ کی خدمت کے لیے روانہ کر دے۔ چنانچہ جسٹینین کو ان حالات کی اطلاع دے دی گئی۔ وہ بے حد خوش ہُوا اور تمام شرطیں ماننے کے لیے تیار ہوگیا، لیکن یکایک صورتِ حال منقلب ہوگئی۔ جس پوپ کے مشورے سے منصوبہ تیار ہُوا تھا، وہ مرگیا۔ ڈلمیشیا میں گاتھوں کا ایک لشکر نمودار ہُوا۔ منڈس سے لڑائی ہوئی، جس میں اس کا بیٹا مارا گیا۔ منڈس پر ایسا جنون طاری ہُوا کہ وہ گھمسان کے رن میں گھُسا اور دشمن کی تلواروں نے اس کے پرخچے اڑا دیے۔ رومیوں کو فتح تو حاصل ہوئی، لیکن بہت کم آدمی بچے اور وہ ساحل سے مراجعت پر مجبور ہوگئے۔ جسٹینین نے نئی فوج سمندر کے راستے ڈلمیشیا بھیجی۔ اس اثنا میں بیلی ساریوس کو اطلاع ملی کہ افریقہ میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے اور منتشر رومی فوج قرطاجنہ میں محصور ہے۔ سالومن بہ مشکل جان بچا کر یہ خبر پہنچانے سسلی آیا تھا۔ بیلی ساریوس کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ سب کو چھوڑ کر افریقہ پہنچے۔ چنانچہ وہ تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ اُدھر روانہ ہوگیا۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷۷

ہوئی تھی، جو تھیوڈورک کے خاندان سے تھا۔ وہ جلد فوت ہوگیا۔ صرف ایک بچہ چھوڑا، جس کا نام اتھالرک ATHALARIC تھا۔ وہ دس سال کا تھا اور اَمالاسنتھا کو اس کی نگران اور نائب السلطنت بنا دیا گیا۔ اَمالاسنتھا نے بڑے اہتمام سے بیٹے کی تربیت کی۔ وہ عیش و عشرت کی طرف مائل تھا۔ ایک موقعے پر بڑے بڑے گاتھ سردار جمع تھے تو اتھالرک روتا ہُوا ان کے پاس پہنچ گیا کہ ماں نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔ گاتھ سردار اتنے بگڑے کہ اَمالاسنتھا کو تربیت میں ہر سختی سے روک دیا۔ اتھالرک عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اَمالاسنتھا کو اتنا غصہ آیا کہ خفیہ خفیہ جسٹینین سے سازباز شروع کر دی تاکہ پھر پورے اختیارات اس کے قبضے میں آ جائیں اور وہ بیٹے کی تربیت صحیح اصول پر کر سکے۔ اس اثنا میں اتھالرک مر گیا۔ صرف سولہ سال کی عمر تھی۔ اب اَمالاسنتھا کو تھیوڈورک کے ایک بھانجے سے شادی کرنی پڑی، جس کا نام گبن نے تھیوڈیٹس THEODATUS اور تھیاڈ لکھا ہے۔ مصنف نے تھیوڈاہڈ لکھا ہے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو گبن کی تاریخ "زوال و انحطاطِ سلطنت روما" باب ۴۱۔ یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ تھیوڈورک کی دو بیٹیاں تھیں۔ جن میں سے بڑی کی شادی ہسپانیہ کے وزیگاتھ بادشاہ سے ہوئی تھی۔ اس کا بیٹا امالرک تھا، جو ہسپانیہ کا بادشاہ بنا۔

ہُوا یہ کہ رومیوں کو افریقہ میں بے اندازہ دولت مل گئی تو انھوں نے ونڈال عورتوں سے شادیاں کرلیں اور عیش و راحت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ یہ عورتیں جائدادوں اور مکانوں کی مالک تھیں، لہٰذا ان سے شادیاں رومی سپاہیوں کے لیے مالی بوجھ ہونے کے بجاے مزید تن آسانی کا ذریعہ بن گئیں۔ ادھر قسطنطنیہ سے سپاہیوں کی تنخواہیں نہ پہنچیں بلکہ حکم آگیا، تمام جاگیریں حکومت کے حوالے کی جائیں۔ پادریوں نے آریوسی گرجے بند کردیے اور ونڈال عورتوں کو مذہبی حقوق سے محروم قرار دے دیا گویا رومی سپاہیوں کی عیش و راحت کا ذریعہ بھی گیا اور ان کی بیویاں بھی چھن گئیں۔ سپاہی یہ احکام ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے اور انھوں نے اپنی جمہوری حکومت بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ ونڈالوں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھایا اور جگہ جگہ بدامنی پھیلادی۔

بیلی ساریوس افریقہ پہنچا تو اس نے محصُور سپاہیوں کی ڈھارس بندھائی۔ اس نے خاص لباس پہن کر سڑکوں پر گشت کرنا شروع کیا تاکہ اس کی واپسی کی خبر ہر جگہ پہنچ جائے۔ ونڈالوں نے مناسب سمجھا کہ اس سے مل جائیں، شاید اس طرح انھیں زیادہ فائدہ پہنچے۔ آخر کار بیلی ساریوس نے تھوڑے سے سپاہی جمع کرکے اپنی باغی فوج پر حملے کا اعلان کردیا۔ اس کی تدبیر کارگر ہوئی اور باغی فوج محاصرہ چھوڑ کر ہٹ گئی۔ پھر اس نے باغی افسروں کو اپنے خیمے میں بُلایا۔ ایک سکّہ انھیں دکھایا، جس پر جسٹینین کی شکل بنی ہوئی تھی اور کہا کہ تم نے اس آقا کے خلاف بغاوت کی، جو تمھیں تنخواہ دیتا ہے اور جس نے تم پر بھروسا کیا؟ افسروں نے جواب دیا کہ ہمیں کوئی تنخواہ نہیں ملی۔ بہرحال بغاوت ختم ہوگئی۔ بیلی ساریوس مزید انتظامات کرنے نہیں پایا تھا کہ قسطنطنیہ سے نئی فوج جرمانوس کی سرکردگی میں آپہنچی، جو جسٹینین کا خالہ زاد بھائی تھا اور بیلی ساریوس کو حکم مل گیا کہ فوراً سسلی جائے اور وہاں سے روما پر قبضے کے لیے قدم اُٹھائے۔

ابھی اندرونِ ملک کی بدامنی پوری طرح فرو نہ ہوسکی تھی، لیکن جرمانوس نے آتے ہی اعلان کردیا کہ مَیں سزا دینے کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی شکایتوں کا ازالہ کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اس نے فوج کی پچھلی تنخواہیں ادا کردیں اور اسی کی مدد سے افریقہ میں امن بحال کردیا۔

گیارھواں باب

جسٹینین کا مجموعہ قوانین

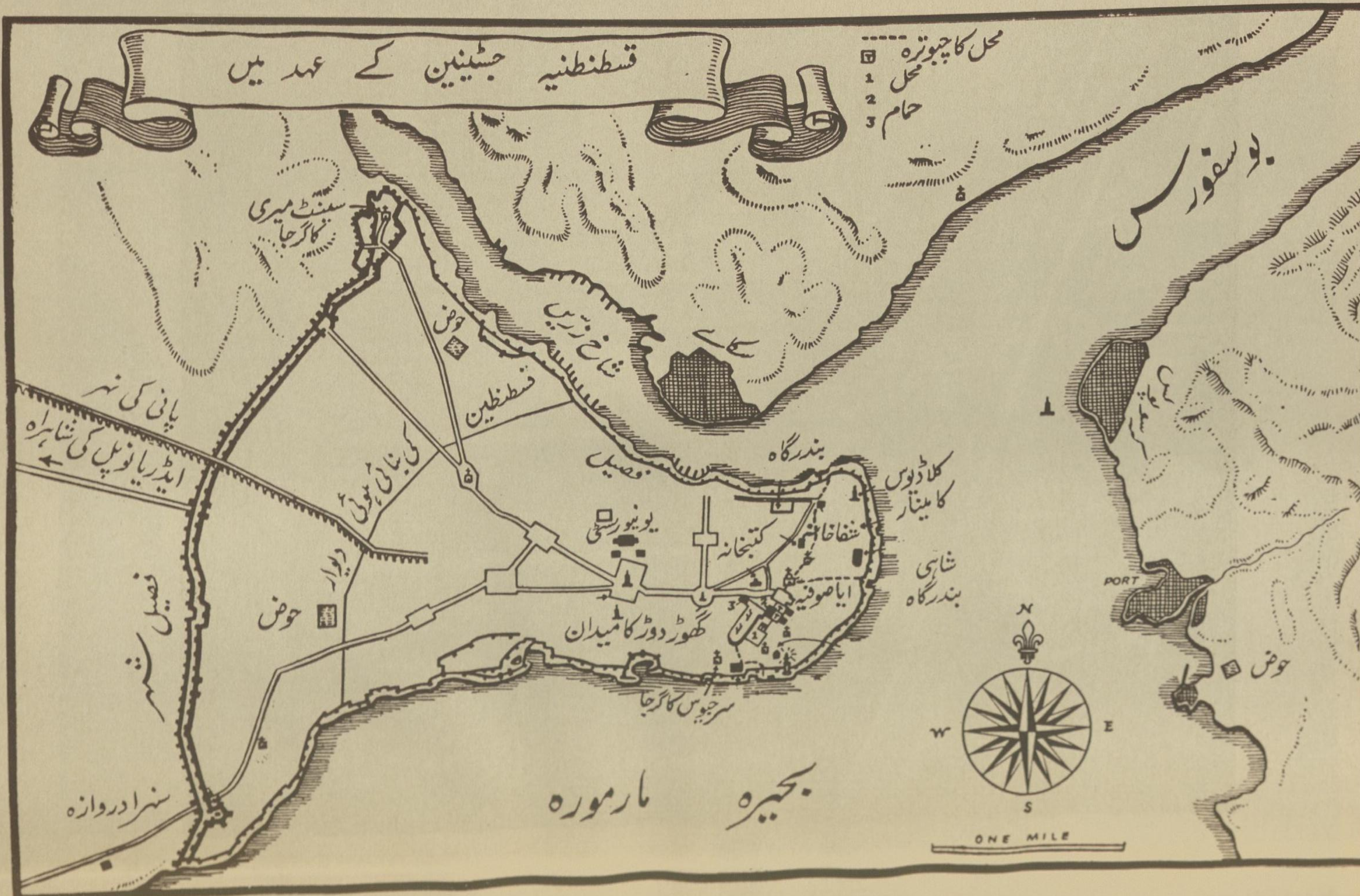
جسٹینین کی سیاسی چالیں ناکام ہو چکی تھیں۔ رومیوں پر ڈلمیشیا اور افریقہ میں آفتیں نازل ہوئیں تو اٹلی میں گاتھوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ ان کے نالائق بادشاہ نے خفیہ خفیہ جو عہد جسٹینین سے کیا تھا، اس سے وہ پھر گیا اور اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ تلوار کے زور سے فیصلے کی کوشش کی جائے۔ اس اثناء میں شاہ گاتھ نے پیٹر کو قید کر دیا۔ اس نے کسی ذریعے سے جسٹینین تک پیغام پہنچا دیا کہ حملہ کرنا ہے تو ابھی کیجیے کیونکہ گاتھوں کی قیادت دم توڑ رہی ہے۔ اس اوندھی کھوپری والے تھیوڈاہڈ کی قیادت گاتھوں کی قوت کے لیے زنجیر پا ہے۔ جب تک یہ باقی ہے، بہت کچھ کر لینا ممکن ہے۔"
چنانچہ سنہ ۵۳۶ء کے موسم گرما میں بیلی ساریوس کو فتح حاصل کرنے کا حکم مل گیا، جو بہ ظاہر ناممکن نظر آتی تھی۔ بیلی ساریوس کی غیر حاضری میں اس کی بیوی اینٹونینا کے آزادانہ طرز عمل نے اس کی فوج کے افسروں میں بددلی پھیلا دی تھی جو ایک عیش پرست عورت کا تسلط گوارا نہ کر سکتے تھے۔

بیلی ساریوس کے وسائل بہت کم تھے، تاہم اس نے انھیں سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ غلہ خرید کر جہازوں میں بھرا۔ صرف تھوڑی سی فوج سسلی میں چھوڑی اور آبنائے میسینا[1] کے خطرناک راستے سے گزرتا ہوا جنوبی اٹلی میں جا اترا۔ جنوبی ساحل کے گاتھ کماندار کو بڑے عہدے اور انعام کا لالچ دے کر ساتھ ملا لیا اور صرف چھ ہزار فوج کے ہمراہ شمالی جانب پیشقدمی شروع کر دی۔ بیڑا ساتھ ساتھ اوپر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب ڈلمیشیا میں نہ کوئی فوج موجود تھی، نہ منڈس جیسا کوئی سالار تھا جو گاتھوں کو اپنی قوت دو حصوں میں بانٹنے پر مجبور کر لیتا۔

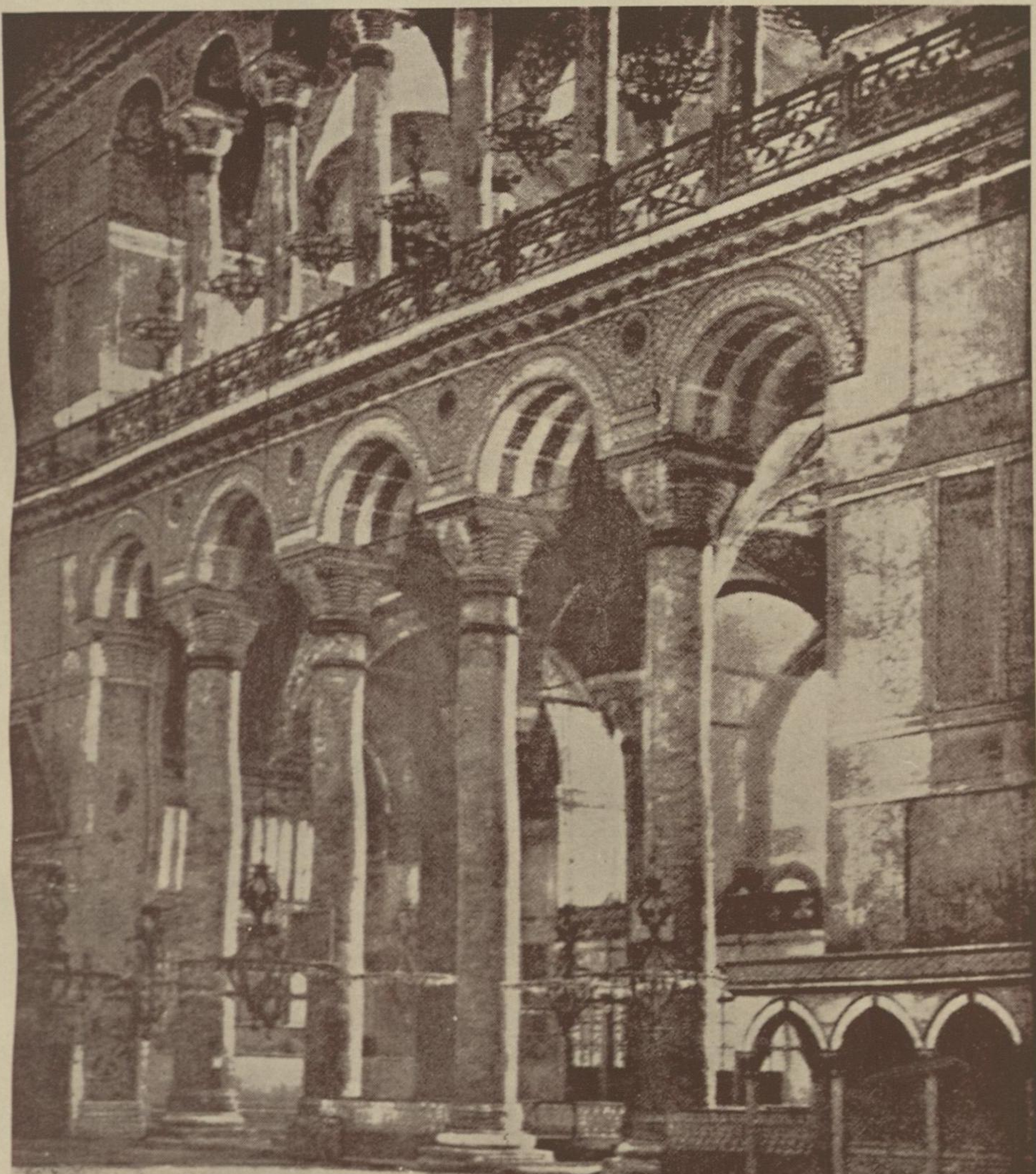
نیپلز[2] میں بیلی ساریوس کو رکنا پڑا۔ یہ نیا شہر تھا۔ یہاں زیادہ تر شامی اور یہودی تاجر آباد تھے۔

---

[1] MESSINA یہ آبنائے سسلی اور اٹلی کے درمیان ہے۔ [2] NAPLES جنوبی اٹلی کے مغربی ساحل کی مشہور بندرگاہ۔ اس کا اصل نام نیوپولس NEOPOLIS یعنی نیا شہر تھا۔



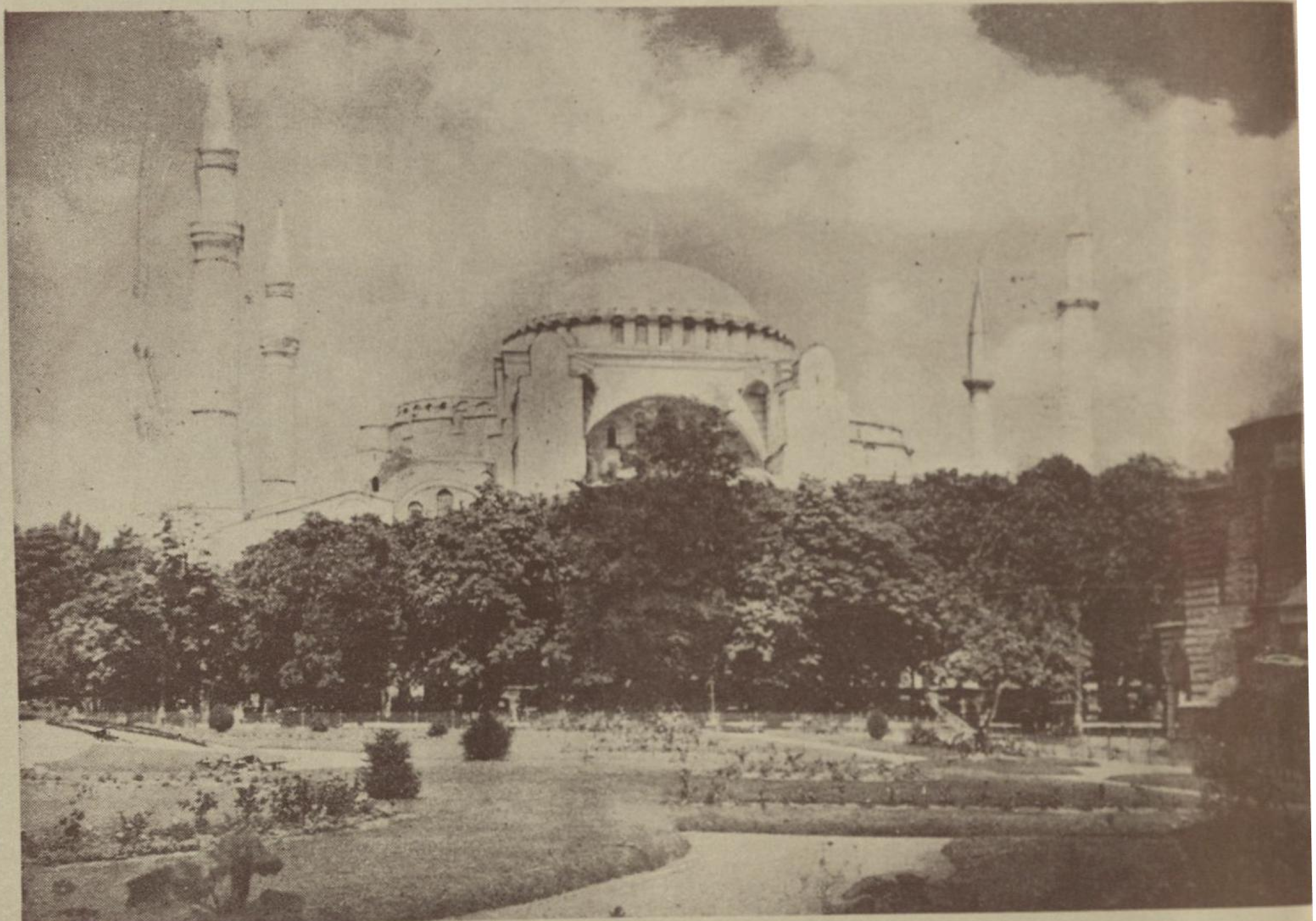
قسطنطنیہ جسٹینین کے عہد میں
محل کا چبوترہ
1 محل
2 حمام
3
بوسفورس
سینٹ میری کا گرجا
شاخ زریں
حوض
قسطنطین
پانی کی نہر
ایڈریانوپل کی شاہراہ
بندرگاہ
فصیل
کلاڈوس کا مینار
یونیورسٹی
کتبخانہ
شفاخانہ
شاہی بندرگاہ
ایا صوفیہ
گھوڑ دوڑ کا میدان
سرجیوس کا گرجا
حوض
فصیل شہر
سنہرا دروازہ
بحیرہ مارمورہ
PORT
N
S
E
W
ONE MILE



ایاصوفیہ کا ایک اندرونی منظر

عجائب خا

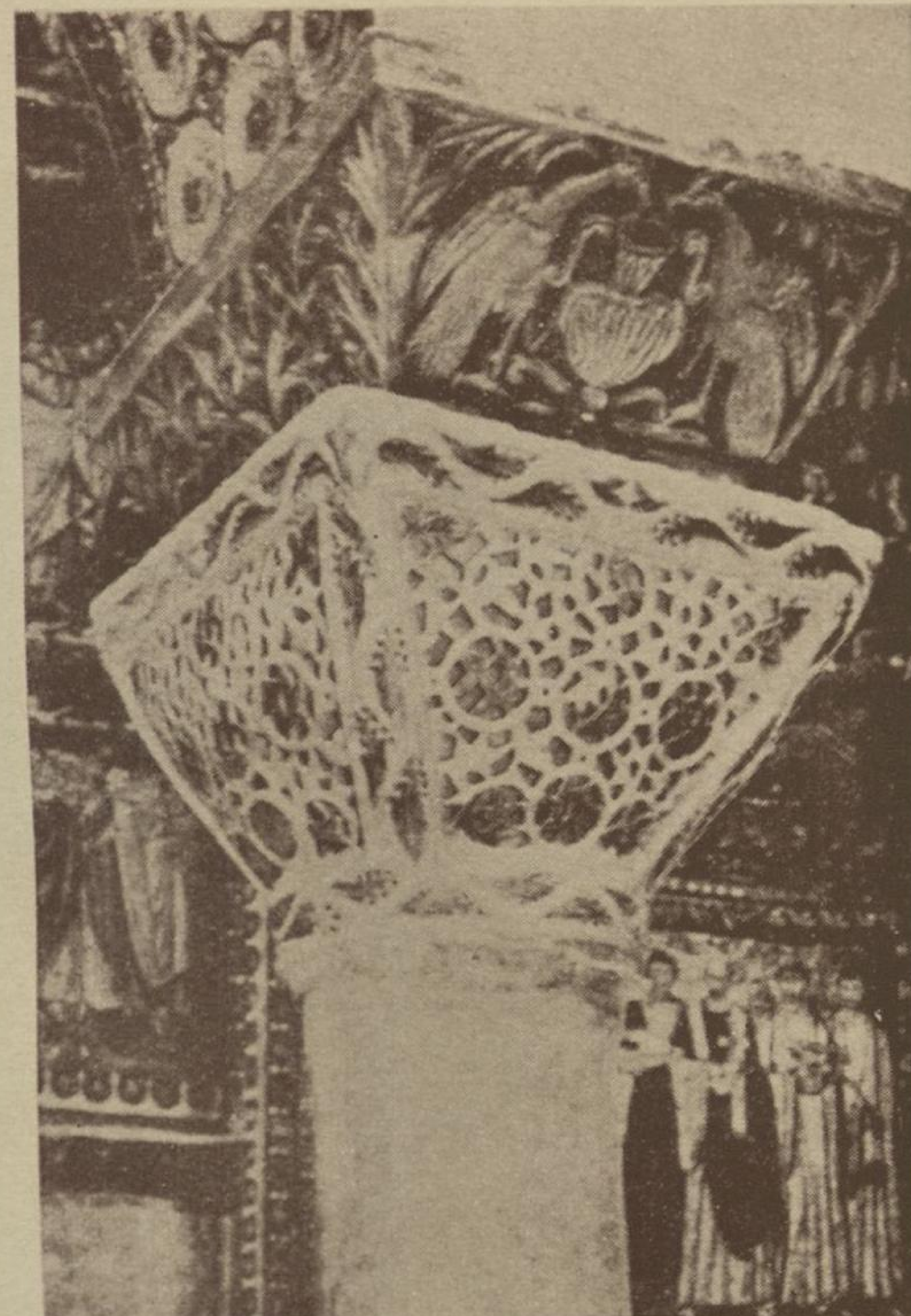
ایاصوفیہ





پُلِ غلطہ
استنبول

شارعِ زریں
کے پار
سامنے
ایاصوفیہ
ہے



→ شہر راونا (اٹلی) میں سینٹ وتالس کے گرجے کا ایک سر ستون جو بیزنطینی تعمیر کا نمونہ ہے اس کے پس منظر میں وہ تصویر بھی دکھائی دیتی ہے جو اس کتاب کے آغاز میں شامل ہے۔

↓

شہر راونا میں سینٹ اپالی ناریوس کے گرجے کا اندرونی حِصّہ، جو ۵۲۵ء کے بعد تعمیر ہوا۔ تصویر میں ان عورتوں کی قطار دکھائی دیتی ہے جنھوں نے شہادت کا مرتبہ پایا۔





ہاتھی دانت کی اس تختی میں ایک رومی قیصر نے فوجی لباس پہن رکھا ہے ۔ اس کے نچلے حصے میں چند مذہبی علامات ہیں۔
تصویر کے بائیں جانب پتوں کا وہ ہار نظر آتا ہے جو رومہ کے قیصر پہنا کرتے تھے ۔



چھٹی یا ساتویں صدی کا بیزنطینی طرز کا ایک طلائی جام جس میں چار نسوانی تصویریں چار مقامات یعنی قسطنطنیہ، قبرص، رومہ اور اسکندریہ کو ظاہر کرتی ہیں۔



چاندی کا ایک پیالہ (چھٹی صدی کا) تصویر میں لوگ رنگ رلیاں منا رہے ہیں



استنبول کی
ایک کشادہ سڑک



اتاترک کا مقبرہ

جہاں ہر سال

برسی منائی جاتی ہے

وفات ۱۰؍ نومبر ۱۹۳۸ء

افریقہ کے بربر بھی تھے، لیکن ان میں سے کوئی بھی فیصلہ نہ کرسکا کہ گاتھوں کا ساتھ دینے میں بہتری ہے یا قسطنطنیہ کی فوج کا۔ آخر انھوں نے حملہ آور فوج کی تعداد کم دیکھی تو مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔
بیلی ساریوس بڑا کامیاب سالار تھا، لیکن لوگوں کا دل موہ لینے کی صلاحیت اس میں موجود نہ تھی۔ اسے اپنے بیڑے کے لیے بندرگاہ کی ضرورت تھی، لہٰذا فیصلہ کر لیا کہ نیپلز کو بزورِ شمشیر فتح کرے۔ محاصرہ مہینے بھر تک جاری رہا اور بیلی ساریوس کی تشویش بڑھتی گئی۔ افسر بے دلی سے کام کرتے نظر آتے تھے۔ سوار محاصرے کی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرتے تھے۔ سب کو یہ خطرہ سر پر منڈلاتا نظر آتا تھا کہ پچاس ہزار گاتھ سواروں کا ریلا اچانک آئے گا اور انھیں بیڑے و بندرگاہ سمیت سمندر میں ڈھکیل دے گا۔

پھر ایک عجیب واقعہ پیش آیا، جس نے بیلی ساریوس کی تمام مشکلات حل کر دیں۔ رومیوں نے وہ نالی توڑ دی تھی، جس سے شہر میں پانی جاتا تھا۔ بیلی ساریوس نے ایک سپاہی کو بھیجا کہ ذرا جاکر اس کی کیفیت دیکھ آئے۔ وہ رینگتا ہوا نالی کے مقام پر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس راستے سے وہ شہر کے اندر داخل ہو گیا ہے۔ بیلی ساریوس نے اس اطلاع سے فوراً فائدہ اٹھایا۔ اہلِ شہر کو آگاہ کر دیا کہ تمھیں حوالگی کا آخری موقع دیا جاتا ہے۔ پھر رات کی تاریکی میں زرہ پوش سواروں کو اسی راستے سے داخلے کا حکم دے دیا۔ ہن اور دوسرے وحشی دستوں نے لوٹ مار میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جن گاتھوں نے حوالگی قبول کر لی تھی انھیں بھی بہ مشکل بچایا جاسکا۔ بیلی ساریوس تھوڑی سی فوج شہر کی حفاظت کے لیے چھوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

راستے میں جتنے لوگ ملے، وہ رومی فوج کو دیکھ کر سراپا حیرت بن گئے۔ تین پشتوں سے انھوں نے کسی رومی سپاہی کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ جسٹینین کی حکومت کے نویں سال (۵۳۶ء) ۹ دسمبر کو یہ فوج قیصروں کے شہر میں داخل ہو گئی۔ پادریوں، منصب داروں اور عمائد نے اس کا استقبال کیا۔ چمن زاروں میں مویشی چر رہے تھے۔ دریا پار ہیڈرین کے حصار نما مقبرے سے ذرا آگے سینٹ پیٹر کا کلیسا نظر آرہا تھا، جس کی دیواریں بارشوں کے باعث سیاہی مائل ہو چکی تھیں۔ شہر میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ تمام گاتھ شمالی جانب چلے گئے، البتہ ان کا کماندار لیوڈرک اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ بیلی ساریوس نے اس سے پوچھا کہ لڑے بغیر شہر چھوڑ جانے میں کونسی مصلحت تھی؟ لیوڈرک کچھ جواب نہ دے سکا۔ بیلی ساریوس نے جب شہر پناہ کے گرد چکر لگا کر معائنہ کیا تو اسے پتا چلا کہ آریلین کی

بنوائی ہوئی بارہ میل لمبی فصیل اور شہر کے بارہ دروازے امتدادِ زمانہ سے اس قدر شکستہ ہو چکے تھے کہ ان کی مدافعت کے لیے بہت کثیر تعداد درکار تھی۔ اس نے سب سے پہلے شہر کے دفاعی انتظامات کو درست کرنے کی کوشش کی۔ بیلی ساریوس نے اپنے سوار دو سالاروں کی سرکردگی میں دیکھ بھال کے لیے شمالی جانب بھیج دیے۔ جہاز غلّہ لے کر پہنچے تو بیلی ساریوس نے پورا غلّہ محفوظ مقامات پر رکھوا دیا اور روما کے کسانوں سے بھی کہا کہ وہ غذائی جنسیں کھیتوں سے اُٹھا کر شہر میں لے آئیں۔ گویا صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بیلی ساریوس محاصرے کی صورت میں مقابلے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس نے شہر کے ایک دروازے کی کنجیاں جسٹینین کے پاس قسطنطنیہ بھیج دیں اور لیوڈرک کو بھی ساتھ ہی روانہ کر دیا۔

اسی سال بڑے دن کی تقریب میں جسٹینین کے سر پر بڑے اہتمام سے تاج رکھا گیا۔ اس کی حکومت کے دس سال پورے ہو چکے تھے۔ یونانیوں نے آفرینشِ عالم سے سنین کا جو حساب لگا رکھا ہے، اس کے مطابق یہ ۶۰۲۸ء تھا۔ ایا صوفیہ کی عمارت مکمّل ہو چکی تھی اور اُسی شام عبادت کے لیے گرجے کا باقاعدہ افتتاح ہونے والا تھا۔ محل کے برنجی دروازے پر سونے کی چادر چڑھائی جا چکی تھی۔ شہر آتش زدگی کے تمام اثرات سے پاک ہو چکا تھا۔ آگسٹس کا چوک امیروں اور مذہبی پیشواؤں سے کھچا کھچ بھرا ہُوا تھا۔ آسمان پر شام کی شفق پھولی ہوئی تھی۔ جسٹینین کی آرزو تھی کہ کاش طلوعِ آفتاب کا وقت ہوتا! ہر دل میں سوال پیدا ہو رہا تھا کہ کیا قسطنطنیہ کے لیے یہ نئے دور کا افتتاح نہیں؟ ٹرائی بونین نے مجموعۂ ضوابط کی پچاس جلدیں تیار کر دی تھیں۔ تمام بازار از سرِ نو تعمیر ہو چکے تھے اور کوتوالِ شہر نے ہر جگہ امن قائم کر دیا تھا۔ نیلی پوش رخصت ہو چکے تھے۔ کارکن اپنے کاموں میں خاص دلچسپی لے رہے تھے۔ ملاح بحیرۂ روم اور ارضِ مقدّس کی بندرگاہوں سے نکل نکل کر ان سمندروں کے چکّر لگا رہے تھے، جہاں پہلے کوئی نہیں پہنچا تھا۔ بے خانماں آدمیوں کو نئے مسکن میں پناہ مل گئی تھی۔ قلبی و ذہنی مریضوں کے لیے نئے شفاخانے میں مشغولیّت کا انتظام تھا۔

جسٹینین آگسٹس کے چوک سے گھوڑے پر سوار ہُوا۔ جہاں تک اس کی نظر جاتی تھی، لوگ اس کے مرمریں مجسّمے کو دیکھ کر خوشیاں منا رہے تھے، جو ایا صوفیہ کے سامنے نصب کرایا گیا تھا۔ اسے آرزو تھی کہ کاش آج حضرت سلیمانؑ اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے ایا صوفیہ کے صحن میں موجود ہوتے!

کیونکہ وہ سمجھتا تھا، اس کا بنایا ہوا گرجا ہر لحاظ سے ہیکل سلیمانی کا مثنیٰ ہے بلکہ اُس سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ جسٹینین اس عظیم الشان گرجے کے سامنے گھوڑے سے اُتر پڑا۔ دہلیز سے گزرتے ہوئے اس نے تاج سر سے اُتار دیا تھا اور گرجا میں داخل ہوتے وقت اسقف اعظم سے برکت حاصل کی۔ عظیم الشان گرجے کے اندر پہنچ کر وہ اسقف اعظم کے مقابل تخت پر بیٹھ گیا۔ شمعوں کے شعلے سروں کے اوپر رقصاں تھے۔ روپہلی کشتیوں اور پیالوں میں زنگارنگ کے چراغ ہزاروں انسانوں کے سروں پر درخشاں تھے۔ اس روشنی میں متبرک پردوں کے روپہلی نقوش اور مقدس میز کے زرتار کپڑے کی سنہری تصویریں جگمگا رہی تھیں۔ قربان گاہ کے اوپر مریم عذراؑ کی تصویر تھی، جسے گہرے نیلے رنگ کا لباس پہنا رکھا تھا۔ اس کے سامنے روشنیاں ایک خاص فنکاری سے لگائی گئی تھیں۔ مریم عذراؑ سے اوپر ایک چہرے کے مدّھم سے نقوش ابھر رہے تھے۔ یہ مسیحؑ تھے، جن کے ذریعے اَن دیکھے خدا کی مرضی پوری ہوئی۔ جسٹینین کی نگاہیں ان کرّوبیوں کی طرف گئیں، جنھوں نے بہت بلندی پر بازو پھیلا رکھے تھے:

"اور انھوں نے کرّوبیوں کے بازو اس طرح پھیلا دیے کہ ایک کا بازو ایک دیوار کو اور دوسرے کا بازو دوسری دیوار کو مس کر رہا تھا۔"

جسٹینین کو اس قسم کی آرائشیں بہت پسند تھیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر اس کے بنائے ہوئے گرجے کو ہیکل سلیمانی جیسا ہونا ہے تو کرّوبیوں کے بازو وہیں ہونے چاہئیں، جہاں دکھائے گئے ہیں۔ گرجے میں ولادتِ مسیح کے گیت گونج رہے تھے۔ اس موقع کے لیے روما نوس کو مشرق کے ہیکل سے بُلایا گیا تھا۔ اسے مسیحیوں کی پُرانی دعائیں خوب یاد تھیں۔ اُس روز کوئی باجہ نہ بجا۔ صرف انسانوں کی آوازیں گرجے میں گونج رہی تھیں۔

ایا صوفیہ کے باقاعدہ افتتاح کے بعد جسٹینین بہت تکان محسوس کر رہا تھا۔ وہ پچپن سال کا ہو چکا تھا اور اٹھارہ سال گزر چکے تھے، جب اس نے کسی نہ کسی طرح تخت کے لیے جدوجہد شروع کی تھی۔ امتدادِ زمانہ نے اس کے قویٰ کو مضمحل کر دیا تھا لیکن اس کی غور و فکر کی عادت اب بھی برقرار تھی۔

ایا صوفیہ کے گنبد پر سنہری ہلال چمک رہا تھا۔ یہ قدیم بزنطیم کا خاص نشان تھا جو جسٹینین کے

محل کے نیچے دفن ہو چکا تھا۔

جسٹینین نے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے نئے قانون کی تشریحات لکھیں۔ یہ کام دراصل ٹرائیبونین کا تھا، مگر شہنشاہ نے خود اپنے ہاتھ سے لکھنا پسند کیا تاکہ تمام لوگوں کے لیے یہ ایک پیغام بن جائے۔ اُن نوجوانوں کو بالخصوص مخاطب کیا، جو قانون پڑھنا چاہتے تھے۔ پیغام درج ذیل ہے:

ہمارے خداوند یسوع مسیح کے نام سے

شہنشاہ سیزر، فلیویس، جسٹینین (ونڈالوں، افریقیوں، گاتھوں، المانیوں، فرینکوں، جرمنوں اور دیگر اقوام کے فاتح) خدا ترس، اقبال مند، شہرۂ آفاق، مظفر و منصور، عالی منزلت شہنشاہ کی طرف سے مطالعۂ قانون کے خواہشمند نوجوانوں کے نام

"شہنشاہ عالی منزلت کے لیے فوجوں کے علاوہ قانون بھی لازم ہے تاکہ روما کا حکمراں دشمنوں پر فتح و ظفر حاصل کرنے کے علاوہ عدل و انصاف کا بھی پابند رہے۔ غیر متمدن قوموں پر ہماری شجاعت آشکارا ہو چکی ہے۔ انھوں نے لمبی مدّت کے بعد روما کی مرضی کے روبرو سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ ان تمام قوموں پر قانون کے مطابق حکومت کی جا رہی ہے، جسے ہم نے بڑی توجّہ اور محنت سے تیار کیا ہے۔ قانون ہم نے مکمل کر لیا، حالانکہ پہلے اس کی طرف سے اِک گونہ مایوسی تھی۔ گویا ہم نے ان ملّاحوں کا سا کارنامہ انجام دیا، جو سمندر کے وسط سے جہاز کھیتے ہوئے کنارے پر لے جاتے ہیں۔ ٹرائی بونین جیسے ممتاز اور تھیوفلس نیز ڈروتھیس[1] جیسے مشہور آدمیوں نے ہماری اعانت کی۔ ہمارے حکم اور ہدایت کے مطابق انھوں نے مجموعۂ ضوابط تیار کیا، جس سے تم لوگ قانون کے پہلے سبق لے سکتے ہو اور ان کے لیے تمھیں زمانۂ قدیم کے افسانوں میں جانے کی ضرورت نہیں بلکہ شہنشاہی علم و فضل کی درخشاں روشنی سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اب تم بلا تاخیر قانون کا مطالعہ شروع کر سکتے ہو۔ یہ ضوابط

---

[1] DOROTHEUS

قدیم قوانین کے بہت بڑے ذخیرے سے چھان بین کے بعد فراہم کیے گئے ہیں اور ہم نے انھیں اپنے آئین و دساتیر کا درجہ دے دیا ہے۔

"ان قوانین کو تم لوگ شوق سے بہترین صلاحیتوں کے ساتھ مطالعہ کرو تاکہ سلطنت کے ان حصّوں کا انتظام کرنے کے قابل ہو جاؤ جو تمھارے سپُرد کیے جائیں گے۔

(یہ فرمان شہنشاہ جسٹینین، عالی منزلت، بابائے ملک نے اپنی تیسری قونصلیت میں بہ مقام قسطنطنیہ جاری کیا)"

قانون کا مفہوم بھی عوام پر واضح کر دیا گیا۔ مثلاً کہا گیا، قانون کا جاننا اُس وقت تک بے سُود ہے، جب تک ان لوگوں سے آگاہی حاصل نہ کی جائے، جن کے لیے قانون بنایا گیا ہے۔ انصاف کی تعریف یوں کی گئی: "انصاف ایک مستقل اور پائدار مقصد ہے، جو ہر انسان کو اس کا حق دیتا ہے۔" آزادی کے متعلق بتایا گیا: "ہر انسان کی اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کی فطری صلاحیت ہے۔ تاوقتیکہ حکومت کی طاقت یا قانون اس میں مزاحم نہ ہو۔" غلامی کے متعلق یوں تشریح کی گئی: "یہ قوموں کا ایک ایسا ادارہ ہے، جو فطرت کے سراسر خلاف ہے کیونکہ ایک انسان کو دوسرے کے زیرِ اقتدار رکھا جاتا ہے۔" عوام کے طبعی حقوق کی تفصیل یہ بتائی گئی: "وہ بہتے دریاؤں، بندرگاہوں اور ساحلِ بحر سے استفادے کے حق دار ہیں۔ نیز انھیں حق حاصل ہے کہ اپنے وطن کی زمین سے خوراک پیدا کریں۔ ایندھن لیں اور زندگی کے دوسرے وسائل سے فائدہ اٹھائیں۔"

اسی طرح فرد کے مقابلے میں سلطنت کے حقوق اور اس کے تحفّظ کی تصریحات کی گئیں۔

بارھواں باب

رومہ کا محاصرہ

اگرچہ رومہ کے اصل شہری بہت تھوڑے رہ گئے تھے، لیکن ان کے پاس کام کاج کے لیے غلام موجود تھے۔ وہ فرصت پاتے تو تفریح کے لیے بڑے بڑے حماموں میں چلے جاتے، جنھیں زوال کے باوجود گرم رکھا جاتا تھا۔ غذائی جنسوں کی قلت کے باعث راتب بندی ضروری ہوگئی تو انھوں نے بیلی ساریوس کے پاس غذا کی کمی اور آرام کرنے کے اوقات کی کمی کی شکایت کی۔ بیلی ساریوس کو اندازہ ہوگیا تھا کہ ان کے لیے غذائی جنسیں مہیا رکھنا حد درجہ ضروری ہے۔ گاتھوں کے عہدِ حکومت میں ان رومیوں کی خواہشاتِ راحت و آسائش بہت محدود رہ گئی تھیں اور انھوں نے زندگی کے بنیادی امور میں کسی خوشگوار تغیّر کے متعلق سوچنا ہی بند کر دیا تھا۔ پورے رومہ میں صرف ایک کتب خانہ باقی رہ گیا تھا، جو ٹائبر پار سینٹ پیٹر کے اسقف نے جمع کر رکھا تھا۔ صنعت و حرفت میں حیرت انگیز کمی آگئی تھی۔ ٹائبر کے پانی سے فائدہ اُٹھانے والی پن چکیاں بند تھیں۔ دریا کے دہانے پر آسٹیا[1] نام جو بندرگاہ تھی، اس میں ریت بھر گئی تھی۔ مورچوں کے پاس جو گھاس اُگ آئی تھی، وہاں بیلی ساریوس کے گھوڑے چرا کرتے تھے۔

افریقہ کے فاتح نے شہر کے لیے نیا کوتوال مقرّر کیا۔ قسطنطنیہ سے جو انجنیئر ساتھ آئے تھے، انھوں نے منجنیقیں اور مکانیکی "گرگ[2]" تیار کرنے کے لیے کاریگر بھرتی کر لیے تاکہ ضرورت کے وقت شہر کی حفاظت ہو سکے۔ پن چکیاں از سرِ نو جاری کر دی گئیں۔ شہریوں کی ملیشیا کے لیے جنگی تربیت کا انتظام کر دیا گیا اور قسطنطنیہ کی طرح فصیل کے مختلف حصّوں کی حفاظت اور نگرانی کے لیے فوجی دستے مقرّر کر دیے گئے۔ چونکہ شہر کے بیرونی میدانوں سے پانی باہر نکلنے کا نظام

---

[1] OSTIA [2] MECHANICAL WOLVES منجنیقیں ہو دُور دُور تک پتھر پھینکتی تھیں۔

بگڑ گیا تھا اور اس کی درستی پر کسی نے توجہ نہیں کی تھی، اس لیے فصیل کے اردگرد کا پورا علاقہ دلدل بن گیا تھا اور اس سے اُٹھنے والے زہریلے بخارات بیماریوں کا سرچشمہ بنے ہوئے تھے۔ خود بیلی ساریوس کی فوج گھٹتے گھٹتے پانچ ہزار رہ گئی تھی اور اتنی فوج فصیل کے تمام حصوں کی شب و روز نگرانی کے لیے کافی نہ تھی۔ شہری خوش تھے کہ سردیوں کے موسم میں اطمینان سے آیندہ جنگ کے لیے تیاری ہو سکے گی۔ بیلی ساریوس کو علم تھا کہ جسٹینین جوڑ توڑ میں لگا ہوا ہے اور گاتھ دُور شمال میں مدت تک مصروف رہیں گے۔ روپے کے لالچ اور قسطنطنیہ کی طرف سے تقاضے کی بنا پر فرینکوں نے گاتھوں کی اُن آبادیوں پر حملہ کر دیا، جو کوہستان ایلپس کے پار واقع تھیں۔ جسٹینین کو امید تھی کہ یہ جنگجو جتھے وہیں ایک دوسرے سے لڑتے رہیں گے، لیکن انھوں نے تھوڑی ہی دیر میں باہم تصفیہ کر لیا۔ آسٹرو گاتھوں کے تمام علاقے خطرے میں پڑ گئے تھے۔ انھوں نے ایلپس پار کا خطہ گالوں کے حوالے کر دیا۔ ساتھ ہی کچھ رقم بھی دے دی۔ گاتھ تحریری معاہدوں کو پختہ نہیں سمجھتے تھے، صرف زبانی حلف اٹھا لینا کافی جانتے تھے۔ چنانچہ زبانی حلف کی بنا پر صلح ہو گئی اور فرینک اطمینان سے بیٹھ کر انتظار کرنے لگے کہ اٹلی کے حالات کیا رُخ اختیار کرتے ہیں۔

اس اثنا میں گاتھوں نے اپنے بے ہمت بادشاہ تھیوڈاہڈ کو قتل کر دیا، جب وہ جان بچا کر بھاگا جا رہا تھا اور اس کی جگہ ویٹجس[1] کو بادشاہ تسلیم کر لیا، جو آزمودہ کار سالار تھا۔ ویٹجس نے اپنی بادشاہی کو مستحکم کرنے کے لیے امالاسنتھا کی بیٹی متاسنتھا[2] سے جبراً شادی کر لی، جو تھیوڈورک کی نواسی تھی۔ اس شادی نے متاسنتھا کے دل میں شوہر سے سخت نفرت پیدا کر دی اور وہ اس انتظار میں بیٹھ گئی کہ موقع ملے تو خوفناک بدلا لے۔ ویٹجس نے اسے ریونا میں چھوڑا، جو گاتھوں کا مرکز تھا اور خود فوج لے کر روما کی طرف بڑھا۔ برف باری کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ گھاس اُگ رہی تھی اور وہ جنگ پیش آنے والی تھی، جس سے جسٹینین بچنا چاہتا تھا۔

گاتھوں کے ابتدائی حملے میں بیلی ساریوس بہ مشکل تباہی سے بچا۔ وہ ان حفاظتی چوکیوں کے معائنے کے لیے ایک رجمنٹ کے ساتھ گیا تھا، جو دریائے آنیو[3] اور دریائے ٹائبر کے مقام اتصال

---

[1] VITIGIS [2] MATASUNTHA [3] ANIO یہ دریا روما سے ۲ میل اوپر ٹائبر میں مل جاتا ہے۔ شہر کے لیے پانی کا انتظام اسی دریا سے کیا گیا تھا۔

کے پاس بنائی گئی تھیں۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے دیکھا کہ چوکیاں منہدم ہو چکی ہیں اور گاتھوں کا لشکر لبریز آنیو کے گھاٹوں سے گزر رہا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں بیلی ساریوس کے لیے موت و حیات کی جنگ شروع ہو گئی۔ کچھ لوگ رومی فوج کو چھوڑ کر گاتھوں سے جا ملے اور انھیں اطلاع دے دی کہ بیلی ساریوس خاکستری گھوڑے پر سوار ہے، جس کی پیشانی سفید ہے۔ بیلی ساریوس نے شمشیر و سپر کے بل پر ہر حملہ ناکام بنا دیا، لیکن وہ مقام جنگ کے لیے موزوں نہ تھا۔ چنانچہ اس کے زرہ پوش سوار دشمن کا حلقہ توڑ کر شہر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازہ بند تھا۔ دن کی روشنی ختم ہو رہی تھی۔ ہر طرف گرد و غبار کا طوفان پھیلا ہوا تھا۔ ملیشیا کے سنتریوں نے یا تو اپنے سالارِ اعظم کو پہچانا ہی نہیں یا حد درجہ خوف زدہ اور سراسیمہ ہو چکے تھے اور انھوں نے دروازہ نہ کھولا۔ بیلی ساریوس نے اس موقع پر ایک عجیب چال چلی، یعنی اپنے بچے کھچے سپاہیوں کو لے کر گاتھوں پر ہلہ بول دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ شہر کے اندر سے فوج نکل آئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے گھوڑوں کی باگیں موڑ دیں اور پیچھے کی طرف بھاگ گئے۔ اس طرح بیلی ساریوس کو شہر میں داخل ہونے کا موقع ملا۔

تاریکی پھیل گئی تو گاتھوں کی مشعلیں میدان میں جلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اہلِ شہر پر ہیبت طاری تھی۔ ایک فوجی افسر دوڑا دوڑا آیا اور بیلی ساریوس سے کہا کہ گاتھ فصیل توڑ کر اندر آ گئے ہیں۔ ابھی وقت ہے بھاگ کر ساحل پر پہنچ جائیے۔ بیلی ساریوس بڑے اطمینان سے گھوڑے پر سوار ہوا اور ایک ایک گلی میں پھرا، مگر کہیں دشمن نظر نہ آیا۔ اس نے تمام افسروں کو حکم دے دیا کہ فصیل پر مقررہ جگہ پر ڈٹے رہو۔ شہریوں کو اطمینان دلایا۔ ملیشیا کے افسروں سے کہا کہ اطمینان سے بیٹھو، میں تمھارے دشمن کو ضرور شکست دوں گا۔ گاتھ فتح کے یقین سے لبریز تھے۔ وہ شہریوں کو برا بھلا کہہ رہے تھے کہ تم لوگ تھوڑے سے یونانیوں کے محکوم بن گئے ہو جو صرف تنخواہ دار ایکٹروں اور چور ملاحوں کی حیثیت میں اٹلی آتے رہے ہیں؟

بیلی ساریوس کو پیغام بھیج دیا گیا کہ جوانگی کے لیے تیار ہو جاؤ تو تمھیں عزت سے باہر نکل جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ بیلی ساریوس نے کہلا بھیجا: وہ وقت آنے والا ہے، جب تمھیں سر چھپانے کو جگہ نہ ملے گی۔ کسی جھاڑی میں بھی تم پناہ نہ پا سکو گے۔ روم ہمارا ہے

اور بیلی ساریوس جب تک زندہ ہے، کبھی ہتھیار نہ ڈالے گا۔

شہری لوگ بیلی ساریوس کے اعتماد کو حماقت کا کرشمہ قرار دے رہے تھے۔ گاتھوں نے فصیل پر حملہ شروع کیا تو ان کے بھدّے آلاتِ محاصرہ کو دیکھ کر بیلی ساریوس نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ ان متحرک برجوں کو بیل کھینچتے تھے۔ بیلی ساریوس کی مکانیکی منجنیقوں سے پتھر پھینکے جاتے تو بیل اور ساتھ کے زرہ پوش سوار دونوں مارے جاتے۔ دریائے ٹائبر پر پل بنا ہوا تھا، جو ہیڈرین کے مقبرے[۱] تک جاتا تھا۔ گاتھ پل پر سے گزرتے ہوئے سیڑھیاں لگا کر مقبرے پر چڑھنے لگے۔ وہاں قسطنطین نامی ایک بہادر سالار حفاظت کے لیے مامور تھا۔ اس نے حکم دے دیا کہ مقبرے کے چھجے پر جو مرمریں مجسمے نصب ہیں، انھیں توڑ توڑ کر دشمن پر برساؤ۔ یہ بارش ایسی سخت تھی کہ گاتھ اپنے زخمیوں کو لے کر کافور ہو گئے۔ یوں پہلا حملہ ناکام رہا اور انسانی عزم نے فوج کی کثرت کا کامیاب مقابلہ کیا۔

گاتھ ہمیشہ سے جنگ کے عادی چلے آتے تھے۔ وہ بھی بہ آسانی ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے شہر کے اردگرد مستقل چھاؤنیاں بنا لیں تاکہ خوراک اندر نہ پہنچ سکے اور دریائے ٹائبر کو بھی روک دیا گیا تاکہ کوئی جہاز آ جا نہ سکے۔ انھوں نے وہ نالی توڑ ڈالی، جس کے ذریعے سے شہر میں پانی پہنچتا تھا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ حمام پانی سے محروم ہو گئے اور اہلِ رومہ کے لیے روزانہ غسل کی تفریح بھی ختم ہو گئی۔ غیر مصافی آبادی کے لیے غذا کی قلت بڑی پریشانی کا باعث ہوئی۔ وہ لوگ کہتے تھے، یہ کیا حماقت ہے؟ وٹیجس کو شہر حوالے کر دینے سے امن مل سکتا ہے، کھانا مل سکتا ہے، تازہ پھل مل سکتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پہلے کی طرح ہم حمّاموں میں جا کر نہا سکتے ہیں۔ بیلی ساریوس نے حکم دیا کہ پوری غیر مصافی آبادی شہر سے نکل جائے۔ گاتھوں نے بھی ان لوگوں سے کوئی تعرض نہ کیا۔ بیلی ساریوس نے رومہ کی حالت کے بارے میں جسٹینین کو ایک خط لکھا، جس کا مضمون یہ تھا:

"میں نے شہنشاہ کے احکام کی تعمیل کی۔ شہر کی کنجیاں لیوڈرک کے ساتھ بھیج

---

[۱] یہ مقبرہ مدوّر اور بہت بلند ہے۔ آج کل اسے سینٹ اینجلو (ANGELO) کا قلعہ (CASTLE) کہتے ہیں۔ یہ سینٹ پیٹر کے گرجے کے بہت قریب ہے۔

دی گئیں۔ جب وحشیوں نے پوری فوج کے ساتھ حملہ کیا تو وہ ہم پر اور شہر پر قبضہ کر لینے ہی والے تھے۔ باقی رہے ہمارے حالات تو کاش یہ بہتر ہوتے! دس ہزار سے کئی گُنا زیادہ فوج کے لیے بھی فصیل کی حفاظت زیادہ دیر تک ممکن نہیں۔ (بیلی ساریوس کے ساتھ صرف پانچ ہزار فوج تھی) یہ شہر بہت بڑے رقبے میں پھیلا ہُوا ہے اور سمندر سے منقطع ہے، اس وجہ سے رسد نہیں پہنچ سکتی۔ اگرچہ اب تک رومیوں کی روش ہمارے متعلق اچھی ہے، لیکن بھوک کی وجہ سے ان کی روش بدل سکتی ہے۔ ان کی دوستی ناکامی کی آزمائش برداشت نہیں کر سکتی۔ میرے شہنشاہ! یہ صورتِ حالات پیشِ نظر رکھیے کہ اگر وحشی کامیاب ہوئے تو ہم اٹلی سے باہر نکال دیے جائیں گے اور ہماری فوج تباہ ہو جائے گی۔ ہمارے متعلق عام رائے یہ ہو گی کہ ہم نے رومہ شہر اور اس کے شہریوں کو برباد کر دیا، جنھوں نے ہم سے وفاداری کرتے ہوئے اپنی حفاظت خطرے میں ڈالی۔

"میں جب تک زندہ ہوں، شہر نہ چھوڑوں گا، تاہم جو کچھ آپ سے صاف صاف کہہ دینا ضروری ہے، اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ ہمارے لیے اتنی رسد اور اتنے مسلح آدمی بھیجیے کہ ہم مساویانہ دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔"

اگرچہ رومیوں کے ایوانِ عمائد کی حیثیت محض ایک بلدیہ کی سی رہ گئی تھی، تاہم ان لوگوں میں زورِ تقریر بدستور باقی تھا۔ انھوں نے پوچھنا شروع کیا کہ شہنشاہ نے آپ کو بھیجا ہے تو اتنی تھوڑی فوج کیوں بھیجی؟ ہمارا تو کسی سے جھگڑا نہ تھا، پھر ہمیں کیوں مشکلات میں اُلجھایا گیا؟ اس اثناء میں سولہ سو سوار آ پہنچے، جو سرمائی طوفانوں کے باعث یونانی بندرگاہوں میں رُکے رہے تھے۔ ان لوگوں کا تعلّق کریمیا سے تھا۔ یعنی ان کی عام حیثیت خانہ بدوشوں کی سی تھی۔ ان خانہ بدوش سواروں کو گاتھوں کی چھاؤنیوں سے بچ کر نکل آنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ بیلی ساریوس نے انھیں ایک نئی چال کے لیے استعمال کیا، یعنی ان لوگوں سے گاتھوں کو حملہ کرنے پر اکسانے کا کام لیا گیا۔ سواروں کا ایک دستہ شہر سے باہر نکلتا۔ گاتھ اس پر حملہ کرتے تو یہ تیزی سے لَوٹ آتے۔ پھر تعاقب کرنے والے گاتھوں پر منجنیقوں کے ذریعے سے پتھروں کی بارش شروع ہو جاتی

اور انھیں سخت نقصان پہنچتا۔ چونکہ شہر کا رقبہ بہت وسیع تھا، اس لیے گاتھوں کا کیمپ بھی مختلف حصّوں میں بکھرا ہُوا تھا۔ بیلی ساریوس کے تجربہ کار سوار ایک چھاؤنی کا رخ کرتے، لیکن حملہ دوسری پر کر دیتے۔ رات کی تاریکی میں مُور[1] باہر نکلتے تو جو گاتھ قریب آتے، انھیں خنجر مار کر ختم کر دیتے اور گھوڑوں پر خود قابض ہو جاتے۔ وہ خالی گاڑیاں لے کر گھاس اور چارے کی تلاش میں میدانی علاقے کی طرف نکل جاتے۔ دوسرے دن گاتھوں کو پتا چلتا اور وہ تعاقب کے لیے تیار ہوتے۔ اس اثنا میں معلوم ہو جاتا کہ مُور بھری گاڑیاں اور مویشی لے کر شہر کے اندر داخل ہو چکے ہیں۔ اگر کبھی مقابلہ ہو جاتا تو بیلی ساریوس کے خانہ بدوش سوار ہلاکت بار تیروں کی ایسی بارش کرتے کہ گاتھوں کو کہیں عافیت نہ ملتی اور ان کے پلے ہوئے گھوڑے ہُنوں اور اہلِ نومیڈیا کے برق رفتار بادپاؤں کا تعاقب نہ کر سکتے۔ اس طرح بیلی ساریوس نے مختلف تدبیروں سے دشمن کو تھکا دیا۔ دریائے ٹائبر کے راستے سامان لانے کے لیے ایک مستول والی چھوٹی چھوٹی کشتیاں تیار کر لی گئیں۔ گاتھوں کی ناکہ بندی ان کشتیوں کو نہیں روک سکتی تھی۔ وہ ان پر تیر برسا سکتے تھے۔ تیروں سے بچنے کے لیے دونوں طرف لکڑی کے تختوں کی دیواریں کھڑی کر لی جاتیں۔ اسی کشمکش میں گرمی کا موسم ختم ہوگیا اور کوئی امدادی فوج نہ پہنچی۔

شہر کے لوگ تکلیفیں برداشت کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اب انھیں اصرار تھا کہ گاتھوں سے دست بہ دست جنگ کی جائے۔ چنانچہ وہ بیلی ساریوس کے پاس پہنچے اور التجائیں کیں کہ گاتھوں سے آخری مقابلہ کر کے فتح حاصل کی جائے۔ بیلی ساریوس نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ میرے پاس فتح کا جادو نہیں۔ گاتھوں کے پیادہ سپاہی صرف تیر کمان استعمال کرتے ہیں۔ سواروں کے پاس تلواریں اور برچھیاں ہوتی ہیں، تیر کمان نہیں ہوتے۔ لہٰذا پیادہ فوج سے سابقہ پڑتا ہے تو ہم ان سے دُور رہتے ہیں۔ سواروں سے مقابلہ ہوتا ہے تو ہم اتنے فاصلے سے ان پر تیر چلاتے ہیں، جہاں ان کی تلواریں اور برچھیاں کوئی کام نہیں دے سکتیں، لیکن دست بہ دست جنگ

---

[1] MOOR یعنی افریقہ کے بربر، جو آگے چل کر اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے تو ان کے شاندار کارناموں سے تاریخ کے صفحات ہمیشہ کے لیے منوّر ہو گئے۔

کے لیے اصرار جاری رہا۔ آخر بیلی ساریوس نے باہر نکل کر حملہ کیا۔ وہ گاتھوں کے کیمپ کے اندر پہنچ گیا۔ گاتھوں کے بے شمار لشکر نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ رومیوں کو خاصا نقصان پہنچا۔ بیلی ساریوس بہ مشکل انھیں شہر کے اندر لایا۔ پروکوپیس نے اس لڑائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ لڑائی دشمن کے کیمپ میں شروع ہوئی تھی اور فصیل پر آکر ختم ہوئی۔

موسم خزاں ختم ہوا تو بیلی ساریوس نے ہر طرف قاصد بھیج دیے۔ پروکوپیس اور اپنی بیوی انٹونیا کو محافظ سواروں کے ساتھ نیپلز جانے کا حکم دے دیا تاکہ جہاں جہاں سے مسلح آدمی ملیں، انھیں ساتھ لے آئیں۔ ایک بڑا تین ہزار پیادہ فوج لے کر نیپلز تک آگیا۔ خونریز جان[۱] اٹھارہ سو سواروں کے ساتھ ایڈریاٹک کے ساحل پر اترا اور روما پہنچ گیا۔ یہ امداد بہت معمولی تھی، لیکن افواہ مشہور ہو گئی تھی کہ شہنشاہ کی فوجیں آرہی ہیں۔ بیلی ساریوس نے ان افواہوں سے فائدہ اٹھا کر دشمن کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ ایک مرتبہ نہایت سخت حملہ کر کے ان گاتھوں کو تتر بتر کر دیا، جو خونریز جان کا راستہ روکے بیٹھے تھے۔ غرض گاتھوں کو روما پر قبضہ جما لینے سے مایوسی ہو گئی تو انھوں نے صلح کی بات چیت شروع کر دی۔

وہ ایک اطالوی ترجمان کو ساتھ لے کر بیلی ساریوس کے پاس پہنچے اور کہا کہ لڑائی فریقین کے لیے مصیبت کا باعث بنی ہوئی ہے، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ صلح کی شرطیں طے ہو جائیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم شہنشاہ اور اس کے قوانین کا احترام کرتے ہیں۔ ہم نے اپنے ہاں رومی قانون ہی جاری رکھا ہے۔ بیلی ساریوس کو چاہیے کہ یہ حقائق شہنشاہ تک پہنچا دے اور جس مال غنیمت پر اب تک قبضہ ہو چکا ہے، وہ لے کر فوج واپس چلی جائے۔

بیلی ساریوس: آپ لوگوں کا اشارہ اس کی طرف ہے، جو میرے آقا کی سرزمین ہے اور اس مال کا ذکر کر رہے ہیں، جس کا اصل مالک میرا آقا ہے؟

گاتھ: ہم سسلی آپ کے حوالے کرتے ہیں۔ افریقہ پر قبضہ بحال رکھنے کے لیے سسلی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

---

[۱] BLOODY JOHN چونکہ یہ بڑا سخت اور خونریز سپہ سالار تھا، اس لیے یہ لقب پایا۔

بیلی ساریوس: میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور پورا جزیرہ برطانیہ آپ کو دیتا ہوں در میوں نے پشتوں سے اس جزیرے کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی، جو سسلی سے بہت بڑا ہے۔ دیکھیے میں آپ کا کوئی عطیہ معاوضہ ادا کیے بغیر قبول نہیں کر سکتا۔

گاتھ: آپ نیپلز اور کمپانیا[1] بھی لے لیں اور ہم سالانہ خراج بھی ادا کرتے رہیں گے۔

بیلی ساریوس: مجھے شہنشاہ کے املاک میں سے کوئی حصہ کسی کو دینے کا اختیار حاصل نہیں۔

آخر گاتھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم صلح کی گفتگو کے لیے اپنا وفد جسٹینین کے پاس بھیجتے ہیں۔ لہٰذا تین مہینے کے لیے جنگ ملتوی کر دی جائے۔ بیلی ساریوس نے یہ تجویز مان لی۔

---

[1] CAMPANIA اٹلی کا وہ صوبہ، جس کا مرکزی شہر نیپلز ہے۔

تیرھواں باب

ایران سے کشمکش کا خطرہ

غرض دسمبر ۵۳۷ء میں تین مہینے کے لیے جنگ ملتوی ہو گئی۔ ویٹجس نے اپنے سفیر جسٹینین کے پاس قسطنطنیہ بھیج دیے۔ بیلی ساریوس نے التوائے جنگ سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ امدادی فوجوں کی آمد کے لیے راستہ کھل گیا۔ غلّہ ٹائبر کے راستے روک ٹوک کے بغیر آنے لگا۔ گاتھوں نے جتنے قلعے خالی کیے، بیلی ساریوس نے اپنے سپاہی ان میں بٹھا دیے۔ گاتھوں نے احتجاج کیا کہ التوائے جنگ کی شرطیں توڑی جا رہی ہیں۔ بیلی ساریوس نے ان احتجاجوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ ویٹجس نے ایک موقع پر اپنے شمشیر زن پانی کی ٹوٹی ہوئی نالی کے راستے شہر میں بھیج دیے۔ وہ پھرتے پھراتے ایک تاریک جگہ پہنچے۔ اپنی مشعلیں روشن کیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اوپر رومی سپاہی کھڑے ان کی حماقت پر ہنس رہے تھے۔ گاتھوں کو اپنے بادشاہ پر سخت غصہ آیا، جس نے ان کی جانیں سخت خطرے میں ڈالیں۔ بیلی ساریوس کو دو پیغام مختلف مقامات سے ملے، جن کے باعث اس کی امیدیں تازہ ہو گئیں۔ ایک پیغام متاسنتھا کی طرف سے تھا، جو اپنے شوہر سے نفرت کی بنا پر ریونّا شہر رومیوں کے حوالے کرنے پر آمادہ تھی۔ دوسرا پیغام میلان کے اسقفِ اعظم کی طرف سے تھا، جس نے رومیوں کو ترغیب دی تھی کہ اپنے شہر کو گاتھوں کے قبضے سے نجات دلائیں۔ بیلی ساریوس نے سواروں کے دستے اِدھر اُدھر بھیجنے شروع کر دیے، جو جا بجا چھاپے مارتے۔ خونریز جانؔ وٹالین کا بھتیجا تھا۔ اسے تاکید کر دی گئی کہ جہاں جائے، تباہی پھیلائے، فصلوں پر قبضہ کرے، لیکن واپسی کا راستہ کھلا رکھے۔ جانؔ پیش قدمی کرتا ہوا رمنی[۱] پہنچ گیا، جو ایڈریاٹک کی مشہور بندرگاہ ہے۔ وہاں سے ریونّا صرف ایک روز کی مسافت پر تھا۔ ان یورشوں نے ویٹجس کی کمر توڑ دی۔ چنانچہ گاتھوں نے رات کے وقت اپنی چھاؤنیوں کو آگ لگائی اور اپنی جاگیروں، نیز اہل و عیال کے بچاؤ کے لیے ریونّا

۱؎ RIMINI ریونّا کے جنوب میں تھوڑے فاصلے پر ایڈریاٹک کی مشہور اطالوی بندرگاہ۔

روانہ ہوگئے۔ بیلی ساریوس نے ان کا تعاقب کرکے دریائے ٹائبر اور آینیو کے سنگم پر انھیں شکست دی۔ اینیو کے کنارے کی لڑائی بظاہر معمولی سی جھڑپ تھی لیکن اس سے یورپ کی تاریخ کے ایک نئے دور کا آغاز ہُوا۔ یوں رومہ کا محاصرہ ختم ہوگیا۔ آبنائے میسینیا کو عبور کرنے کے بعد مارچ ۵۳۸ء کے اواخر میں بیلی ساریوس کو اطمینان کا سانس لینا نصیب ہُوا۔ اب جنگ میں پیش دستی کا مختار وہ خود تھا۔

چنانچہ اس نے شہر سے نکل کر شمالی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ جانؔ نے نافرمانی کرتے ہوئے اپنے لیے خطرہ پیدا کر لیا تھا اور وہ گاتھوں کے نرغے میں آرہا تھا۔ بیلی ساریوس نے اس کے بچاؤ کا انتظام کیا اور گاتھوں کو ایک لمحے کے لیے بھی ستانے کی مہلت نہ دی۔ یہ حالات تھے، جب قاصدوں نے خبر پہنچائی کہ ایک بیڑا انکونا[۵۲] کی بندرگاہ میں داخل ہوگیا ہے۔ اس میں جسٹینین نے پانچ ہزار پیادہ فوج اور دو ہزار سوار کمک کے لیے بھیج دیے تھے۔ بیلی ساریوس نے ساحل پر اس بیڑے کا استقبال کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس امدادی فوج کا کمان دار نرسی تھا۔ ساتھ ہی شہنشاہ کا ایک خط تھا، جس میں نرسی کو ہدایت کی گئی تھی کہ "سلطنت کی بہبود کے لیے جو کچھ ضروری ہو" اس میں بیلی ساریوس کی فرمانبرداری کی جائے۔ بظاہر بیلی ساریوس کو مختارِ کُل رکھا گیا تھا، لیکن اسے احساس تھا کہ بہبودِ سلطنت کی قید لگا دی گئی ہے اور نرسی جب چاہے گا بہبودِ سلطنت کا عذر پیش کرتا ہُوا اس کا حکم ماننے سے انکار کر دے گا۔

نرسی نے آتے ہی یہ تجویز پیش کر دی کہ سابقہ فوج اور نئی فوج کو مل کر گاتھوں سے جنگ کرنی چاہیے تاکہ جلد سے جلد آخری فیصلہ ہو جائے۔ بیلی ساریوس جانتا تھا کہ یہ تجویز مہلک ہے۔ اس نے نرسی کو سمجھانا چاہا کہ لڑائی مناسب نہیں، البتہ گاتھوں کو بلا شرط حوالگی کے لیے مجبور کر دینا چاہیے۔ نرسی اصل حقیقت سمجھ نہ سکا۔ اس نے بیلی ساریوس سے کہا کہ آپ پہلے رمنی جائیں۔ جب جانؔ ہر خطرے سے محفوظ ہو جائے تو ویٹجس سے جنگ کریں۔ ان دونوں کا یہ باہمی اختلاف تباہی کا

---

۵۲ ANCONA یہ بھی ایڈریاٹک کے ساحل پر واقع ہے اور رومہ سے براہِ راست ایک سو تیس میل اور ریل کے راستے ایک سو اسّی میل ہے۔

پیش خیمہ ثابت ہُوا۔

اُدھر ایلپس کے درّوں سے برگنڈی کے وحشی قبائل کا سیل آنا شروع ہو گیا تھا۔ ویجیس نے قحط زدہ علاقوں کے گاتھوں سے امداد اور تخفیفِ محاصل کے جو وعدے کیے تھے، انھیں پُورا نہ کر سکا اور دو سال کے اندر ریونا سے گاتھوں کے اخراج پر یہ جنگ ختم ہو گئی۔

یہی زمانہ ہے جب وسطِ موسمِ گرما میں آسمان پر دُمدار تارا نمودار ہُوا۔ اس کا سر مشرقی جانب تھا اور دیکھنے والے کہتے تھے، یہ اپنے پیچھے لمبی آتشیں دُم چھوڑتا جاتا ہے۔ بعض کہتے تھے کہ اس کی شکل کٹار مچھلی کی سی ہے۔ جسٹینین نے اسقفِ اعظم سے اس ستارے کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ خدا کی قدرت سے آسمان زمین پر متوازن کھڑا ہے۔ ایک ستارہ اپنی جگہ چھوڑ چکا ہے۔ یہی سمجھنا چاہیے کہ یہ دیکھنے والوں کے لیے ایک نشان ہے، البتہ اس کے سعد یا نحس ہونے کے متعلق کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔ جسٹینین کے دل میں سوال پیدا ہُوا کہ اس نے نرسی کو اٹلی بھیج کر بیلی ساریوس پر نگرانی قائم رکھنے کا جو انتظام کیا ہے، آیا وہ درست ہے یا نہیں۔

اسی زمانے میں بیلی ساریوس نے اپنے ایک سرکش سالار قسطنطین کو پھانسی کا حکم دے دیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ قسطنطین نے ریونا سے نکلتے وقت ایک رومی امیر سے مرصّع خنجروں کی نہایت قیمتی جوڑی لے لی تھی اور طلب کرنے پر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ بیلی ساریوس غیر مصافی آبادی کے جان و مال کی حفاظت کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ اس نے خنجر واپس لینے چاہے تو قسطنطین نے جوشِ غیظ میں خود بیلی ساریوس کو زخمی کرنے کی کوشش کی۔ قسطنطین گرفتار ہُوا اور اسے موت کی سزا دی گئی۔ جسٹینین اس پر سخت خفا ہُوا کیونکہ وہ تو موت کی سزا منسوخ کر دینے کا خواہاں تھا۔

یکایک اطلاع ملی کہ بیلی ساریوس اطالوی دہقانوں کو فوجی تربیت دے رہا ہے اور اس نے اپنے بعض آزمودہ کار افسروں کو اسی کام کے لیے شمالی دیہات میں بھیج دیا ہے۔ جسٹینین جنگ جلد سے جلد ختم کرنا چاہتا تھا اور نرسی کو یہی تاکید تھی کہ جنگ جلد ختم کرائے۔ نرسی کو اصرار تھا کہ جنگ فوراً شروع کی جائے۔ بیلی ساریوس اس کوشش میں تھا کہ اہلِ ملک اس کی امداد کے لیے تیار ہو جائیں تاکہ جنگ بہ سہولت ختم ہو سکے۔ یہ حالات تھے، جب میلان کا حادثہ پیش آیا۔ برگنڈیوں اور گاتھوں نے میلان کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ بیلی ساریوس نے اپنے

دو کمانداروں کو حکم دیا کہ فوراً وہاں پہنچ کر محصورین کی امداد کریں۔ وہ لوگ چاہتے تھے کہ بیلی ساریوس کے بجائے نرسی سے حکم لے کر روانہ ہوں۔ اس طرح تاخیر ہوئی اور بر وقت امداد نہ پہنچ سکنے کے باعث محصورین نے ہتھیار ڈال دیے۔ وحشی حملہ آور شہر میں داخل ہوئے تو لوگوں کو بے دریغ قتل کیا یا گرفتار کر کے لے گئے۔ حاکم شہر کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور انھیں کتوں کے آگے ڈال دیا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر وٹیجس نے لیونا میں فوج کی فراہمی شروع کر دی۔ آخر جسٹینین کو فیصلہ کرنا پڑا کہ نازک حالات کا مقابلہ نرسی نہیں، صرف بیلی ساریوس کر سکتا ہے اور حکم دے دیا کہ پوری فوج کا مختارِ کُل نرسی نہیں، صرف بیلی ساریوس ہے۔ وہ جو مناسب سمجھے، کرے۔ نرسی قسطنطنیہ روانہ ہو گیا اور اس کے ساتھ شہنشاہی فوج کے بعض وحشی سپاہی بھی جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ جب ان کے لیے جہاز مہیا نہ ہوئے تو وہ پیدل چل پڑے اور راستے میں دیہات کو لوٹ لوٹ کر گزارہ کرتے رہے۔

ادھر ہن اور مختلف وحشی اقوام سلطنت کی سرحدوں پر خطرہ بن کر منڈلانے لگیں۔ جسٹینین نے اپنے خالہ زاد بھائی جرمانوس کو ان کی روک تھام کے لیے بھیج دیا۔ مشرقی صحراؤں میں تدمر کو ایک بیرونی چوکی اور تجارتی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں سے تاجر چین کا ریشم اور عرب کے بخور لے کر پہنچے تو انھوں نے ایرانیوں کے پایۂ تخت طیسفون[۱] کے متعلق خاصی خطرناک خبریں پہنچائیں یعنی وٹیجس نے دو مرتبہ سفیر شہنشاہ ایران کے پاس بھیجے تھے۔ دو راہب مقدس مقامات کی زیارت کے بہانے اٹلی سے قسطنطنیہ ہوتے ہوئے طیسفون پہنچے اور شہنشاہ ایران سے کہا کہ جسٹینین مغربی سمت میں خواہ مخواہ درپے جنگ ہے اور برابر طاقت بڑھاتا چلا جا رہا ہے کیونکہ مشرقی جانب

---

[۱] CTESIPHON یہ شہر دجلہ کے کنارے بغداد سے کوئی پچیس میل جنوب مشرق میں ہے۔ یہاں پہلے اشکانیوں کا محل تھا جہاں موسم گرما بسر کرتے تھے۔ پھر سلوکس نے سلوکیہ آباد کیا۔ ساسانیوں نے اس پر قبضہ جمایا تو دارالحکومت بنا لیا۔ نوشیروان نے ایک بڑا محل بنوایا تھا، جس کی عظیم الشان محراب تھی اور اس کے آثار اب تک باقی ہیں۔ عرب اسے طاقِ کسریٰ کہنے لگے۔ عربوں نے اس مقام کا نام مدائن رکھا جو مدینہ کی جمع ہے یعنی بہت سے شہر۔ چونکہ یہاں متعدد شہر آباد ہو چکے تھے، اس لیے مدائن موزوں نام سمجھا گیا۔ نوشیرواں کے محل کو ایوان کسریٰ یا ایوانِ مدائن بھی کہتے تھے۔ خاقانی نے اس کا مرثیہ ایوانِ کسریٰ ہی کے نام سے لکھا ہے۔

شہنشاہ ایران سے اس کی صلح ہو چکی ہے۔ پھر کیا شہنشاہ ایران خاموش بیٹھا رہے گا، یہاں تک کہ کم اصل جسٹینین روم کی پرانی قوت بحال کر کے ایران سے انتقام لے یا شہنشاہ جلد از جلد رومی سلطنت کی مشرقی سرحد پر حملہ آور ہوگا، جہاں حفاظت کا کوئی سامان نہیں۔

تاجروں کو بالکل معلوم نہ تھا کہ شہنشاہ ایران نے کیا فیصلہ کیا، تاہم جسٹینین کو خیال پیدا ہو گیا کہ اٹلی میں جنگ بلا تاخیر ختم ہو جانی چاہیے۔ وٹیجس اور گاتھوں کو ماتحت اور حلیف بنا کر رکھنا چاہیے تاکہ وہ سرحد پار کے وحشیوں کے خلاف دفاعی مورچے کا کام دیں۔ بیلی ساریوس کو فوج کے ساتھ قسطنطنیہ آجانا چاہیے تاکہ ایرانیوں کے خلاف بلا تاخیر پیشقدمی کی جا سکے۔ اُدھر اٹلی میں یہ حالت تھی کہ کسان فصلیں نہیں بو سکے تھے۔ انھیں کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ وٹیجس ریونا میں بند تھا۔ اسے بھی غذائی قلت کا تلخ تجربہ ہو رہا تھا۔ اس نے جو غلّہ جمع کیا تھا، وہ غالباً متاسنتھا کے ملازموں نے جلا دیا تھا کیونکہ متاسنتھا کو اپنے شوہر سے سخت نفرت تھی۔

اِس اثنا میں جو کاریگر نئی چیزیں تیار کر رہے تھے، انھوں نے رال، گندھک، چُونے یا قلمی شورے کو ملا کر ایک تیز آتشگیر مادّہ تیار کر لیا، جس کا نام "آتشِ میڈیا"[ل] رکھا گیا۔ جسٹینین نے سرحدوں کی حفاظت کے لیے جگہ جگہ چوکیاں قائم کر دی تھیں۔ ان کی صورت یہ تھی کہ خاصی بلندیوں پر مقام دیکھ کر پتھروں کا ایک حلقہ تیار کر لیتے۔ اس میں ایک یا دو بُرج بنا دیتے۔ جب کوئی خطرہ پیش آتا تو سپاہی اور آس پاس کے لوگ بال بچّوں اور مویشی کو لے کر اس حلقے میں چلے جاتے اور بُرجوں پر سے دشمنوں کا مقابلہ کیا جاتا۔ اسی زمانے میں سنہ بدلا گیا۔ پہلے روم کی تاسیس سے برسوں کا حساب کیا جاتا تھا، اب فیصلہ کر لیا گیا کہ سنین کا حساب حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ ۱۲۹۵ رومی کے بجائے اعلان کر دیا کہ اسے ۵۴۰ء سمجھا جائے۔

مشرق کے بحری اور برّی راستوں کے کھُل جانے سے ان ممالک کا ساز و سامان قسطنطنیہ پہنچنے لگا۔ ساتھ ہی بیرونی ملکوں کے کاریگر اور صنّاع بھی آئے۔ جسٹینین کے شوقِ تعمیر نے ان کی ہمّت افزائی کی اور قسطنطنیہ نئے فنون کا مرکز بن گیا۔ یہ فنون ابھی اہلِ حرفہ ہی کے ہاتھ میں تھے جن کی اپنی اپنی پنچایتیں تھیں۔

جسٹینین اس کوشش میں مصروف تھا کہ مشرقی اور مغربی کلیساؤں کا تفرقہ ختم کر کے تمام

[ل] MEDEA'S FIRE

مذہبی مناقشے روک دے۔ اس نے رومہ کے کلیسا کو مشرقی آرتھوڈکس کلیسا پر ترجیح دی تھی، لیکن اس کی ملکہ تھیوڈورا بدستور مشرقی آرتھوڈکس کلیسا کی محافظ بنی ہوئی تھی۔ وہ جسٹینین سے بھی کہتی ملکہ التجائیں کرتی کہ مذہب میں دخل نہ دیجیے۔ لوگ مذہب میں جس جس مسلک پر قائم ہیں، انھیں قائم رہنے دیجیے۔ ملکہ نے اپنا پہلا مکان راہبوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ جسٹینین نے اس کے لیے ایک نیا عالی شان محل تعمیر کرایا جس کا نام "ہیرن[۱]" (مقدس) رکھا گیا۔ یہاں بھی وہ ادھر اُدھر سے آئے ہوئے راہبوں اور مذہبی آدمیوں کو پناہ دیتی رہی۔ جسٹینین نے ایک اسقف کو معزول کر دیا، پھر اس کے لیے جلاوطنی کی سزا تجویز ہوئی۔ تھیوڈورا نے اسے بھی پاس بُلا لیا اور وہ اس کے محل کے تہ خانوں میں بہ اطمینان زندگی بسر کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ جسٹینین اور تھیوڈورا کے درمیان مذہبی معاملات پر اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی جا رہی تھی۔ اُدھر جسٹینین کا مشیرِ خاص اور ناظمِ خزانہ کیپاڈوشیا کا باشندہ جان اس کی دریادلی سے نالاں تھا جس کی بدولت عالیشان عمارتیں اور محلات تو بن رہے تھے، لیکن خزانہ خالی ہو رہا تھا۔ جسٹینین نے اس کے مشورے سے سلطنت کا مالیہ بڑھانے کے لیے کئی نئے ٹیکس لگائے اور بہت سے مرسوم مصارف کو ختم کر دیا۔

جنوری ۵۴۲ء میں شہنشاہ ایران کی فوج مشرقی سرحد پر جمع ہونے لگی۔ سفیر بھیجے گئے کہ کسی طرح شہنشاہ کو پیش قدمی سے روکا جا سکے۔ اُدھر ویٹجس کو ریونا میں یہ پیغام بھیجا گیا کہ مستقل صلح کی صورت میں دریائے پو کے شمال میں گاتھوں کے لیے ایک قومی ریاست کا انتظام کیا جا سکتا ہے

۱۔ HIERON

چودھواں باب

اٹلی کا فیصلہ اور مشرقی محاذ کی حالت

"عارفؔ یوحنا کا مکاشفہ"¹ عہد نامۂ جدید کی آخری کتاب ہے۔ اس میں مرقوم ہے کہ "کتاب کی پہلی مُہریں توڑی گئیں تو چار گھوڑے نمودار ہوئے، جن پر چار سوار تھے۔ پہلا سوار، جس کا گھوڑا اسفید تھا، کمان لیے ہوئے نکلا۔ اسے ایک تاج دیا گیا اور وہ فتح کرتا ہوا بڑھا کہ اَور بھی فتح کرے۔ دوسرے سوار کا گھوڑا سُرخ تھا، اُسے ایک بڑی تلوار دی گئی تاکہ لوگوں کو وسیع پیمانے پر قتل کرے۔ تیسرے سوار کا گھوڑا سیاہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں ترازو تھی، جس کے پلڑوں میں گیہوں، تیل، جَو اور شراب تھے اور ان جنسوں کی نقد کے عوض تُل رہے تھے۔ آخری سوار کا گھوڑا زرد سا تھا اور سوار کا نام "موت" رکھا گیا۔

"مکاشفہ" پڑھنے والوں کا خیال تھا کہ اس کا خاص مطلب ہے۔ مثلاً فتح کا نتیجہ لازماً جنگ ہوتا ہے۔ جنگ کے نتیجے میں قحط پڑتا ہے۔ پھر خوفناک وبا پھیل جاتی ہے۔ جن مصوّروں نے اس کتاب کو تصویروں سے آراستہ کیا تھا، انھوں نے چند شکلیں بنا دیں۔ مثلاً پہلے ایک بادشاہ بنایا، پھر ایک خود پوش سپاہی، پھر ایک بھوکا آدمی، پھر محض ہڈیوں کا ڈھانچا۔ ان کے نزدیک عارف جان کے الفاظ میں کوئی رموز معنی نہ تھے، البتہ ان پر بدقسمتی کا نزول ہوتا تھا تو ترتیب عموماً وہی ہوتی تھی، جو تصویروں میں دکھائی گئی۔

موسمِ بہار کے اوائل میں یہ خبر پہنچی کہ مشرقی محاذ کا سالارہ آرمینیا میں مارا گیا۔ ہُن سیل کی طرح سرحدیں توڑ کر تھریس اور درۂ دانیال پر پہنچے اور آبنائے عبور کر کے ایشیا میں داخل ہوئے اور مختلف دیہات میں آگ لگا دی۔ تھیوڈورا کے محل سے وہ آگ صاف نظر آ رہی تھی۔ ایران کا شہنشاہ خسرو (نوشیرواں) رومی سرحد کی طرف بڑھتا ہوا دریائے فرات کے میدانوں میں پہنچ گیا

---

¹ REVELATION OF ST. JOHN

تھا اور سرحدی رومی قصبوں سے اس نے تاوان وصول کر لیا تھا۔ جو صحرائی سڑک تدمر سے ملتی تھی اُس پر وہاں کے خانہ بدوش قبیلے مسلط ہو گئے تھے۔

جسٹینین کو اب بھی امید تھی کہ ایران سے جنگ روکی جا سکے گی۔ اُدھر گاتھوں کی طرف سے امید افزا پیغام مل گیا تھا یعنی یہ کہ وٹیجس دریائے پو کے پار ایک حکومت بنانے اور جسٹینین کے نائب کی حیثیت میں زندگی بسر کرنے پر تیار تھا۔ بیلی ساریوس نے یہ معاہدہ قبول نہ کیا۔ اس پر سب حیران رہ گئے۔ گاتھوں کے دل میں اپنے لیڈر وٹیجس کے متعلق شبہات پیدا ہو گئے۔ پھر یہ اطلاع ملی کہ گاتھ بیلی ساریوس کو مغرب میں شہنشاہ بنا لینے پر آمادہ ہیں اور بیلی ساریوس نے یہ پیشکش منظور کر لی ہے۔ قسطنطنیہ کی وزارت کے لیے یہ اطلاع برق خاطف سے کم نہ تھی۔ انھوں نے سوچا کہ گاتھ بیلی ساریوس کا احترام کرتے ہیں۔ اٹلی کے باشندوں نے اس کی نگرانی میں ہر قسم کی آسائشیں حاصل کیں اور اس نے رومہ کو محفوظ رکھا۔ سسلی پر اس کا قبضہ ہے۔ بیڑا اس کے پاس ہے اور افریقہ اسے فوراً شہنشاہ تسلیم کرے گا۔ جسٹینین نے وزارت کو یاد دلایا کہ بیلی ساریوس میرے لیے وفاداری کا حلف اُٹھا چکا ہے۔

اُدھر بیلی ساریوس نے اپنے تمام رفیقوں اور مشیروں کو جمع کیا اور کہا کہ اگر پورا ملک اٹلی شہنشاہ کو مل جائے، ریونا کے خزانے اس کے ہاتھ آ جائیں اور گاتھ سر تسلیم خم کر دیں تو کیا تم اس صورتِ حال کو تمام دوسری صورتوں پر ترجیح دو گے یا نہیں؟ اور یہ سب کچھ ایک بھی جان کا نقصان کیے بغیر حاصل ہو سکتا ہے۔ سب نے بالاتفاق بیلی ساریوس کی تائید کی۔

غرض بیلی ساریوس کو شہنشاہ بنا لینے کا فیصلہ ہو گیا۔ اس نے صرف ایک شرط عائد کی اور وہ یہ کہ اطاعت کا حلف ریونا میں وٹیجس اور امراء کی مجلس شوریٰ کے روبرو لیا جائے گا۔ چنانچہ وہ اپنے سواروں کے ساتھ ریونا پہنچا۔ شہر کے دروازے کھلے تھے اور اندر گاتھ بھرے ہوئے تھے۔ بیلی ساریوس نے گاتھ سرداروں کو بُلایا اور کہہ دیا کہ آپ لوگ آزادانہ گھروں کو لوٹ جائیں۔ چنانچہ بہت سے روانہ ہو گئے۔ بیلی ساریوس آگے بڑھا۔ اس نے خزانے اور شاہی محل پر پہرے لگا دیے۔ پھر گھوڑے سے اُترا اور باقی ماندہ گاتھ سرداروں سے کہا کہ تم سب جسٹینین کے اسیر ہو۔ وہی تنہا شہنشاہ ہے اور بیلی ساریوس بھی اسی کا خدمت گار ہے۔ اس طرح اٹلی میں لڑائی ختم ہوئی

اور بیلی ساریوس نے مزید ایک قطرۂ خون بہائے بغیر پورا ملک لے لیا۔ بندرگاہوں میں غلے کے جہاز ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان سے غلہ اُتار کر آبادی میں تقسیم کر دیا گیا۔ اسی دوران میں بیلی ساریوس کو قسطنطنیہ واپس جانے کا حکم ملا اور وہ بادلِ ناخواستہ روانہ ہو گیا۔

اس اثنا میں نوشیرواں آگے بڑھتا ہُوا انطاکیہ پہنچ گیا۔ جاسوسوں نے نوشیرواں کو یقین دلا دیا تھا کہ انطاکیہ مشرقی رومی سلطنت کے شہروں میں دولت اور وسعت کے لحاظ سے اوّل درجے کا ہے۔ وہاں تربیت یافتہ سپاہ ہے ہی نہیں۔ آبادی جشن منانے اور عیش اڑانے کے سوا اور کچھ جانتی ہی نہیں۔ نوشیرواں دس ہنڈرڈ ویٹ سونے (بیس لاکھ ڈالر یا ایک کروڑ روپیہ) پر صُلح کرنے کے لیے تیار تھا۔ ایک شہری نے مشورہ دیا کہ رقم ادا کر دینی چاہیے۔ گرجے کے اسقف نے بہ اصرار کہا کہ یہ تجویز ضرور منظور کر لی جائے۔ سفیر کی رائے بھی یہی تھی، لیکن اہلِ انطاکیہ نے فصیل پر سے تیر برسانے شروع کر دیے۔ نوشیرواں نے حکم دے دیا کہ شہر پر ہلہ بول دیا جائے۔

شہر کے عقب میں پہاڑی تھی، جس کی وجہ سے لوگوں کا خیال تھا کہ شہر بہت محفوظ ہے، لیکن جرمانوس یہاں آیا تھا۔ اُس نے بتا دیا تھا کہ یہ پہاڑی اصل میں شہر کے لیے خطرے کا باعث ہے۔ تاہم اہلِ شہر نے تختے وغیرہ لگا کر بچاؤ کا انتظام کیا۔ ایرانیوں نے پہاڑی کی جانب سے حملہ کیا۔ شہر والوں نے مدافعت بھی کی، لیکن لکڑی کے شہتیروں اور تختوں کی مدد سے جو ہنگامی دفاعی انتظامات کیے گئے تھے بہت جلد جواب دے گئے۔ اہلِ شہر میں سراسیمگی پھیل گئی اور انھوں نے شہر کے پھاٹک کھول دیے اور ایرانیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ ایرانیوں نے آبادی کے بہت بڑے حصّے کو قید کر لیا اور شہر کی عمارتوں کو آگ لگا دی۔ دیکھنے والے لوگ کہتے ہیں، جو آگ کے بعد اس منظر پر سب حیران رہ گئے کہ تمام دفاعی استحکامات شہر کے اردگرد بالکل محفوظ تھے۔

جسٹینین نے ایک قاصد بھیج دیا کہ نوشیرواں زیادہ سے زیادہ رقم لے کر نیا عہدنامہ کر لے۔ نوشیرواں نے جواب دیا کہ دوستی روپیہ دے کر نہیں خریدی جا سکتی۔ روپیہ خرچ ہو جائے گا تو دوستی بھی ختم ہو جائے گی البتہ ہر سال رقم دینے کا وعدہ کرو تو دوستی قائم رہ سکتی ہے۔ سفیروں نے نئی ہدایات حاصل کرنے کے لیے تمام تفصیلات قسطنطنیہ پہنچا دیں۔ اس اثناء میں انطاکیہ کے

اسیر مدائن (قطیسیفون) پہنچ گئے، جہاں نوشیرواں نے ان کے لیے ایک الگ قصبہ تعمیر کرایا، اس کا نام "رومّ" رکھا گیا، لیکن وہ "انطاکیۂ خسرو" کے نام سے مشہور ہُوا۔

انطاکیہ کی نصف آبادی غلام بن چکی تھی۔ شہر جل چکا تھا، تاہم جسٹینین نے حکم دے دیا کہ شہر ازسرِنو تعمیر کیا جائے۔ دریائے عاصی کا رُخ اس طرح بدلا جائے کہ وہ انطاکیہ کے لیے ایک خندق کا کام دے۔ شہر پناہ کا حلقہ کم کر دیا جائے۔ اس نے سال بہ سال رقم دینے سے انکار کر دیا اور مشرق میں جنگ کے لیے تیار ہو گیا، جس سے وہ بچنا چاہتا تھا۔ اس غرض کے لیے بیلی ساریوس کو قسطنطنیہ بُلا لیا گیا۔

بیلی ساریوس قسطنطنیہ پہنچا تو آبادی نے اس کا پُرجوش استقبال کیا۔ وہ اپنے جہازوں میں ایسی چیزیں لایا تھا، جو بہ ظاہر ناقابلِ یقین تھیں۔ مثلاً "یونا" کا بے مثال خزانہ، وہ رومی پرچم، جو پہلی لڑائیوں میں گاتھوں نے چھینے تھے۔ شہنشاہ ویلنز کا سنہری تاج جو ایڈریانوپل میں گاتھوں کے ہاتھوں قتل ہُوا تھا۔ ویٹجس اور متھاسنتھا بھی ساتھ تھے۔ بیلی ساریوس پیٹر کو بھی قید سے چھڑا لایا تھا، جسے جسٹینین نے وکیل بنا کر گاتھوں کے پاس بھیجا تھا۔ شہریوں نے اظہارِ جوش و خروش میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی، البتہ جسٹینین نے زیادہ گرمجوشی کا اظہار نہ کیا۔ شہریوں سے کہا کہ حکومت کی امداد کے لیے مزید کوشش کرو اور بیلی ساریوس کو فوراً مشرقی محاذ پر بھیج دیا۔ وہ دریائے فرات کے میدان میں پہنچا اور کمانداروں سے ملاقات کی تو صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے شہنشاہ نے کچھ بتایا نہیں اور میں حالات سے بے خبر ہوں۔ ہمارا اصل مقصد یہ ہے کہ حملے کو روک دیں۔ اس کی جو تدبیر مناسب نظر آئے، اس پر غور کریں۔

رفیقوں نے بیلی ساریوس کو بتایا کہ نوشیرواں کو روکنا ممکن نہیں۔ وہ خود گھوڑے پر سوار ہو کر مسلح لشکر کے ساتھ ہر مقام پر جاتا ہے اور اس کے زرہ پوش سوار بیلی ساریوس کے زرہ پوش پیادوں کے لیے نمونہ ہیں۔ بیلی ساریوس افریقہ کی فتح میں مصروف تھا تو نوشیرواں نے جسٹینین کو پیغام بھیجا تھا کہ ونڈالوں سے جو مالِ غنیمت ہاتھ آیا ہے، اس میں ہمارا بھی حصّہ ہے۔ اگر ہم لڑائی سے باز نہ رہتے تو آپ کو افریقہ کی تسخیر کا موقع کیونکر ملتا؟ انطاکیہ کے قریب افامیہ ایک مقام تھا۔ نوشیرواں نے اس سے رقم وصول کی تو ایک جواہر نگار غلاف بھی ہاتھ آیا، جس میں

عیسائیوں نے ایک تبرک محفوظ کر رکھا تھا۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ اُس صلیب کی لکڑی کا ایک ٹکڑا ہے، جو ان کے خیال کے مطابق حضرت مسیحؑ سے منسوب تھی۔ نوشیرواں نے غلاف لے لیا اور تبرک یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ تم لوگوں کے نزدیک بہت قیمتی ہوگا، میرے نزدیک قیمتی نہیں۔

بیلی ساریوس کو جلد ہی یہ اندازہ ہوگیا کہ جس طرح دونوں شہنشاہوں کے مزاج ایک دوسرے سے مختلف تھے اسی طرح ان دونوں کی قلمرو کے حالات بھی مختلف تھے۔ ساسانی سلطنت ایک نشاۃ ثانیہ کے ثمرات سے بہرہ مند تھی۔

قسطنطنیہ میں غذائی جنسوں کے لیے بڑی محنت و مشقت کرنی پڑتی تھی۔ ساسانی سلطنت میں اشیا کی فراوانی تھی، نوشیرواں کا سفری خیمہ زرتار پردوں سے مزّین تھا۔ مدائن کے قصر میں اس کے شہ نشین پر جو قالین بچھتا تھا، وہ زمرّدوں سے یوں مرصّع تھا کہ معلوم ہوتا تھا، نہایت عمدہ سبزہ لہلہا رہا ہے۔ بیچ میں موتیوں کی لڑیاں ایسے طریقے پر آراستہ کی گئی تھیں، جیسے پانی کی نہریں بہ رہی ہوں۔ اسیرانِ انطاکیہ کے لیے دجلہ کے کنارے جو نئی بستی بسائی گئی تھی، اس میں کپڑا بننے کی ایسی کھڈّیاں لگا دی گئی تھیں، جن پر بہت کم محنت صرف ہوتی تھی اور کپڑا اعلیٰ درجے کا بنا جاتا تھا۔ ان کے مکانوں میں ایسے مینار بھی بنا دیے گئے تھے، جن سے محض ٹھنڈی ہوا ہی مکانوں میں داخل نہ ہوتی تھی بلکہ ہوائی چکیاں بھی چلتی تھیں۔ تاہم نوشیرواں اور جسٹینین میں سے آخرالذکر ارادے کا زیادہ پختہ آدمی تھا۔ اسی پختگی کی بدولت اس نے بحیرۂ روم کے سواحل پر اقتدار قائم کر لیا تھا، لیکن سوال یہ تھا کہ آیا براعظم ایشیا کی بہ درجہا وسیع افواج کے مقابلے میں اس زمیں بند سمندر کی حفاظت کی جا سکتی ہے؟

ایک مرتبہ ایران کے زبردست بادشاہ زرکسیز (گشتاسپ) نے اپنی فوجیں مغربی جانب ایتھنز تک پہنچا دی تھیں، لیکن سیلمیس[1] کی جنگ میں شکست کے باعث بحیرۂ روم پر اقتدار کا منصوبہ ختم ہوگیا۔ پھر سکندر اپنی فوجیں ہندوستان کے پہاڑوں تک لے آیا اور جہاں گیا،

---

[1] SALAMIS یہاں یونان اور زرکسیز کے درمیان نہایت خوفناک بحری جنگ ۴۸۰ق م میں ہوئی جس میں زرکسیز نے سخت شکست کھائی۔

اپنے نام پر نوآدیاں قائم کرتا رہا۔ صرف ایک ایسی نوآبادی (اسکندریہ، مصر) کے سوا تمام نوآبادیاں ایشیا کے انسانی مدوجزر میں غرق ہوگئیں، البتہ یونانی فنون باختر کے معبدوں کے لیے زینت بنے رہے اور ان کا دائرۂ اثر چین تک پہنچ گیا۔ اگرچہ سکندر یونانیوں اور ایرانیوں کو ملا کر عالمی سلطنت پیدا نہ کرسکا، تاہم افراد و فنون کے درمیان وہ امتزاج شروع ہوگیا، جو عہدِ یونانیت کا نمایاں پہلو ہے۔ پھر رومیوں کی پیش قدمی شروع ہوئی اور پومپی نے قفقاز کی بلندیوں سے بحیرۂ قزوین کا نظارہ کیا۔ اس کے بعد مشرق سے مذاہب کی لہر رومی دُنیا میں پہنچی اور ایک نیا امتزاج شروع ہُوا، جسے مسیحیت کے ظہور و عروج نے روک دیا۔ آخر مسیحی سپاہیوں اور پارتھی آتش پرستوں کے درمیان ایک پختہ سرحد قائم ہوگئی، جس کے آثار اب تک نظر آتے ہیں۔ شاید قسطنطینِ اعظم نے اسی لیے دارالحکومت مشرق میں قسطنطنیہ منتقل کرلیا تھا تاکہ اس سرحد سے قریب ہوجائے۔ اُدھر ایران کے ساسانی بادشاہوں نے اپنا مرکز مغربی جانب طیسیفون میں منتقل کرلیا۔

اس سلسلے کی آخری کڑی یہ ہے کہ مختلف مسیحی فرقے مثلاً نسطوری قسطنطنیہ میں باغی قرار پائے تو انھوں نے ایرانی شہنشاہوں کے پاس پناہ لی نسطوری کاروانی شاہراہوں کے ساتھ ساتھ سرحدِ چین کے صحرائی علاقوں تک پھیل گئے۔ جسٹینین کے دل پر ان تمام چیزوں کا اثر تھا۔ جب اس نے ایتھنز کی قدیم درسگاہیں بند کی تھیں تو وہاں کے سات عظیم القدر معلّم ایران پہنچ گئے تھے تاکہ ارسطو کی اخلاقیات کے متعلق نوشیرواں سے مناظرے کریں۔ نصیبین کی نسطوری درس گاہ کے ایک معلّم پولوس ایرانی نے نوشیرواں کو تعلیم دی تھی اور ارسطو کی تصانیف کے مختلف حصّوں کا ایرانی میں ترجمہ کیا تھا۔ وہی پولوس نصیبین کے اسقف کی حیثیت میں اپنے عقیدے کے مطابق علی الاعلان بحث و مناظرے کے لیے قسطنطنیہ پہنچ گیا۔

ان تمام معاملات نے جسٹینین کی مشرقی پالیسی پر اثر ڈالا، جس کا مُدعا یہ تھا کہ ایران سے مستقل صلح ہوجائے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں سلطنتوں کو شمال کے وحشیوں کی طرف سے یورشوں کا خطرہ لگا ہُوا تھا۔ نوشیرواں میں قوت کا مقابلہ قوت سے کرنے کی صلاحیت جسٹینین کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ اس نے سفید فام ہنوں کو شکست دے کر قفقاز کے درے اپنی نگرانی میں لے لیے تھے اور اقرار کرلیا تھا کہ دروں کی حفاظت کروں گا۔ پھر اس نے معاہدہ توڑ کر جنگ

شروع کر دی۔

اس سلسلے میں کشمکش و نزاع کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ اہل قسطنطنیہ ایران کے جنوب و شمال کے بحری اور برّی تجارتی راستوں پر پھیلتے چلے جا رہے تھے۔ اس سے پہلے ایران کے تاجر مشرقی اور مغربی تجارت کے لیے واسطہ بنے ہوئے تھے۔ وہ چین سے ریشم اور عرب سے بخور قسطنطنیہ پہنچاتے۔ علاوہ بریں مسالے، زعفران اور زندگی کے دوسرے تعیّشات بھی ایرانی تاجروں ہی کے ذریعے سے قسطنطنیہ پہنچتے۔ اب جسٹینین کے بحر پیماؤں نے نئے راستے تجویز کر لیے تھے۔ چنانچہ جنوبی عرب کے حمیریوں سے دوستی کا معاہدہ کر کے وہ عرب کے جنوبی ساحل پر پہنچ گئے اور وہاں سے ہندوستان کی جانب جہاز رانی شروع کر دی۔ شمالی جانب جسٹینین نے بحیرۂ اسود کے مشرقی کنارے پر پیٹرا[1] نام بندرگاہ تعمیر کرائی اور مسیحی تاجروں نے قفقاز کے اوپر سے چکر کاٹتے ہوئے ریشم کی تجارت کی شاہراہوں سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لازی قبیلے نے نوشیرواں سے شکایت کی رومیوں نے ہم پر ایک گورنر مقرر کر دیا ہے، جو کہتا ہے کہ تجارت کا سلسلہ بڑھاؤ۔ انھیں حالات کی بنا پر نوشیرواں نے انطاکیہ کو لوٹا تھا۔ پھر ۵۴۱ء کے موسم بہار میں وہ لاؤ لشکر لے کر رومیوں کی نئی بندرگاہ کی طرف بڑھا اور فصیلوں کو سرنگوں کی مدد سے منہدم کر کے اس پر قابض ہو گیا۔ اس اثنا میں اطلاع ملی کہ بیلی ساریوس تطیسیفون کی جانب پیش قدمی کر رہا ہے۔ اس وجہ سے نوشیرواں کو واپس آنا پڑا۔

---

[1] PETRA

پندرھواں باب

نوشیرواں کی مراجعت اور طاعون و قحط

بیلی ساریوس کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا کہ نوشیرواں کی پیشقدمی روکے۔ اس کے پاس صرف اٹھارہ ہزار فوج تھی، حالانکہ نوشیرواں کو دریائے فرات کے عبور سے روکنے کے لیے کم از کم ایک لاکھ فوج درکار تھی۔ بیلی ساریوس نے عجیب تدبیر اختیار کی۔ وہ چھوٹے چھوٹے سرحدی شہر مسخر کرتا لیا۔ کوئی مستحکم مقام راستے میں آجاتا تو اسے چھوڑتا ہُوا آگے بڑھ جاتا کہ دیکھنے والوں کو اندازہ ہو کہ وہ جلد سے جلد قطیسیفون پہنچ جانا چاہتا ہے۔ رومی اطمینان سے ایک جگہ بیٹھے تھے۔ ایران کے زرہ پوش سواروں نے ان پر تیز و تند حملہ کیا تو گاتھوں نے برچھیوں سے تباہی پھیلادی۔ بیلی ساریوس نے آتش پرست اسیروں کا بہت بڑا قافلہ قسطنطنیہ بھیج دیا۔ نوشیرواں غیظ و غضب کا پیکر بن کر نمودار ہُوا تو رومی فوج دریائے فرات کو پار کر کے اس طرح غائب ہوگئی، گویا کبھی پہنچی ہی نہ تھی۔

پیٹرا کا چھن جانا جسٹینین کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ بیلی ساریوس کو قسطنطنیہ بلایا گیا۔ وہاں اس نے تمام حالات صاف صاف بیان کر دیے۔ مثلاً گاتھ اور ونڈال صحرا کی گرمی سے تنگ ہیں۔ رسد کی گاڑیوں میں بیمار سپاہی بھرے رہتے ہیں۔ بے پروا مغربی جنگجو گاتھ اور ونڈال، عربوں اور ارمنیوں پر بھی خنجر آزمائی میں متامل نہیں ہوتے، جو رومیوں کی حفاظت پر بھروسا رکھے بیٹھے ہیں۔ پیش قدمی کے لیے بیلی ساریوس کو اپنے مسیحی عرب حلیف حارث پر بھروسا کرنا پڑتا تھا۔ سب سے زیادہ خطرہ اس عجیب و غریب بخار نے پیدا کر دیا ہے، جس میں بے شمار آدمی مبتلا ہوگئے۔ یہ وبائی طاعون کی ابتدائی علامتیں تھیں، جو مصر سے چل کر فوجوں کے ذریعے سے جگہ جگہ پھیلا۔

۵۴۲ء میں ایرانیوں نے یروشلم کا قصد کر لیا۔ نوشیرواں کا خیال تھا کہ رومی اس شہر کی حفاظت ضرور کریں گے۔ پہلے شہنشاہوں نے یروشلم کے استحکامات بہت اعلیٰ پیمانے پر قائم کر رکھے تھے۔ جسٹینین نے ایرانیوں کے ساتھ صلح پر بھروسا کرتے ہوئے فوج وہاں سے ہٹالی تھی۔ اس نے حضرت مریمؑ کے نام پر ایک نہایت عمدہ عمارت بنادی۔ زائروں کے راستوں پر جگہ جگہ کنوئیں کھدوا دیے

قیام گاہیں بنوادیں اور مسیحؑ کی ایک زیارت نابلس میں بھی بن گئی، لیکن سارے فلسطین میں حفاظت کے لیے کوئی فوج نہ رکھی۔

بیلی ساریوس چوکیوں میں گھوڑے بدلتا ہوا انتہائی تیزی سے واپس آیا۔ راستے میں اسے اطلاع ملی کہ رومی فوج بہ مقام ہیرڈپولس[1] دامن کوہ میں جمع ہوگئی ہے۔ ہیرڈپولس الرُوحا اور انطاکیہ دونوں کے راستوں کی حفاظت کرتا تھا۔ وہ خود گاتھوں کو لے کر شام کے بڑے میدان میں پہنچ گیا کیونکہ اسے یقین تھا، ایرانی اسی طرف سے یروشلم پر پیشقدمی کریں گے۔ اب دریائے فرات بیلی ساریوس اور نوشیرواں کے درمیان حائل نہیں رہا تھا کیونکہ نوشیرواں دریا عبور کرکے آگے بڑھ آیا تھا۔ بیلی ساریوس نے ایسی روش اختیار کی، گویا وہ جنگ کے لیے تیار ہے۔ اس نے سواروں کا ایک دستہ دریا کے پار مشرقی جانب بھیج دیا تاکہ دشمن کو خیال ہو، بیلی ساریوس عقبی جانب سے حملہ کرانا چاہتا ہے۔ نوشیرواں تذبذب میں پڑگیا۔ اُس نے اپنے دبیرِ خاص کو سفیر بناکر بیلی ساریوس کے پاس بھیجا۔ ساتھ ہی کہا کہ مقصود صرف حالات کا معائنہ ہے۔ رومی کیمپ کے اندر پہنچو تو ہر چھوٹی بڑی چیز بغور دیکھو۔ بیلی ساریوس کو اس سفارت کے اصل مقصد کا اندازہ ہوچکا تھا۔ اس نے اپنے سپاہیوں اور سالاروں سے کہہ دیا کہ جنگی کھیل اور ورزشیں بڑے زور شور سے جاری رکھیں۔ پتھر پھینکیں، گھوڑے دوڑائیں اور ایرانی سفیر کی طرف آنکھ اُٹھاکر بھی نہ دیکھیں۔

کیمپ میں یہ سرگرمیاں جاری تھیں کہ ایرانی سفیر آیا۔ بیلی ساریوس نے اس کا پُرزور استقبال کیا۔ اس کے لیے دعوت کے بہترین سامان مہیا کیے۔ سفیر نے اپنے شہنشاہ کی طرف سے پیغام پہنچایا کہ رومی شہنشاہ نے شرائطِ صلح کی خلاف ورزی کی، اس وجہ سے حملے کی نوبت آئی۔ بیلی ساریوس نے سراپا حیرت بن کر کہا:

"معلوم ہوتا ہے، کسریٰ کا طرزِ عمل عام انسانوں سے مختلف ہے۔ عام طریقہ یہ ہے کہ ہمسایوں کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہو تو باہم بیٹھ کر بات چیت سے

---

[1] HIEROPOLIS اسے آج کل منبج کہتے ہیں۔

فیصلہ کر لیتے ہیں۔ فیصلہ نہ ہو تو لڑتے ہیں، لیکن کسریٰ نے پہلے حملہ کیا، پھر بات چیت کی ضرورت محسوس فرمائی۔"

اس اثنا میں سفیر تمام حالات دیکھ چکا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ رومیوں نے ایرانیوں کے لیے پھندا تیار کر رکھا ہے۔ نوشیرواں کو یہ اطلاعات ملیں تو وہ نہیں سے واپس ہو گیا، البتہ ایک سرحدی مقام کیلینیکم[1] کو لوٹا۔ جنگ ٹل گئی، لیکن طاعون قسطنطنیہ پہنچ چکا تھا۔ ایک روز بیلی ساریوس اپنے نائب کے ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ کچھ اور آدمی بھی تھے۔ جب یہ ذکر آیا کہ جسٹینین وبا میں فوت ہو گیا تو کیا ہو گا؟ مجلس میں سے ایک بولا: ہم قسطنطنیہ کو شہنشاہ نامزد کرنے کا موقع نہ دیں گے۔ ان میں سے کوئی شخص ملکہ تھیوڈورا کا جاسوس بھی تھا۔ اسے یہ خبر پہنچی تو جسٹینین سے فرمان جاری کرا دیا کہ بیلی ساریوس اور اس کا نائب دونوں قسطنطنیہ واپس پہنچ جائیں۔ اس کے بعد بیلی ساریوس مشرقی محاذ پر نہ گیا۔

وبا قسطنطنیہ کے قریب پہنچی تو جسٹینین کے مشیروں اور رفیقوں کی جماعت میں تبدیلیاں شروع ہو گئیں۔ سب سے پہلے جسٹینین کا معتمد خاص پریسکس رخصت ہوا۔ اس کے خلاف خفیہ سرکاری اطلاعات دوسروں تک پہنچانے کا الزام تھا۔ چنانچہ اسے گرفتار کر کے ایک خانقاہ میں راہبوں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس گرفتاری میں ملکہ کا ہاتھ تھا۔ پھر ملکہ نے دوسروں کے خلاف جوڑ توڑ شروع کر دیے۔ اس سلسلے میں جان[2] ساکن کپاڈوشیا بھی زیرِ عتاب آیا، جو وزیرِ مال[3] تھا۔ ملکہ نے ایک عجیب تدبیر اختیار کی۔ اس نے بیلی ساریوس کی بیوی انٹونینا[4] کو ہمراز بنایا اور اس سے کہا کہ "وزیرِ مال کی وجہ سے بیلی ساریوس بھی اکثر بے بس ہو جاتا ہے۔ کیوں نہ وزیرِ مال کو الگ کرائیں تاکہ بیلی ساریوس شہنشاہ کے خاص مقربین میں سے ہو جائے۔ وزیرِ مال کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اسے زبان پر قابو نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ کسی روز اسے اپنے پاس بلاؤ اور شہنشاہ کے خلاف غداری کی گفتگو پر آمادہ کر لو۔ جاسوسوں کا انتظام میں (ملکہ) کروں گی اور وزیرِ مال کا قصہ ختم ہو جائے گا۔"

---

[1] CALLINICUM [2] JOHN OF CAPPADOCIA جسٹینین کا مشہور وزیرِ مالیات [3] ANTONINA

انٹونینا نے وزیر مال کی بیٹی کے ذریعے سے یہ چال کامیاب بنائی۔ اس نے وزیر مال کی بیٹی سے کہا کہ بیلی ساریوس سب کو ملکہ کے ظلم سے نجات دلانا چاہتا ہے، جو قحبہ خانے سے اٹھ کر تخت پر جا بیٹھی ہے۔ ملکہ جسٹینین کے مرتے ہی بے دست و پا ہو جائے گی۔ جسٹینین مارا جائے گا تو وزیر مال بادشاہ بن جائے گا، اور بیلی ساریوس اپنی مرضی کے مطابق سرحدی جنگیں کر سکے گا۔ بیٹی نے یہ باتیں وزیر مال تک پہنچائیں۔ جان کو یہ شک بھی نہ گزرا کہ اس کے لیے یہ جال خود ملکہ نے بچھایا ہے۔ جب اس نے انٹونینا سے خود اس طرح کی بات چیت کی تو ملکہ کے جاسوسوں نے سب کچھ سن کر جسٹینین کو آگاہ کیا۔ چنانچہ وزیر مال کی پوری جائداد ضبط کر لی گئی اور اسے حکم دے دیا گیا کہ پادری بن کر قسطنطنیہ سے باہر کسی خانقاہ میں جا بیٹھے، البتہ جسٹینین نے اس کے آرام و آسائش کے لیے مناسب انتظام کر دیا۔

ملکہ کی دوسری ضرب خود انٹونینا پر پڑی۔ بیلی ساریوس مشرقی محاذ پر جاتے ہوئے بیوی کو قسطنطنیہ میں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے ایک نوجوان سے تعلقات پیدا کر لیے۔ اس کے بعض ملازموں نے یہ راز فاش کر دیا تو ان کی زبانیں کٹوا دی گئیں اور قتل کرا کے ان کی لاشیں سمندر میں ڈلوا دی گئیں۔ وہ نوجوان کہیں غائب ہو گیا۔ ملکہ تھیوڈورا نے اسے تلاش کرا کے پکڑوا منگایا اور اپنے محل میں محفوظ رکھا۔ پھر انٹونینا سے کہا کہ تمھیں ایک بیش بہا موتی بطور انعام دینا چاہتی ہوں۔ چنانچہ ایک عوامی تقریب کا انتظام کیا گیا۔ انٹونینا انعام کی متوقع تھی۔ تھیوڈورا نے ایک پردے کے پیچھے سے اس کے نوجوان عاشق کو درباری لباس میں پیش کر دیا۔ اس طرح افشائے راز سے انٹونینا کے بلند عزائم خاک میں مل گئے۔ وہ اس درجہ دل شکستہ ہوئی کہ فوراً قسطنطنیہ چھوڑ کر اپنے شوہر کے پاس پہنچ گئی۔

ادھر سے بیلی ساریوس اور اس کا نائب قسطنطنیہ آئے تو "شاخ زریں" کی بندرگاہ پر سب سے پہلے نرسی نے حاجب اعلیٰ کی حیثیت سے انھیں ملامت کی۔ پھر بتا دیا گیا کہ شہنشاہ بیمار ہے اور ان کا فیصلہ ملکہ کرے گی۔ نائب کو کہیں دور بھیج دیا گیا۔ بیلی ساریوس کو شہر میں عزت و احترام کا جو مقام حاصل تھا، اس کے پیش نظر کوئی خاص سزا تو نہ دی گئی، البتہ اس کے اختیارات گھٹا دیے گئے۔ اب مجلس وزرا پر تھیوڈورا کا اقتدار مکمل ہو چکا تھا اور تمام اہم عہدے اس کے معتمد آدمیوں کے

ہاتھوں میں تھے۔

مئی ۵۴۲ء میں گلٹی والا طاعون قسطنطنیہ میں نمودار ہُوا اور بڑی تباہی پھیلائی۔ اتنے لوگ مرتے تھے کہ فصیل کے اندر قبرستانوں میں دفن کے لیے جگہ باقی نہ رہی۔ پھر لاشیں گاڑیوں میں بھر بھر کر شہر سے باہر لے جاتے اور خندقوں میں پھینک کر اُوپر مٹی ڈال دیتے۔ آخر لاشیں کشتیوں کے ذریعے سے غلطہ پہنچا دی جاتیں۔ اندازہ کیا گیا کہ سات لاکھ کی آبادی میں سے کم از کم تین لاکھ آدمی طاعون کی نذر ہو گئے۔ خود جسٹینین بھی بیمار ہُوا لیکن اچھا ہو گیا۔ موسم سرما میں طاعون ختم ہُوا۔

طاعون کے بعد قحط نمودار ہُوا۔ غلّہ لانے والی کشتیاں اور جہاز باقی نہ رہے تھے۔ جو لوگ زندہ رہے، ان کی کیفیت یہ تھی، گویا کسی بہت بڑے زلزلے کے باقی ماندہ افراد ہیں۔ لوگوں نے ملکہ کو اس ساری مصیبت کا ذمّہ دار ٹھہرا لیا۔ ان کا خیال تھا کہ وبا اُن شہروں سے گزرتی ہوئی آئی جہاں کبھی ملکہ نے عصمت فروشی کی زندگی بسر کی تھی۔ ملکہ نے اپنی بیٹی اسکندریہ میں چھوڑی تھی۔ اس کے ایک بیٹا پیدا ہُوا۔ کسی کو اس راز کا علم نہ تھا۔ چونکہ مصر میں طاعون نے بہت بُری شکل اختیار کر لی تھی، اس لیے ملکہ نے خفیہ خفیہ اپنے نواسے کو قسطنطنیہ بُلا لیا اور اپنے محل میں رکھ لیا تھا۔

بیماری اور مصائب کے ہجوم نے جسٹینین کے حوصلے کو پست کر دیا تھا اور وہ خاموشی سے اپنی تعمیر کی ہوئی عمارت کو تباہ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اس مایوسی کے عالم میں مذہب کے اثر نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ سلطنت کو عظمت اور خوشحالی عطا کرنے کا خواب جو اس نے دیکھا تھا پھر اس کے مردہ عزائم کو بیدار کر رہا تھا۔ اس کے رفیق اسے دیوانہ سمجھتے لیکن اس کی دیوانگی میں ایک شعور بھی تھا۔

سولھواں باب

الرّوحا کا محاصرہ اور ٹوٹیلا گاتھ

سلطنت کی سرحدوں سے باہر کی دُنیا کے متعلق جو خیالی افسانے قدیم رومیوں میں مشہور تھے، اب ان کی جگہ بیرونی ملکوں اور ہمسایہ قوموں کے بارے میں زیادہ حقیقت پسندانہ نقطہ نظر نے لے لی تھی۔ قدیم رومی شہنشاہوں کو جن غیر متمدّن اقوام سے واسطہ پڑا تھا، ان پر اقتدار قائم کرنے کے لیے "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کی حکمت عملی بروئے کار لائی گئی تھی۔ اس حکمت عملی سے جسٹینین بھی کام لیتا رہا لیکن اب اس نے محسوس کیا کہ سلطنت کے تحفّظ و استحکام کے لیے ضروری ہے کہ ان غیر متمدّن اقوام کو رومی تہذیب و تمدّن کی طاقت سے مسخّر کیا جائے۔

جسٹینین نے اب یہ کوشش شروع کر دی کہ وحشی اقوام کو تہذیب و شائستگی کے دائرے میں لایا جائے کیونکہ کسی ایک گروہ کو شکست دے دینے کے بعد معاملہ ختم نہیں ہوتا تھا، نئے گروہ پیدا ہو جاتے تھے۔ چنانچہ جسٹینین نے بڑے بڑے سرداروں کے بچّے اپنے پاس بلوا لیے اور ان کے لیے تعلیم کا انتظام کر دیا۔ علاوہ بریں راہبوں اور پادریوں کے مشن تیار کیے، جن کا اصل مقصد یہ تھا کہ تبدیلیٔ مذہب کے بجائے دوستی اور حلیفی پر زیادہ زور دیں۔ چنانچہ یہ لوگ مختلف وحشی اقوام گروہوں میں پہنچ گئے۔ وہاں اینٹیں تھاپتے اور گرجے تعمیر کر لیتے۔ ساتھ ساتھ شفاخانے بنا لیتے۔ باہم غور و مشورہ کے لیے کوئی جگہ تجویز کر لیتے۔ اس طرح انھوں نے اجتماعی زندگی کی بنیاد رکھی۔ ساتھ ہی نئے طریقے پر زمین کی کاشت شروع کرائی۔ یہ مشن زیادہ تر عورتوں میں کام کرتے تاکہ ان کے ذریعے سے بچّوں پر اچھا اثر پڑے۔ گویا مشنریوں کے ذریعے سے سیاسی مقاصد کے لیے سعی و کوشش کا سلسلہ جسٹینین سے جاری ہُوا۔

اس طرح تجارت خوب پھیلی اور تجارت کے ساتھ ساتھ رومی تہذیب کا حلقۂ اثر بھی وسیع تر ہو گیا۔ حبشہ سے لوگ بحیرۂ قلزم کو عبور کر کے عرب میں داخل ہوئے اور وہاں سے ان کے جہاز سیلون تک چکّر لگانے لگے کیونکہ چین تک سیدھے راستے ایرانیوں نے روک رکھے

تھے۔ اسی طرح وادیٔ نیل میں بھی تبلیغی مشن بھیجے گئے جن کے اثر سے بہت سی قومیں جو پہلے سے مسیحیت کے زیرِ اثر تھیں سیاسی اور مذہبی اعتبار سے رومیوں کے قریب تر آگئیں۔

۵۴۴ء کے اوائل میں نوشیرواں نے پھر حملہ کر دیا۔ اب بیلی ساریوس اس کا راستہ روکنے کے لیے موجود نہ تھا اور وہ بلا مزاحمت الرّوحا پہنچ گیا۔ انطاکیہ کو مشرقی شہروں میں ملکہ کی حیثیت حاصل تھی۔ الرّوحا مشرقی سرحد کا مستحکم حصار سمجھا جاتا تھا۔ اس شہر کے سقوط سے پورے مشرقی محاذ کا سلسلۂ دفاع درہم برہم ہو جاتا۔

سٹیفن نام ایک سن رسیدہ طبیب نے نوشیرواں کو ابتدا میں تعلیم دی تھی۔ وہ شرائط صلح معلوم کرنے کے لیے نوشیرواں کے پاس پہنچا تو اس نے استہزائی انداز میں جواب دیا کہ اگر الرّوحا کے باشندے ایرانیوں کو لوٹ کا موقع نہ دیں گے تو میں ان کے شہر کو مسمار کر کے اسے بھیڑوں کی چراگاہ بنا دوں گا اور انھیں غلام بنالوں گا۔ اہلِ شہر مجبوراً دفاع کے لیے تیار ہو گئے۔ نوشیرواں نے فصیل کے ساتھ اونچے دمدمے تیار کر لینے کا حکم دے دیا تاکہ بلندی پر سے شہر پر سنگ باری کی جا سکے۔ لکڑی اور مٹی سے بنے ہوئے یہ دمدمے بتدریج شہر کی دیواروں کے قریب آتے جا رہے تھے۔ محصورین کی مدد کے لیے قسطنطنیہ سے تین افسر بھیجے گئے تھے، جن میں سے ایک نے حکم دے دیا کہ سرنگ لگا کر دمدموں کو اڑا دینا چاہیے۔ ایرانیوں کو معلوم ہو گیا کہ سرنگ لگائی جا رہی ہے تو انھوں نے جوابی سرنگ بنانی شروع کر دی۔ الرّوحا کے باشندوں نے یہ دیکھا تو اپنی سرنگ کا آخری سرا پتھر اور چونے سے بند کر دیا۔ اگلا سرا چوڑا کر کے دونوں دیواروں کے ساتھ تختے لگا دیے۔ بیچ میں لکڑیاں بھر دیں، ساتھ ہی جگہ جگہ رال کے بورے اور گندھک کے ڈھیلے پھیلا دیے۔ ان پر صنوبر کا تیل ڈالا اور آگ لگا دی۔ یہ آگ ایرانی دمدموں کے شہتیروں تک پہنچ گئی اور وہ سب جل کر خاکستر بن گئے۔ ایرانیوں نے آگ پانی سے بجھانی چاہی تو وہ اَور بھی بھڑک اٹھی۔

نوشیرواں نے بڑی کوششیں کیں، لیکن ہر مرتبہ شکست کھائی۔ محض آس پاس کے کسان ہی نہیں عورتیں بھی ان پر جلتا ہوا تیل ڈالتیں۔ آخر ایرانی تنگ آ کر واپس چلے گئے۔ جسٹینین کے لیے یہ صورتِ حال بڑی حوصلہ افزا تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ جا بجا چوکیاں قائم کر کے ان میں فوجی دستے متعین کر دینے سے سلطنت کے مشرقی حصے کا دفاع بہ خوبی ہو گیا اور کیمیائی آگ نے الرّوحا کے

باشندوں کو ایرانیوں سے بچا لیا۔ جسٹینین نے فوراً نوشیرواں کے پاس قاصد بھیج دیے۔ چنانچہ پانچ سال کے لیے صلح ہوگئی اور جسٹینین نے ہر سال تین ہنڈرڈ ویٹ سونا دینا منظور کر لیا۔

نوشیرواں نے درخواست کی کہ ٹریبونس[۵] نام ایک یونانی طبیب کو کچھ مدت کے لیے دربارِ ایران میں بھیج دیا جائے۔ یہ شخص فلسطین میں رہتا تھا اور اپنے فن کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بدلے میں نوشیرواں نے وہ فلسفی واپس کر دیے جو ایتھنز کی درسگاہیں بند ہونے کے بعد ایران میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ البتہ جسٹینین سے یہ منظور کرا لیا کہ ان سے اچھا برتاؤ ہوگا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نوشیرواں نے ٹریبونس کی خدمات کے معاوضے میں ہزار مسیحی قیدی بھی رہا کر دیے۔ یوں جسٹینین جس مصالحت کا خواہاں تھا، وہ قائم ہوگئی۔ اسے ایرانیوں سے جنگ کا کوئی خیال نہ تھا بلکہ ایران کو ان وحشی اقوام کے خلاف دفاع کا ایک مورچہ سمجھتا تھا، جو مغرب کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ ۵۴۵ء میں جسٹینین کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اٹلی کا تھا۔

مشرقی رومی سلطنت کے ذمے جس تہذیبی میراث کی حفاظت کا فرض تھا۔ اس میں سب سے نمایاں حیثیت ان فنون کی تھی جو قسطنطنیہ میں نشو و نما پا رہے تھے۔ اس فنی روایت کا سلسلہ ایک طرف قدیم یونان کے فنون سے ملتا تھا لیکن اس نے کلیسا کے زیرِ سایہ ترقی کی تھی اور مذہبی اثرات بھی اس میں نمایاں تھے۔ نقاشی۔ سنگتراشی۔ چاندی سونے اور ہاتھی دانت کا کام، خطاطی اور مصوری، سب میں یہی دوہری روح نظر آتی تھی۔ ان تمام فنون کے اسالیب بزنطینی تھے۔ مغربی یورپ میں رومی تہذیب کے آثار دھندلے ہوتے جا رہے تھے اور نئی نسلیں اس تہذیب سے روز بروز بیگانہ تر ہوتی جاتی تھیں۔

جسٹینین کو یقین ہو چکا تھا کہ سلطنت کی حدیں بڑھانے کے لیے اٹلی کو قبضے میں رکھنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر وہ چھنے ہوئے گال اور پراونس کو واپس نہیں لے سکتا تھا۔ سسلی پر قبضہ قائم رکھے بغیر اس کے جہاز ساحلِ ہسپانیہ تک جا نہیں سکتے تھے، لہٰذا اس نے گاتھوں کو فیصلہ کن شکست دینے کا پختہ ارادہ کر لیا۔

۵۔ TRIBUNUS

وبا کے بعد اٹلی میں جنگ کی آگ پھر بھڑک اُٹھی تھی۔ ملک میں قحط کے سے حالات پیدا ہوئے تو رومی سالار شہروں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ باقی علاقوں میں گاتھوں نے تاخت و تاراج شروع کر دی۔ اُدھر جسٹینین کی طرف سے جو حاکم مقرر ہوئے تھے، اُنھوں نے ٹیکس وصول کرنے پر زور دیا۔ پورا روپیہ وصول نہ ہو سکا تو فوج کی تنخواہ کا ایک حصّہ روک لیا۔ اس طرح حالات بگڑ گئے اور بیلی ساریوس نے جو فتوحات حاصل کی تھیں، وہ حاکموں کی بے تدبیری کے باعث ضائع ہو گئیں۔

آخر جسٹینین کی نگاہ پھر بیلی ساریوس پر جم گئی۔ اُسے بلا کر سازش کے تمام الزامات سے بری کر دیا۔ ضبط شدہ جائداد میں سے دو تہائی حصّہ بحال کر دیا اور اس سے کہا: جو کچھ تم نے کیا، اس کا فیصلہ تمھیں پر چھوڑتا ہوں۔ میں تمام الزامات کو ختم کرتا ہوں۔ آیندہ کے لیے تمھارے اعمال ہی تمھارے احساسات کی تصدیق کریں گے۔ تھیوڈورا نے بھی اس سے اتفاق کیا اور بیلی ساریوس سے بات کر کے اس کی بیٹی جوءنینا[1] کی نسبت اپنے نواسے اناسٹاسیوس سے ٹھہرا دی۔

بیلی ساریوس کو اس مہم کے لیے روپیہ اور فوج فراہم کرنے میں جسٹینین نے پہلے کی طرح تنگ نظری کا ثبوت دیا۔ اسے اپنی ذاتی فوج رکھنے کی اجازت نہیں دی اور نہ اسے پچھلا منصب عطا کیا۔ اسے صرف اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ اپنے صرفے پر تھریس اور ڈلمیشیا سے حسبِ ضرورت فوج بھرتی کر لے۔ کیونکہ قسطنطنیہ کا خزانہ ان اخراجات کا کفیل نہ ہو سکتا تھا۔

شکست خوردہ گاتھوں میں ٹوٹیلا[2] نام ایک نیا لیڈر پیدا ہو گیا۔ اس نے اپنی قوم کے جنگجوؤں کو لڑائی کے لیے از سر نو تیار کر دیا۔ وہ شہروں سے دُور رہتا اور اپنے سپاہیوں کو محاصروں میں ضائع نہ کرتا، لیکن جنوبی اٹلی کے دیہاتی علاقوں کو اس نے اپنی جولانگاہ بنا لیا۔ اہلِ اٹلی سے اس کا برتاؤ بہت اچھا تھا۔ جنگ میں ہر قسم کی سختیاں اور درشتیاں جائز رکھتا، لیکن جنگ کے بغیر کسی کو تکلیف نہ دیتا۔ اہلِ نیپلز نے حوالگی سے پیشتر ایک مہینے کی مہلت طلب کی۔ ٹوٹیلا نے ایک کے بجائے تین مہینے کی مہلت دے دی۔ بالآخر نیپلز پر قبضہ ہو جانے سے ایک اچھا بندرگاہ اس کے ہاتھ آ گیا اور اس نے ایک بحری بیڑا بھی تیار کرانا شروع کر دیا۔ کہتے ہیں کہ ٹوٹیلا نے سن رسیدہ بینی ڈکٹ[3] سے بھی ملاقات کی تھی۔ بینی ڈکٹ نے

---

[1] JOANNINA [2] TOTILA [3] BENEDICT یہ مسیحیوں کے مقدس بزرگوں میں شمار ہوتا ہے۔ مغرب میں اسی نے خانقاہی زندگی اور رہبانیت کی بُنیاد رکھی۔ اس کی خانقاہ نیپلز کے پاس تھی۔ ۵۴۳ء میں وفات پائی۔

یہ پیشگوئی کر دی تھی کہ ٹوٹیلا رومہ میں داخل ہوگا، مگر نو سال سے زیادہ حکومت نہ کرے گا۔

اس اثنا میں بیلی ساریوس اٹلی کے شمالی و مشرقی گوشے میں پہنچ چکا تھا۔ ٹوٹیلا کو خبر ملی تو وہ اس سے غافل نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ بیلی ساریوس کی شخصیت نے ایک افسانے کی صورت اختیار کر لی تھی اور مشرق و مغرب دونوں محاذوں پر اس کے کارنامے زرّیں حروف میں مرقوم تھے۔ نوشیرواں کی طرح ٹوٹیلا نے بھی قاصد بھیج دیے تاکہ معلوم ہو جائے کتنی فوج بیلی ساریوس کے ساتھ آئی ہے۔ بیلی ساریوس کی حالت پہلے سے مختلف تھی۔ جو فوج اس کے زیرِ کمان تھی، وہ پہلی فوج کی طرح قابلِ اعتماد نہ تھی۔ نیز تمام رومی جرنیل اس کے پاس پہنچنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ ٹوٹیلا برق و طوفان کی طرح اس کی طرف آیا۔

بیلی ساریوس نے حالات کا جائزہ لے کر جسٹینین کو صاف صاف لکھ دیا:

"اگر آپ بیلی ساریوس کو اٹلی بھیجنا ضروری سمجھتے تھے تو وہ ہو چکا۔ میں اٹلی میں بیٹھا ہوں۔ اگر آپ کی خواہش یہ ہے کہ دشمنوں پر غلبہ پایا جائے تو مزید انتظامات کے بغیر چارہ نہیں سپہ سالار کے پاس ایسے آدمی ہونے چاہئیں، جو اس کے لیے تقویت کا باعث ہوں۔ سب سے بڑھ کر مجھے اپنے خاص دستے کی ضرورت ہے۔ پھر ہنوں اور دوسرے جنگجو گروہوں کی بہت بڑی فوج درکار ہے اور انھیں تنخواہیں دینے کے لیے روپیہ بھی چاہیے۔"

اس کے پاس فوج واقعی کم تھی۔ جو رومی جیش اٹلی میں موجود تھے، وہ شکستیں کھا کھا کر بددل ہو چکے تھے۔ روپیہ حاصل کرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ چونکہ سپاہیوں کو مدّت سے تنخواہ نہیں ملی تھی، اس لیے بیلی ساریوس کو احساس تھا کہ ان سے حسبِ مرضی کام نہیں لیا جا سکتا۔

بہر حال بیلی ساریوس نے خشکی کو چھوڑ کر تری میں رہنے کا فیصلہ کر لیا اور جہازوں میں سوار ہو کر ایڈریاٹک کے دہانے تک چکّر لگاتا رہا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ٹوٹیلا نے رومہ کے ارد گرد مستحکم حلقہ قائم کر لیا ہے تو بیلی ساریوس سیدھا سسلی پہنچا۔ وہاں سے غلّہ خرید کر جہازوں میں بھرا اور گاتھوں کی ناکابندی توڑ کر جہاز ٹائبر کے دہانے پر پہنچانے کی کوشش کی۔ شہر میں غذا کی قلت کے باعث بڑی نازک حالت پیدا ہو چکی تھی۔ ٹوٹیلا وٹجس کے مقابلے میں زیادہ دُور اندیش تھا۔ وہ دیہاتیوں کو بالکل تنگ نہ کرتا اور فوج کے لیے جس قدر غلّے کی ضرورت ہوتی، قیمت دے کر لیتا۔ انتہائی کوششوں کے باوجود بیلی ساریوس رومہ کو پوری مدد نہ پہنچا سکا۔ ٹوٹیلا مزید فوج لے آیا۔ آخر بیلی ساریوس کو پسپائی اختیار

کرنی پڑی - چنانچہ وہ دریائے ٹائبر کے راستے بندرگاہ پر واپس پہنچ گیا - شہر پر ٹوٹیلا کا قبضہ ہو گیا - گاتھوں نے شہر میں داخل ہو کر قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا - لیکن بعد میں ٹوٹیلا نے اپنے رفیقوں کو لوٹ کی اجازت دے دی - البتہ قتل اور آبرو ریزی کی ممانعت کر دی - اس تباہی نے روما کی رہی سہی عظمت کو خاک میں ملا دیا -

اب ٹوٹیلا کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ روما کا انتظام کیونکر کرے - اس نے ایک سفارت قسطنطنیہ بھیج دی تاکہ صلح ہو جائے اور وہ جسٹینین کی وفاداری کا حلف اُٹھا کر گاتھوں پر حکومت کرتا رہے - یہ سفارت قسطنطنیہ پہنچی تو جسٹینین نے جواب دیا کہ بیلی ساریوس کو صلح و جنگ کے پورے اختیارات حاصل ہیں - اسی سے گفتگو ہونی چاہیے - ٹوٹیلا نے یہ دھمکی بھی دے دی تھی کہ اگر صلح نہ کی گئی تو روما کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی - چنانچہ اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا - بڑے بڑے دروازے توڑ دیے گئے - فصیل کے مختلف حصے تباہ کر دیے گئے - بیلی ساریوس نے اسے لکھا :

"صرف عقلمند آدمی، جو تہذیب کو سمجھتے ہیں، کسی شہر میں حسن و جمال پیدا کر سکتے ہیں - جو لوگ سمجھ نہیں رکھتے، وہ حسن و جمال کو تباہ کر دیتے ہیں - آنے والی نسلیں ان کے اعمال کی بنا پر ان کی سیرتوں کا اندازہ کریں گی - روما کو دُنیا بھر کے شہروں میں ممتاز ترین درجہ حاصل تھا - نہ یہ ایک دن میں بنا، نہ اسے ایک آدمی نے بنایا بلکہ ایک بہت بڑے گروہ کی فنکاریاں آہستہ آہستہ مصروفِ عمل رہیں اور بہت بڑی مدت میں یہ تیار ہُوا -"

ساتھ ہی ٹوٹیلا سے سوال کیا گیا تھا کہ اگر تم نے لڑائی میں شکست کھائی تو روما کی تباہی سے تمھیں کیا فائدہ ہو گا؟ اور اگر تم کامیاب ہوئے تو اس عظیم الشان شہر کی تباہی سے تمھیں کیا ملے گا؟ تمھارے اعمال پر ہی تمھاری شہرت کا مدار ہو گا -

ٹوٹیلا نے کئی مرتبہ خط پڑھا - بہر حال وہ اتنے بڑے شہر میں فوج رکھنے کا قائل نہ تھا - چنانچہ اسے چھوڑ کر شمالی جانب چلا گیا اور بیلی ساریوس شہر پر قابض ہو گیا - اس نے باشندوں کے لیے غذائی جنسیں مہیا کر دیں - سسلی سے غلّے کے جہاز آنے لگے - ٹوٹے ہوئے دروازوں اور شکستہ فصیل

کی مرمت ہو گئی۔ ٹوٹیلا یہ سنتے ہی پھر فوج لے کر پہنچ گیا، لیکن اب بیلی ساریوس کی سرکردگی میں دفاع کا ایسا انتظام تھا کہ ٹوٹیلا کچھ نہ کر سکا اور واپس شمالی جانب چلا گیا۔

جسٹینین نے لمبارڈ اور دیگر قبائلیوں کے کچھ اَور گروہ اٹلی بھیج دیے۔ ٹوٹیلا انھیں بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارتا رہا۔ ایک مرتبہ گاتھوں نے اچانک بیلی ساریوس کے کیمپ پر ہلّہ بول دیا۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا اور پھر پہلے کی طرح جہازوں میں سوار ہو کر چکّر لگانے لگا۔ بہرحال رومیوں کے قبضے میں صرف ساحلی علاقے تھے۔ خود ٹوٹیلا نے بھی جہاز تعمیر کرائے اور فیصلہ کر لیا کہ وہ سسلی کو رومیوں سے چھینے بغیر چین نہ لے گا۔ جسٹینین نے بیلی ساریوس کو قسطنطنیہ بُلا لیا۔ ٹوٹیلا نے جنوری ۵۵۰ء میں اہلِ اٹلی سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہر کسان کاشتکاری میں آزاد ہو گا۔ البتہ اسے معمولی سی رقم خزانے میں داخل کرنی پڑے گی۔ اس نے بھاگے ہوئے رومی امراء کو واپس بلانے کی کوششیں کیں اور اس غرض سے کھیلوں کا انتظام بھی کر دیا۔

جسٹینین نے پورے حالات پر غور کیا تو صاف نظر آ گیا کہ چودہ سال کی رزم آرائی کے بعد بھی اٹلی کو فتح کر لینا آسان نہیں۔ فتح کے لیے ضروری ہے کہ بہت بڑی فوج فراہم کی جائے۔ سالہا سال کا خرچ مہیّا ہو۔ ایک بڑا بیڑا تیار کیا جائے، جو فوجوں کے ساتھ ساتھ ساحل سے قریب تر رہے اور ایک قابل آدمی اس کا کمانڈر ہو۔ دوسری صورت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ٹوٹیلا کی شرطیں مان کر اٹلی کو گاتھوں کے حوالے کر دیا جائے۔ جسٹینین کی نگاہِ انتخاب اپنے خالہ زاد بھائی جرمانوس پر پڑی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ جرمانوس اور متاسنتھا کی شادی کر دی جائے تاکہ گاتھ متاسنتھا کی بدولت ساتھ دینے کے لیے تیار ہو سکیں۔ چنانچہ جرمانوس کو تیاری کا حکم دے دیا گیا۔

جنگ اور وبا کے اثرات نے معاشی حالات میں بڑی تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں، جن کی وجہ سے کچھ انتظامی تبدیلیاں ہوئیں۔ شہریوں کو حکم ہو گیا کہ ہتھیار لے کر کوئی باہر نہ نکلے۔ مقرّرہ نرخ سے زیادہ قیمت پر چیزیں فروخت کرنے والوں کے لیے دُکانیں اور مال لانے والے جہاز ضبط کر لینے کی سزا تجویز ہوئی۔ معماروں، مزدوروں اور ملّاحوں کو اجرتوں میں اضافے کے مطالبے کی ممانعت کر دی گئی۔ فوجیوں سے کہہ دیا گیا کہ وہ کوچ کی حالت میں کسی نجی جائداد پر قیام کے لیے قبضہ نہیں کر سکتے۔ رومی سکّے نے بین الاقوامی زرِ مبادلہ کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور جسٹینین ہر ممکن طریقے پر

اس کی قیمت برقرار رکھنا چاہتا تھا - اس کے حکم سے تجارت کی توسیع کے لیے قرطاجنہ اور قیسار یہ کی بندرگاہوں میں توسیع کی گئی اور نئی تجارتی شاہراہیں کھولی گئیں - اسی زمانے میں ربونا میں جو گرجا تعمیر ہُوا، اس کی عمارت ہشت پہلو رکھی گئی اور اس پر گنبد تعمیر ہوئے - یہ تعمیر انطاکیہ کے کاریگروں نے مکمّل کی -

جون ۵۴۸ء میں ملکہ تھیوڈورا نے سرطانِ حلق کی بیماری سے وفات پائی - زندگی بھر اسے ایسا اقتدار حاصل رہا کہ ایک موقع پر نوشیرواں یہ معلوم کر کے حیران رہ گیا کہ ملکہ نے ایک ایرانی مسیحی کو صلح و امن کے لیے سعی و کوشش جاری رکھنے کی تاکید کی ہے - نوشیرواں بے اختیار پکار اُٹھا: یہ رومیوں کی سلطنت کتنی عجیب ہے، جس پر ایک عورت حکمران ہے! مرنے سے پہلے تھیوڈورا نے اسقفِ اعظم کے خلاف جلاوطنی کا حکم منسُوخ کرایا اور اسے سابقہ عہدے پر بحال کرا دیا - اس کی توجہ زیادہ تر اُن مشرقی شہروں اور مقدّس مقامات کی درستی پر جمی رہی، جو ابتدائی دور میں اس کی سیر و گردش کی منزلیں رہ چکے تھے - اس کے بعد وہ راہبوں اور پادریوں کی امداد کے لیے سب کچھ کرتی رہی - خاص طور پر اس کی کوششیں ان مشرقی کلیساؤں کی بہبُود کے لیے وقف رہیں جن کے ساتھ جسٹینین اپنی مذہبی عصبیت کی بنا پر سختی اور عدم رواداری سے پیش آتا تھا -

ستر ھواں باب

آخری دور

کہتے ہیں کہ جسٹینین کو تھیوڈورا کی وفات کا بے حد قلق ہُوا۔ اگر کوئی شخص ملکہ کا ذِکر کرتا ہُوا کہتا، "ہماری حد درجہ محبُوب ملکہ" تو جسٹینین بہت خوش ہوتا۔ اس نے حکم دے دیا تھا کہ قصر کے زنانہ حصّے کے تمام کمرے اسی حالت میں رہیں، جس حالت میں ملکہ تھیوڈورا نے چھوڑے تھے۔ مذہبی معاملات کے متعلق اس نے ملکہ تھیوڈورا کی خواہشات کو پورا کر دیا اور مشرق کے تمام کلیساؤں کو اپنے اپنے طریقے پر عبادت کرنے کی آزادی دے دی۔ جرمانوس نے متاسنتھا سے اس امید پر شادی کر لی کہ اگر بیٹا پیدا ہو گا تو وہ قسطنطنیہ اور اٹلی دونوں سلطنتوں کا وارث ہو گا۔

یکایک اطلاع ملی کہ جسٹینین کے قتل کے لیے ایک اور سازش ہوئی ہے۔ مقصود یہ تھا کہ جسٹینین کو ختم کر کے جرمانوس کو شہنشاہ بنا دیا جائے۔ اردوان[1] اور ارشک[2] کسی نہ کسی حیثیت میں اس سازش سے وابستہ تھے۔ اردوان نے جرمانوس کے بیٹے جسٹن سے سازش کی کیفیت بیان کی۔ جسٹن نے پُورے قصّے کا ذکر باپ سے کر دیا۔ جرمانوس شاہی گارد کے سالار مارسیلس کے پاس پہنچا۔ مارسیلس نے جواب دیا کہ جب تک ثبوت نہ ملے، میں یہ معاملہ شہنشاہ تک نہیں پہنچا سکتا۔ اتفاق سے ایک افسر نے سازشیوں کی باتیں سُن لیں۔ مارسیلس اس افسر سے واقف تھا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ سازش موجود ہے۔ سازشیوں کا فیصلہ یہ تھا کہ جب تک بلی ساریوس قسطنطنیہ نہ آ جائے، سازش کے مطابق عمل پیرائی کا سلسلہ مُلتوی رکھا جائے کیونکہ اگر جسٹینین کے ساتھ بلی ساریوس کو بھی قتل نہ کیا جائے گا تو وہ فوجی قوّت سے کام لے کر سازشیوں کی تمام تدبیریں خاک میں ملا دے گا۔

---

[1] ARTABANES یہ شخص ایرانی الاصل تھا اور اشکانی بادشاہوں میں اس نام کے بھی بادشاہ گزرے ہیں۔ [2] ARSACES اس کے چار تلفظ ہیں: ارشک، ارشاک، اشک، جس سے اشکانی بنا، اور ارساسیس۔ یہ شخص بھی ایرانی الاصل تھا۔

جسٹینین کو تمام حالات کا علم ہُوا تو جرمانوس کی روش اس کے لیے بے حد شک و شبہ کا باعث بن گئی۔ ان شبہات کو ایرانی ارضی سازشیوں کے بیانات نے اور تقویت دی۔ وہ بار بار پوچھتا تھا: جرمانوس نے خود مجھے اس سازش کی اطلاع کیوں نہ دی؟ اگرچہ وہ لوگ عام شہادت کی بنا پر مجرم ثابت ہو چکے تھے، لیکن جسٹینین کو ان کی قدر و قیمت کا پورا علم تھا، لہٰذا اردوان اور جرمانوس کو محل میں نظر بند کر دیا اور جب وقت آیا تو بیلی ساریوس کے مشورے سے انھیں سلطنت کی خدمات انجام دینے کے لیے مختلف محاذوں پر بھیج دیا۔

مورخ لکھتے ہیں کہ ۵۵۰ء میں نیم وحشی اقوام سلطنت کے مغربی حصے پر پوری طرح قابض ہو چکی تھیں اور دریائے ڈینیوب شمالی سرحد نہیں رہا تھا بلکہ سلافی اور دیگر اقوام کے لوگ اس کے مختلف حصوں کو عبور کر کے آگے بڑھ آئے تھے۔ ٹوٹیلا نے چار سو جہازوں کا بیڑا تیار کر کے مختلف جزیروں پر حملے شروع کر دیے تھے۔ اٹلی کی شاہی فوجیں صرف انکونا[۱] اور ٹرینٹو[۲] اور ریوتا میں محصور رہ گئی تھیں۔ سسلی میں صرف سائراکیوز اور پینارمس مقابلہ کرتے رہے۔ گاتھ سسلی سے بڑھ کر سارڈینیا اور کارسیکا تک پہنچ گئے تھے۔ یوں بحری تجارت میں رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی اور خود افریقہ خطرے میں پڑ گیا تھا۔ جسٹینین نے جرمانوس اور اردوان کو قید سے رہا کیا۔ اس نے جرمانوس کو ایک فوج کے ساتھ ڈالمیشیا کے راستے سے اٹلی پر حملے کا حکم دیا اور اردوان کو ایک بیڑا دے کر سسلی بھیج دیا۔ متاسنتھا فوج کے ساتھ تھی اور گاتھ امیروں کے پیغامات اسے مل چکے تھے کہ ہم لوگ اپنی سابق ملکہ کا مقابلہ نہیں کریں گے۔ جرمانوس اس کوشش میں تھا کہ وینس کی طرف جانے والی وادیوں کو سلافی وحشیوں سے پاک کر دے۔ یکایک اس پر موسمی بخار کا حملہ ہُوا اور وفات پائی۔ اس کے ساتھ ہی مہم ختم ہو گئی۔

بیلی ساریوس عمر بھر لڑتے لڑتے اتنا تھک چکا تھا کہ وہ اٹلی جا کر جنگ کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ خونریز جان لڑائی میں ایک دستے کی کمانداری کے فرائض انجام دے سکتا تھا، لیکن اس کے لیے کسی بڑی جنگ کے نظم و نسق کی ذمہ داری سنبھالنا ممکن نہ تھا۔ اس اثناء میں قُطری غور ہُنوں اور صلافیوں کا بہت بڑا گروہ ایڈریا نوپل کے نزدیک پہنچ گیا۔ فرینک وینس کے آس پاس کی دلدلوں میں

---

[۱] ANCONA [۲] OTRANTO

آگے بڑھ آئے۔ اور ٹوٹیلا نے جہاز بھیج کر سیلونا[1] کا محاصرہ کر لیا۔

حالات خاصے پریشان کُن تھے۔ کامیابی کی امید بہ ظاہر کوئی نہ تھی، لیکن جسٹینین ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے ۵۵۱ء میں نرسی کو قسطنطنیہ کی ساری فوج کے ساتھ جس میں ایک ایرانی دستہ بھی شامل تھا۔ جرمانوس کی جگہ سیلونا کے محاذ کا کمانڈر مقرر کر دیا۔ سیلونا میں تین آہن پوش ڈویژنوں اور ساڑھے پانچ ہزار مسلح لمبارڈوں کے علاوہ پچیس ہزار شہنشاہی فوج تھی۔ اس فوج کے پاس سامان بھی خاصا تھا اور روپے کی بھی کمی نہ تھی۔ اس فوج کا راستہ فرینکوں نے روک رکھا تھا۔ فرینکوں سے لڑائی کی صورت میں یہ خطرہ تھا کہ عقب سے گاتھ یورش کر دیں گے۔ نرسی اور خونریز جان نے غور و مشورہ کے بعد ساحل کے ساتھ ایک محفوظ راستہ تلاش کر لیا۔ بیڑا بھی ساتھ ساتھ چلا اور یہ لشکر ریونّا پہنچ گیا۔ ٹوٹیلا یہ سُنتے ہی مقابلے کے لیے نکل پڑا۔ بڑی سخت جنگ ہوئی، جس میں گاتھوں کی جمعیّت تتر بتر ہو گئی اور رات کی تاریکی میں ایک گاتھ سردار سخت زخمی ہو گیا۔ دیکھا گیا تو یہ ٹوٹیلا تھا اور اس کا زخم مہلک ثابت ہُوا۔ اس کا صیقل شدہ خود اور خون آلود لبادہ جسٹینین کے پاس بھیج دیے گئے۔

بادشاہ کے مرنے سے گاتھوں کی جمعیت ٹوٹ چکی تھی۔ انھوں نے مختلف قلعوں میں پناہ لی یا کیومائی[2] میں جمع ہو گئے، جہاں ان کا خزانہ تھا۔ ان کے بیڑے کا بڑا حصہ نیپلز کی بندرگاہ میں فاتحوں کے حوالے ہُوا۔ کچھ جہاز بچ نکلے۔ نرسی نے رومہ پر قبضہ کر لیا۔ خونریز جان کو گاتھوں کے تعاقب پر مامور کر دیا۔ ویسوویس کے دامن میں پہنچ کر تعاقب ایک خونریز جنگ کے بعد ختم ہو گیا۔

ایک مصیبت سے نجات ہوئی تو فرینک اور دوسرے وحشی عناصر اٹلی پہنچ گئے، لیکن جنوبی اٹلی کے گرم موسم کے اثر سے ان کے لشکر میں بیماریاں پھیل گئیں۔ جب وہ شمال کی طرف واپس جانے لگے تو نرسی نے ان پر سخت حملہ کر کے منتشر کر دیا اور جو بچ سکے وہ کوہ ایلپس کو پار کر کے لوٹ گئے۔ آخر جب رھائن لینڈ کے بادشاہ تھیوڈیبرٹ نے وفات پائی تو کوئی شخص ان گروہوں کی قیادت نہ سنبھال سکا۔ گاتھوں نے صلح کر لی اور اٹلی کو چھوڑنے پر تیار ہو گئے۔ لمبارڈ شمالی اٹلی میں مقیم ہو گئے اور ان کے علاقے کا نام اب تک لمبارڈی چلا آتا ہے۔

---

[1] SALONA
[2] CUMAE

گاتھ قوت کے خاتمے سے بحیرہ روم بالکل محفوظ ہو گیا۔ سسلی کے علاوہ سارڈینیا، کارسیکا اور جزائر بلیارک پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ اٹلی سے گزر کر رومی بیڑے نے ہسپانیہ کے ساحل پر کئی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ مثلاً قرطاجنۂ نو اور قرطبہ اور قادسیہ (CADIZ) پروکوپیس جنگوں کے حالات مکمل کر چکا تھا اور جسٹینین نے اسے شہروں اور نئی عمارتوں کے حالات لکھنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ اُس نے بیان کیا ہے کہ آبنائے جبل طارق کے قریب سپٹیم[1] نام مقام میں فوج متعیّن تھی اور وہاں ایک گرجا بھی تعمیر ہُوا، جسے حضرت مریمؑ سے منسوب کیا گیا۔

مغرب سے فارغ ہو کر جسٹینین نے ایک فوج بحیرۂ اسود میں بھیج دی، جس نے بیڑا پر از سرِ نو قبضہ کر لیا۔ اس طرح ایرانیوں کے لیے اس سمندر پر قابض ہونے کا دروازہ بند کر دیا۔ بیڑا سے تاجر اور مشنری قفقاز پہنچنے لگے۔ ۵۵۸ء میں اوار قوم کے خاقان کو قسطنطنیہ آنے کی دعوت دی گئی۔ دریائے نیپر کے ساحل سے بحیرہ قزوین تک وہ خام جنسیں بکثرت ملتی تھیں، جن کی ضرورت قسطنطنیہ کو تھی۔ یعنی غلہ، خشک مچھلی، پھل، نمک اور چمڑے۔ دو نسطوری راہب کسی نہ کسی طرح سمرقند سے بھی آگے نکل گئے۔ یہ بید کی چھڑی میں ریشمی کیڑوں کے انڈے بھر کر لائے، جن کی تربیت شام میں شروع ہوئی اور چین سے ریشم حاصل کرنے کی ضرورت نہ رہی۔

جسٹینین کے دورِ حکومت کا کارنامہ تکمیل کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن خطرات و مصائب کا خاتمہ نہیں ہُوا تھا۔ اس کے آخری دس سال بہت سے مصائب کا پیش خیمہ ثابت ہوئے اور وہ فضا جس کو وسعت دینے کے لیے وہ کوشاں تھا محدود ہو کر رہ گئی۔ موبئی میں ایک وبا پھوٹی جس پر بمشکل قابو پایا جا سکا۔ مختلف اوقات میں زلزلے آئے۔ زبردست بارشوں نے بلقان کی وادیوں میں طغیانیوں کے ذریعے سے تباہی پھیلائی۔ ۵۵۷ء میں بڑے دن سے ایک ہفتہ پیشتر مسلسل چھ روز زلزلے کے جھٹکے محسوس ہوتے رہے۔ ان کے باعث بہت سی عمارتوں میں شگاف پڑ گئے۔ ایا صوفیہ کا گنبد گر گیا، جسے از سرِ نو تعمیر کرایا گیا۔ نیا گنبد سابقہ گنبد سے بھی اونچا رکھا گیا۔

---

[1] SEPTUM یہی مقام ہے، جسے اب سبتہ کہتے ہیں اور یہ آبنائے جبل طارق پر مشرقی سمت میں افریقہ کی مشہور بندرگاہ ہے، جیسے مغربی سمت میں طنجہ ہے۔

جسٹینین کی ایک آرزو ابھی تک پُوری نہ ہو سکی تھی۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتا رہا تھا کہ مشرقی و مغربی کلیساؤں کا اختلاف ختم ہو کر ساری مسیحی دنیا کا ایک مذہب ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے پاپائے روم کی پیروی اختیار کی تھی اور قسطنطنیہ کے اسقفوں پر سختی کی تھی جو اس کے مخالف تھے۔ اپنے دورِ حکومت کے اخیر سالوں میں اس نے ایا صوفیہ میں ایک کونسل منعقد کی تاکہ نزاعی اُمور کا تصفیہ ہو جائے، لیکن اس کا مقصد پورا نہ ہو سکا اور مغربی (رومن) کلیسا اور مشرقی (آرتھوڈکس) کلیسا کے درمیان اختلاف کی خلیج وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

۵۵۹ء میں قطری غُور ہُنوں نے زبرگن خاں کی سرکردگی میں قسطنطنیہ پر حملہ کر دیا۔ بلغار اور سلافی بھی ساتھ ہو گئے۔ شہر سے چالیس میل پر اناسٹاسیوس کی بنائی ہوئی دیوار موجود تھی، مگر زلزلے نے اس میں شگاف ڈال دیے تھے۔ جسٹینین نے بیلی ساریوس کو دفاع کا ذمہ دار بنا دیا۔ اس نے اپنے پُرانے ساتھی فراہم کیے اور شہر سے باہر نکل کر ایک گاؤں میں خیمہ زن ہُوا، جو دس میل کے فاصلے پر تھا۔ اس نے جگہ جگہ دُور تک الاؤ روشن کر دیے اور اپنی فوج کو حکم دے دیا کہ مسلسل حرکت میں رہے۔ اس طرح ایسی صورت پیدا کر دی کہ دُور سے دیکھنے والے کو معلوم ہو، بہت بڑا لشکر جنگ کے لیے تیار کھڑا ہے۔

بیلی ساریوس کو ہُنوں کی جنگجوئی کا تجربہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان وحشیوں کو ہمیشہ یہ خطرہ لگا رہتا ہے، کہیں ان کے لیے کوئی پھندا نہ تیار کر لیا گیا ہو۔ ہُن آگے بڑھے تو راستہ ایک جنگل میں سے ہو کر جاتا تھا۔ بیلی ساریوس نے پہلے سے حکم دے دیا تھا کہ تیر انداز جنگل کے اندر جا کر راستے کے دونوں طرف گھات میں بیٹھ جائیں۔ جنگل میں ہُنوں کے پہنچتے ہی دونوں طرف سے مہلک تیروں کا مینہ برسنے لگا۔ اور بیلی ساریوس کے سواروں نے زبردست حملہ کیا۔ چار سو ہُن سوار کھیت رہے۔ باقیوں نے باگیں موڑ کر راہِ فرار اختیار کی۔ اس طرح یہ خطرہ بھی ختم ہو گیا۔ بیلی ساریوس کا یہ آخری بڑا کارنامہ تھا۔ شاہی فوج کے قیدیوں کو چھڑانے کے لیے روپیہ دے دیا گیا۔ ایک بیڑا تیار کر کے بحیرہ اسود کے راستے دریائے ڈینیوب میں بھیج دیا گیا۔ جسٹینین نے خود شہر سے نکل کر اناسٹاسیوس والی دیوار کی مرمت کرائی اور اُطری غور ہُنوں کو ساتھ ملا لیا، جو قطری غور ہُنوں کے دُشمن تھے۔ بلغاروں کو، جہاں وہ ٹھہر گئے تھے، آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ آواروں کے خاقان اور

سرداروں کو قسطنطنیہ بلایا گیا اور حسبِ دستورِ سابق شہنشاہی شان و شوکت کے مظاہر سے ان کو متاثر کیا گیا۔

جسٹینین اب اس قدر ضعیف ہو گیا تھا کہ نقل و حرکت کے لیے بھی دوسروں کا محتاج تھا۔ اسی زمانے میں دو آدمی پکڑے گئے، جن کے بارے میں معلوم ہُوا کہ وہ جسٹینین کو قتل کرنے آئے تھے۔ تحقیقات پر انھوں نے بیان دیا کہ یہ قدم بیلی ساریوس کے داروغہ آئزک کے کہنے پر اٹھایا گیا ہے۔ مقصود یہ تھا کہ جسٹینین کو گرفتار کر کے ایک خانقاہ میں بٹھا دیا جائے اور بیلی ساریوس کو شہنشاہ بنا دیا جائے۔ جسٹینین نے بیلی ساریوس کو کوئی اَور سزا نہیں دی لیکن اس سلسلے میں بیلی ساریوس کی پوری جائداد ضبط کر لی۔ پھر سات مہینے بعد جائداد واپس دے دی گئی۔

جسٹینین نے فیصلہ کر دیا کہ میری وفات کے بعد میرا بھانجا جسٹن شہنشاہ ہو۔ اس نے ملکہ تھیوڈورا کی بھانجی صوفیہ سے شادی کر لی تھی۔ ۵۶۳ء میں نوشیرواں سے پچاس سال کے لیے صلح کا معاہدہ ہو گیا۔ ۵۶۵ء کے موسمِ بہار کی ابتدا تھی، جب بیلی ساریوس نے وفات پائی۔ اسی سال جسٹینین کا انتقال ہُوا۔ تراسی برس کی عمر ہو چکی تھی اور سینتیس برس وہ حکمران رہا۔ رات کے وقت یہ واقعہ پیش آیا۔ حاجب نے تڑکے محافظ فوج کے سالار کو اطلاع دی کہ ہمارے آقا کی زندگی بہ حیثیت انسان ختم ہو چکی۔ اس کے عہد کا مؤرخ اگاتھیاس (AGATHIAS) لکھتا ہے کہ وہ بیزنطینم کا پہلا حقیقی حکمراں تھا، جس نے رومیوں کے مطلق العنان آقا کی شان پیدا کی۔ اس کا نام ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور یہی کیفیت اس کے عہد کی ہے۔ ہم اس عہد کا ذکر طبعاً اسی طرح کرتے ہیں، جس طرح آگسٹس یا لوئی چہاردہم کے عہدوں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن ہم پر یہ واضح نہیں کہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔

مقدم ترین امر یہ ہے کہ یہ تبدّل و تغیّر کا دور تھا۔ جسٹینین ۵۰۰ء کے قریب قسطنطنیہ میں داخل ہُوا تو شہر صرف اینٹوں کی عمارتوں پر مشتمل تھا۔ ۵۶۵ء میں وہ دُنیا سے رخصت ہُوا تو نہ صرف شہر کا ہر حصّہ سنگِ مرمر سے مزیّن تھا بلکہ اس نے بالکل ایک نیا شہر اور زمین بند سمندروں کے کنارے ایک نئی سلطنت اپنے پیچھے چھوڑی۔ اس کے جانشین کی زبان پر یہ شکایت تھی کہ خزانہ خالی ہے۔ سرحدوں کی حفاظت کے لیے فوج موجود نہیں

اور پوری سلطنت وحشیوں کے رحم و کرم پر رہ گئی ہے۔ جسٹینین نے ایک شاطر کی حیثیت میں جوڑ توڑ کے ذریعے سے وحشی اقوام کو ان کی جگہ پر رکھا تھا۔ وہ رخصت ہو گیا تو آفت کے ان پرکالوں کو روکنے والا کوئی نہ رہا۔

دُوسرا حِصّہ

(۶۶۵ء - ۱۹۲۴ء)

پہلا باب

روم و ایران کی آویزش

جسٹینین کے بعد

جسٹینین کی وفات سے فتح قسطنطنیہ تک (۱۴۵۳ء) رومی سلطنت کا تاج جن بادشاہوں کے سر پر رکھا گیا، اُن کی تعداد ساٹھ اور ستر کے درمیان ہے۔ صحیح تعداد اس وجہ سے پیش نہیں کی جاسکتی کہ بعض اوقات دو دو تاجدار بہ اشتراک حکومت کرتے رہے۔ اور کم از کم بارہ مختلف خاندان یکے بعد دیگرے بر سرِ حکومت آئے۔ سات سو اٹھاسی سال میں تغیرات کا یہ ہنگامہ سلطنت کی پائداری کا کوئی اچھا ثبوت نہیں سمجھا جاسکتا۔ بعض شہنشاہ بڑی بیدردی سے مارے گئے، بعض کو ایک سے زیادہ مرتبہ تخت نشینی کا موقع ملا۔ سلطنت کی قوت تدریجاً گھٹتی گئی، یہاں تک کہ آخری دور میں قسطنطنیہ کی حیثیت ایک مواج اسلامی سمندر کے درمیان چھوٹے سے جزیرے کی سی رہ گئی تھی۔

جسٹینین نے وفات سے چند سال پیشتر اپنے بھانجے (اپنی بہن وجی لینٹیا[1] کے بیٹے) جسٹن کو جانشین نامزد کر دیا تھا اور اس نے ملکہ تھیوڈورا کی بھانجی صوفیا سے شادی کر لی تھی۔ چونکہ وہ اس نام کا دوسرا بادشاہ تھا، لہٰذا جسٹن ثانی کے لقب سے مشہور ہوا۔

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ خزانہ خالی تھا اور سرحدوں پر حفاظتی فوجیں موجود نہ تھیں۔ جسٹینین اپنی حکمت عملی اور تدبیر آرائی کی بدولت مشکلات کے ہجوم کو شکست دیتا رہا، لیکن جسٹن ان جوہروں سے خالی تھا۔ وہ مجبور تھا کہ خزانے میں روپیہ فراہم کرے اور فوجی قوت تمام سرحدوں پر بٹھا دے تاکہ سلطنت کا کوئی حصہ بیرونی یورشوں کا ہدف نہ بنے۔ مشکلات اتنی بڑھی ہوئی تھیں کہ وہ بیچارہ ان سے عہدہ برآنہ ہو سکا اور ۵۷۴ء میں پاگل ہو گیا۔ ملکہ سپہ سالار ٹائبیریس کی امداد سے حکومت کا کاروبار چلاتی رہی۔ ۵۷۸ء میں جسٹن فوت ہو گیا تو ٹائبیریس شہنشاہ بن گیا اور ملکہ صوفیا نے اس سے شادی کر لی۔

---

[1] VIGILANTIA

جسٹینین کی وفات کے بعد نوشیرواں نے رومی سلطنت کا مشرقی حصہ بُری طرح پامال کر ڈالا تھا۔ مارس[1] نام ایک آزمودہ کار سالار نے ایرانیوں کو پسپائی پر مجبور کر دیا اور ۵۸۲ء میں ٹائبیریس کی وفات پر فوج نے مارس کو شہنشاہ بنا لیا جو کم و بیش بیس سال تاج و تخت کا مالک رہا۔

ایران میں انقلاب

۵۷۹ء میں نوشیرواں (خسرو اوّل) کا انتقال ہُوا تو اس کا بیٹا ہرمز ثالث تخت پر بیٹھا۔ شروع میں بزرجمہر اس کا مشیرِ خاص تھا' اس لیے انتظامات میں کوئی خلل پیدا نہ ہُوا۔ تین سال بعد بزرجمہر پیرانہ سالی کے باعث خانہ نشین ہو گیا تو ہرمز غلط اندیش مشیروں کے زیر اثر آ گیا اور اس نے ظلم و ستم شروع کر دیے۔ بعض صوبوں میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ مغربی جانب سے رومیوں نے پیش قدمی شروع کر دی۔ مشرقی جانب سے ترک خاقان بظاہر معین و رفیق کی حیثیت میں تاتاریوں کا ٹڈی دل ساتھ لے کر آگے بڑھا۔ حالانکہ اس کا مقصود لُوٹ مار کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہرمز سخت پریشان ہو گیا۔ سلطنت کے ایک سالار بہرام چوبیں نے ہمت نہ ہاری اور ترکوں کے سیل کی روک تھام کے لیے تیار ہو گیا' اگرچہ ایرانی اس درجہ ہراس زدہ تھے کہ صرف بارہ ہزار آدمی بہرام کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوئے۔ اس نے ایک درّہ مقابلے کے لیے تجویز کیا اور اس میں جا بجا اپنی فوج بٹھا دی۔ ترکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ وہ بارہ ہزار فوج کو کب خاطر میں لاتے تھے' لیکن بہرام کے ساتھیوں نے اس چابکدستی سے تیروں کا مینہ برسایا کہ تُرک سخت نقصان اُٹھا کر لوٹ جانے پر مجبور ہو گئے۔

ہرمز کو بہرام کا یہ کارنامہ پسند نہ آیا کیونکہ ملک کا بچہ بچہ بہرام کے گیت گانے لگا تھا۔ اس نے معمولی رسمی تحسین کے بعد بہرام کو حکم دیا کہ اب رومیوں کا مقابلہ کرو' جو آذر بائجان میں دریائے ارس[2] کے کنارے ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ بہرام ایک تو طبعاً منچلا آدمی تھا' دوسرے ترکوں کے خلاف

---

[1] MAURICE (۵۸۲ء — ۶۰۲ء)

[2] ARAXAS یہ دریا آرمینیا کے پہاڑوں سے نکل کر مشرقی سمت بہتا ہُوا بحیرۂ قزوین میں گرتا ہے آج کل ایران و روس کی قفقازی سرحد کا بیشتر حصہ یہی دریا ہے۔ خواجہ حافظ نے بھی اپنے ایک مطلع میں اس دریا کا ذکر کیا ہے: اے صبا! گر بگذری بر ساحلِ رودِ ارس بوسہ زن بر خاکِ آں وادی و مشکیں کن نفس

کامیابی نے اس کا حوصلہ بہت بڑھا دیا تھا۔ موقع پر پہنچتے ہی اس نے رومی سالار کو پیغام بھیجا کہ یا تو خود دریا عبور کر کے آؤ یا مجھے عبور کر کے اپنی طرف آنے دو تاکہ قطعی فیصلہ ہو جائے۔ رومیوں نے بہرام کو عبور کرنے کا موقع دے دیا۔ لڑائی ہوئی، جس میں بہرام نے سخت شکست کھائی۔ اگرچہ یہ شکست ہرمز کی سلطنت کے لیے تباہی کا پیغام تھی، تاہم وہ خوش ہوا کہ بہرام کی تذلیل ہوئی۔ بہرام کمک حاصل کرنے کی غرض سے دربار میں پہنچا تو ہرمز نے زنانہ لباس اور ایک چرخہ اسے بہ طور خلعت دیا[1]۔ وہ یہی لباس پہن کر چرخہ اُٹھائے ہوئے فوج کے سامنے چلا گیا اور پوری کیفیت سُنادی۔ فوج نے اُسی وقت بغاوت کا فیصلہ کر لیا۔ اب تمام مخالف قوتیں بہرام کے پاس جمع ہو گئیں۔ ہرمز مارا گیا۔ اس کے بیٹے پرویز (خسرو ثانی) نے بہرام سے مقاومت کی کوشش کی۔ کوئی اچھی صورت نہ نکلی تو وہ بھاگ کر رومی شہنشاہ مارس کے پاس پہنچ گیا۔ ادھر بہرام کے لیے ایرانی سلطنت کا راستہ صاف ہو گیا۔ وہ اپنا سلسلۂ نسب اشکانیوں سے ملاتا تھا۔ اب یہ امید پیدا ہو گئی کہ اشکانیوں کی زائل شدہ سلطنت بحال ہو جائے گی۔

اس اثنا میں ایک طرف ایرانیوں کی شاہ پرستی کا جذبہ تازہ ہو گیا، دوسری طرف پرویز رومی شہنشاہ مارس کی امداد لے کر سلطنت کی بازیافت میں مصروف ہو گیا۔ بہرام بالکل بے یار و مددگار رہ گیا۔ پرویز ایران کا شہنشاہ بن گیا۔ مارس کی امداد نے دونوں سلطنتوں کے تعلقات بھی بہت خوشگوار بنا دیے۔

مارس اور فوکاس

مارس محسوس کر رہا تھا کہ رومی فوج کی حالت اچھی نہیں۔ اس پر بے اندازہ روپیہ خرچ ہو رہا ہے اور وقتاً فوقتاً لشکریوں کو روپیہ دے کر کام لینا پڑتا ہے، ورنہ وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس نے اصلاحات شروع کر دیں تاکہ سرکاری روپیہ ضائع نہ ہو اور فوج میں اطاعت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اس سعی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف جیش بگڑ بیٹھے۔ مارس نے کسی نہ کسی ذریعے سے انھیں ہموار کرنے کی کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ جو لشکر دریائے ڈینیوب پر متعین تھا، اس نے اپنے سالار فوکاس[2] کی سرکردگی میں بغاوت کی اور قسطنطنیہ پہنچ گیا۔ مارس پریشان ہو کر بھاگا اور

---

[1] مقصد یہ تھا کہ تم مرد نہیں عورت ہو لہٰذا گھر بیٹھ کر چرخہ کاتو۔ [2] PHOCAS (سنہ ۶۰۲ء - سنہ ۶۱۰ء)

قسطنطنیہ کے سامنے ایشیائی ساحل پر جا اُترا۔ اُس نے اپنے بڑے بیٹے کو امداد حاصل کرنے کے لیے شہنشاہ ایران کی طرف بھیج دیا۔ فوکاس نے اسے جا پکڑا اور پورے خاندان کو انتہائی بیدردی سے قتل کرا دیا۔ جو بیٹا شاہ ایران کی طرف جا رہا تھا، وہ بھی راستے میں گرفتار ہُوا اور مروا دیا گیا۔

پرویز کو یہ اندوہناک خبریں پہنچیں تو وہ اپنے محسن کا بدلہ لینے کے لیے فوکاس کے خلاف حرکت میں آگیا، لیکن وہ کوئی نمایاں کارروائی نہیں کر سکا تھا کہ فوکاس کے خلاف بھی سازش ہوئی اور ۶۱۰ء میں وہ بُری طرح مارا گیا۔ اس کی جگہ افریقہ کے حاکم کا بیٹا شہنشاہ بن گیا، جو ہرقل اوّل کے نام سے مشہور ہُوا۔ قسطنطنیہ کی تاریخ میں اسے بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ یہی ہرقل ہے، جس سے مسلمانوں نے شام اور مصر چھینے تھے۔

پرویز کا عُروج وزوال

فوکاس کے قتل پر ماریس کے انتقام کا معاملہ ختم ہو چکا تھا، لیکن اب پرویز نے کامیابی کے جوش میں رُکنا پسند نہ کیا۔ ۶۱۱ء سے اس کی فتوحات کا آغاز ہُوا۔ انطاکیہ، افامیا، حمص، قیساریہ وغیرہ فتح ہو چکے تھے۔ ۶۱۳ء میں دمشق ۶۱۴ء میں یروشلم مسخر ہُوا، یہاں تک کہ پرویز وہ صلیب بھی اٹھا کر لے گیا، جو مسیحی عقیدے کے مطابق حضرت مسیحؑ سے منسوب تھی اور دنیائے مسیحیت کے نزدیک سب سے بڑا تبرک سمجھی جاتی تھی۔ یروشلم کے عظیم ترین اور مقدس ترین کلیسا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔

۶۱۵ء میں ایرانی فوجیں کیلسی ڈون پہنچ گئیں، جو قسطنطنیہ کے سامنے ایشیائی ساحل پر مشہور مقام تھا اور وہاں سے قسطنطنیہ صرف میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ ۶۱۹ء میں ایرانیوں نے مصر فتح کر لیا۔ اس اثناء میں پرویز نے اواروں سے سمجھوتا کر لیا، جو قسطنطنیہ پر کئی بار پیشقدمی کر چکے تھے۔ ادھر ہسپانیہ پر وزیگاتھ قابض ہو گئے۔ ہرقل بھاگ جانے کی تدبیریں سوچ رہا تھا، لیکن اسقفِ اعظم نے اسے روکے رکھا۔ پھر اس نے شام میں پیشقدمی کی۔ وہاں سے ہٹ کر قفقاز کی جانب بڑھا اور تین مہموں میں قفقاز کے مختلف مقامات کو مسخر کرتا ہُوا شمالی جانب سے ایران پر حملہ آور ہُوا۔ ۱۲۔ دسمبر ۶۲۷ء کو نینوا میں ایک خوفناک جنگ ہوئی۔ ایرانیوں نے شکست فاش کھائی۔ پرویز کو جب کوئی چارہ نظر نہ آیا تو وہ اپنے اُس بیٹے کو جانشین بنا کر خود بھاگ جانا چاہتا تھا، جو اس کی ملکہ شیریں کے بطن سے تھا۔ اس کے بڑے بیٹے نے فوج کو ساتھ ملا کر خود بادشاہی سنبھال لی۔ پرویز

گرفتار ہوا۔ چند روز بعد قید ہی میں مارا گیا۔ اس کے بڑے بیٹے شیرویہ نے اپنے تمام بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہرقل سے صلح کر لی۔ مقدس صلیب واپس دے دی۔ چند ماہ بعد وبا میں وہ بھی ختم ہو گیا۔ ایرانی سلطنت کی ابتری کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ دو تین سال میں کم و بیش دس افراد یکے بعد دیگرے بادشاہ بنائے گئے۔ آخر یزدجرد کے سر پر تاج رکھا گیا، جو نوشیراں کی اولاد میں سے تھا۔ یہ آخری ساسانی بادشاہ تھا۔

غلبۂ روم

رسول اللہ صلعم کی دعوت کا آغاز ہو چکا تھا اور حضورؐ ابھی مکہ معظمہ ہی میں تھے کہ رومیوں کے خلاف ایرانیوں کی فتوحات کمال پر پہنچ گئیں۔ مسلمانوں کے نزدیک نصاریٰ اہلِ کتاب تھے اور ایرانیوں کے مقابلے میں نصاریٰ کو ترجیح دی جاتی تھی۔ قریش نے ایرانیوں کی کامیابی اور رومیوں کی ناکامی کو بھی مسلمانوں کے خلاف استہزاء کا ذریعہ بنا لیا۔ ۶۱۴ء یا ۶۱۵ء میں سورۂ روم نازل ہوئی، جس میں یہ پیشگوئی تھی کہ نو سال کے اندر اندر رومی مغلوبیت کے بعد غلبہ حاصل کر لیں گے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس پیشگوئی کے سلسلے میں ایک سو اونٹ کی شرط بدی۔ یہ پیشگوئی اس وقت پوری ہوئی، جب ہرقل نے انتہائی مایوسی کے عالم میں جوابی حملے شروع کیے اور وہ خلافِ توقع غیر معمولی طور پر کامیاب ہوئے۔

جب رسول اللہ صلعم نے حکمرانوں اور رئیسوں کے نام نامہ ہائے مبارک بھیج کر انھیں اسلام کی دعوت دی تو ایک نامۂ مبارک پرویز کو بھی بھیجا گیا تھا، جو محض اس بات پر خفا ہو گیا کہ داعی نے اپنا نام پہلے لکھا ہے۔ اس نے نامۂ مبارک چاک کر ڈالا اور یمن کے ایرانی گورنر بازان کے نام فرمان بھیجا کہ حجاز میں نبوت کا جو نیا مدعی اٹھا ہے، اسے گرفتار کر کے بھیج دیا جائے۔ چنانچہ دو آدمی مدینۂ منورہ پہنچے تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ تمھارے بادشاہ کو خدا نے ہلاک کر ڈالا۔ اُس وقت پرویز قتل ہو چکا تھا اور جس طرح اس نے نامۂ مبارک کو پُرزے پُرزے کیا تھا، اسی طرح خود اس کی سلطنت کے پُرزے اُڑ گئے۔

ہرقل اور مسلمان

ہرقل شام پر از سرِ نو قابض ہو چکا تھا۔ رومی سلطنت نے ان قبائلِ عرب کے لیے وظیفے مقرر کر رکھے تھے، جو شام میں توطن اختیار کر چکے تھے اور برائے نام مسیحی ہو گئے تھے۔ ان کے ذمے یہ کام تھا کہ رومی سلطنت کی جنوبی حدوں کی حفاظت کریں۔ ہرقل نے

اقتصادی مصلحت کی بنا پر یہ وظیفے بند کر دیے ۔ اس سے قبائل میں بے چینی بڑھی اور اس بے چینی نے کشمکش کی صورت اختیار کر لی ۔ اسی طرح حجاز کی شمالی سرحد پر وہ لڑائیاں شروع ہوئیں، جن میں مسلمان عربوں کو اپنے بھائیوں کی امداد کے لیے نکلنا پڑا ۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت میں تین فوجیں شام کی طرف بڑھیں ۔ ایک فوج کی قیادت یزیدؓ بن ابوسفیان کے ہاتھ میں تھی ۔ دوسری شرجیلؓ بن حسنہ اور تیسری عمروؓ ابن العاص کے زیرِ قیادت تھی ۔ پہلی لڑائی وادی العربہ میں ہوئی، پھر لڑائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، یہاں تک کہ خالدؓ بن ولید کو عراق سے شام جانے کا حکم ہوا ۔ انھوں نے نہایت خوفناک صحرائی علاقے کا راستہ اٹھارہ دن میں طے کیا اور دمشق کے قریب پہنچ گئے ۔ ہرقل نے بڑی بھاری فوج جمع کی ۔ ۳۰ اگست ۶۳۶ء کو یرموک میں آخری فیصلہ کن جنگ ہوئی اور شام رومی سلطنت سے ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا ۔ خود ہرقل کو بھی کہنا پڑا: ”الوداع اے سرزمینِ شام! دشمن کے لیے کتنا اچھا ملک چھوڑ رہا ہوں۔“ کچھ مدت بعد مصر بھی فتح ہو گیا ۔

دوسرا باب

قسطنطنیہ کے محاصرے

محاصروں کی تعداد کوئی شخص یقینی اور قطعی طور پر نہیں بتا سکتا کہ قسطنطنیہ کا محاصرہ کتنی مرتبہ ہُوا۔ ذان ہمیر[۱] نے لکھا ہے کہ ۷۴۷ ق م سے ۱۳۵۳ء تک قسطنطنیہ انتیس مرتبہ محصُور ہُوا[۲]۔ مختلف محاصروں کا ذکر بھی کیا ہے، لیکن اکثر کے متعلق کوئی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ بہر حال یہ عجیب و غریب شہر اکثر مختلف فاتحوں کے لیے وجہِ کشش بنا رہا اور جسے موقع ملا، اس نے قبضہ و تصرف کے لیے سعی و کوشش میں حتی المقدور کوتاہی نہ کی۔ طویل امن کا دور عثمانیوں ہی کے زمانے میں اسے حاصل ہُوا۔

عربوں کا پہلا حملہ ہرقل نے ۶۴۱ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کے خاندان کے کم و بیش سات افراد یکے بعد دیگرے تاجدار بنے اور ۷۱۵ء میں اس خاندان کا خاتمہ ہُوا۔ پھر اس کی جگہ لیو[۳] ثالث (۷۱۵ء۔ ۷۴۱ء) نے نئے خاندانِ حکومت کی بُنیاد رکھی۔ اس نئے خاندان کے بادشاہوں کی تعداد بھی سات ہی تھی۔

قسطنطنیہ پر عربوں کے پہلے حملے کی تاریخ واضح نہیں۔ عربی اور دوسرے مورخین کے بیانات مختلف ہیں۔ گبن ابوالفدر کے بیان کو قابلِ اعتماد سمجھتے ہوئے ۴۸ھ (۶۶۸ء) کو زیادہ قابلِ اعتماد قرار دیتا ہے۔ بعض دوسری اسلامی روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ لیکن بعض دوسری روایات سے واضح ہوتا ہے کہ حملہ ۵۲ھ یا ۵۳ھ (۶۷۲ء یا ۶۷۳ء) میں ہُوا اور اسلامی لشکر[۴] نے پانچ چھ سال تک محاصرہ جاری رکھا۔ ۶۷۸ء میں تیس سال کے لیے صلح ہوگئی[۵]۔

تاریخ کی طرح محاصرے کی تفصیلات وغیرہ میں بھی اختلاف ہے۔ اکابر تر کام میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ ابنِ زبیرؓ، حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ، حضرت ابوایوبؓ انصاری اور حضرت

---

[۱] CONSTANTINOPLE TO-DAY [۲] VON HAMMER [۳] LEO III [۴] ماڈرن لائبریری ایڈیشن نیویارک جلد سوم ص ۲۱۱ حاشیہ [۵] انسائیکلوپیڈیا آف ہسٹری ص ۱۷۴

امام حسینؓ کے نام بھی مذکور ہیں۔ یہ حملہ حضرت امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں ہوا تھا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سفیان بن عوف پورے لشکر کے سالارِ اعظم تھے[1]۔ ایک روایت میں حضرت فضالہ بن عبیدؓ انصاری کو لشکر کا سالارِ اعظم بتایا گیا ہے[2]۔ ایک روایت میں مذکور ہے کہ مصر و شام کے دستے الگ الگ تھے۔ مصری فوج کے سرعسکر مشہور صحابی عقبہ بن عامر جہنی عاملِ مصر تھے۔ ایک دستہ فضالہ ابن عبیدؓ کے ماتحت تھا، ایک جماعت عبدالرحمٰن بن خالدؓ بن ولید کے زیرِ قیادت تھی[3]۔ تمام روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ یزید بن معاویہؓ بھی اس لشکر کے ساتھ تھا[4]۔

اس میں شبہ نہیں کہ حملہ بڑے اہتمام سے کیا گیا تھا کیونکہ قسطنطنیہ کا موقع اور محل بھی ایسا تھا کہ اُس زمانے کے جنگی آلات و فنون کے اعتبار سے اسے مسخر کر لینا آسان نہ تھا۔ پھر شہر کے دفاعی استحکامات کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ عربوں کے پاس نہایت اچھا بیڑا تھا۔ چنانچہ فوج مصر سے بیڑے ہی میں روانہ ہوئی تھی اور بڑا درِ دانیال سے گزرتا ہوا بحیرۂ مرمرا میں پہنچ گیا۔

مستقل مرکز

درِ دانیال سے بحیرۂ مرمرا میں داخل ہوں تو تھوڑے فاصلے پر چند جزیرے ملتے ہیں نیز ایشیائے کوچک کا ایک حصہ جزیرہ نما کی شکل میں آگے بڑھا ہوا ہے۔ پُرانے زمانے میں اسے کزیکس[5] کہتے تھے۔ عربی تاریخوں میں اسے جزیرہ ارواد کہا گیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اس آگے بڑھے ہوئے حصے کی حیثیت جزیرے کی تھی۔ بعد میں خشکی کی ایک تنگنائے کے ذریعے سے یہ ایشیائے کوچک کے ساتھ مل گیا اور جزیرہ نما بن گیا۔

گبن کے بیان کے مطابق اس مقام سے قسطنطنیہ کا فاصلہ تقریباً اسّی میل تھا۔ عربوں نے اس مقام کو اپنا مستقل مرکز بنالیا۔ یہیں رسد کے ذخیرے جمع کر لیے۔ وہ اپریل سے ستمبر تک چھ مہینے

---

[1] سیر الصحابہؓ جلد ششم ص ٦٦۔ [2] سیر انصار حصہ دوم ص ١٢٦۔ [3] سیر انصار جلد اوّل ص ١٠٣۔

[4] مسلمانوں میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے جوش و ولولہ کی کیفیت یہ تھی کہ جہاں موقع پاتے، ضرور شریک ہوتے۔ حضرت ایوبؓ انصاری خاصے سن رسیدہ ہو چکے تھے، لیکن اکثر لڑائیوں میں شریک ہوتے رہے۔ قسطنطنیہ پر حملے میں شرکت کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہوئی کہ رسول اللہ صلعم کا ارشاد تھا: "کیا اچھا وہ لشکر ہوگا اور کیا اچھا وہ امیر ہوگا، جو ہرقل کے شہر پر حملہ آور ہوگا"۔

[5] CYZICUS

قسطنطنیہ کا محاصرہ جاری رکھتے۔ سردی کا موسم آجاتا تو محاصرہ چھوڑ کر اس مرکز یعنی جزیرہ ارواد میں جابیٹھتے اور وقتاً فوقتاً یورپی اور ایشیائی ساحلوں پر یورشیں کرتے رہتے۔ یہ سلسلہ کم وبیش چھ سال تک جاری رہا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عرب اس شہر کو فتح کرنے کے لیے کس اہتمام و استقامت سے کام لے رہے تھے۔

بعض روایات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام مجاہد دستے چھ سات سال برابر میدانِ جنگ میں موجود نہ رہے۔ اغلب ہے کہ تھوڑی تھوڑی مدّت کے بعد مختلف دستوں کا مبادلہ ہوتا رہا ہو۔ حضرت فضالہ بن عبیدؓ کے متعلق قطعی طور پر معلوم ہے کہ انھوں نے ۵۳ھ (۶۷۳ء) میں بمقام دمشق وفات پائی۔ امیر معاویہؓ نے خود جنازے کو کندھا دیا اور نماز پڑھائی۔ ظاہر ہے کہ وہ ابتدائی لشکر کے ساتھ قسطنطنیہ گئے اور کچھ مدّت بعد واپس چلے آئے۔

عربی بیڑا فوج کے ساتھ اس مقام پر لنگر انداز ہوا جو ہیبڈومن[1] سے قریب تھا اور قسطنطنیہ سے اس کا فاصلہ کوئی سات میل سمجھنا چاہیے۔ فوج نے خشکی پر اترتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا۔ بیڑا ضرورت کی چیزیں مستقل مرکز یعنی جزیرہ ارواد سے پہنچاتا رہا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاخِ زریں میں داخل نہ ہوا۔ غالباً اس لیے کہ اندیشہ تھا، یونانی جہاز "یونانی آگ" کے استعمال سے نقصان پہنچائیں گے۔

پرجوش یورشیں

غرض چھ سات سال کی زبردست کوششوں کے باوجود شہر فتح نہ ہو سکا۔ عربوں کے جوش و ایثار کے سلسلے میں محض یہی کہہ دینا کافی ہے کہ عبد العزیزؓ بن زرارہ کلبی شوقِ شہادت میں رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھتے تھے، لیکن مدافعین کا استقلال انھیں قدم قدم پر روک دیتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ رومیوں کی صفوں کے اندر گھس گئے اور نیزوں کے زخموں سے شہادت پائی۔

بعض مسلمانوں نے عبد العزیزؓ کی شانِ شجاعت دیکھ کر کہا کہ یہ طرزِ عمل آیت قرآن لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ (اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو) کے صریح خلاف ہے۔ حضرت ابو ایوبؓ انصاری نے یہ سنا تو فرمایا:

---

[1] HEBDOMON یہاں رومیوں کے زمانے میں ایک قصرِ شاہی تھا۔

"لوگو! تم نے اس آیۂ شریفہ کے یہ معنی سمجھے، حالانکہ اس کا تعلق انصار کے ارادۂ تجارت سے ہے۔ اسلام کے امن و فراخی کے بعد انصار نے یہ ارادہ کیا کہ گزشتہ سالہائے جہاد و مشغولیت میں جو نقصان اٹھانے پڑے ہیں، ان کی تلافی کی جائے۔ پس ہلاکت جہاد میں نہیں بلکہ ترکِ جہاد اور فراہمیٔ مال میں ہے"[1]۔

حضرت ایوبؓ کی وفات

بہرحال عربوں کی مسلسل کوششوں کے باوجود شہر فتح نہ ہو سکا اور اسلامی فوج میں وبا پھوٹ پڑی، جس کی وجہ سے بہت جانی نقصان ہوا۔ گبن لکھتا ہے کہ کم و بیش تیس ہزار نفوس شہادت پا گئے[2]۔ حضرت ابوایوبؓ نے بھی اسی وبا میں وفات پائی۔ یزید عیادت کے لیے گیا اور پوچھا کہ کوئی وصیت کرنی ہو تو فرمایئے، اس کی تعمیل کی جائے۔ حضرت نے فرمایا: "دشمن کی سرزمین میں جہاں تک جا سکو، میرا جنازہ وہیں لے جا کر دفن کرنا"۔ چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی۔ فوج پوری جنگی تیاری سے میت کو قسطنطنیہ کی فصیل کے قریب لے گئی اور وہیں رسول اللہ صلعم کے اس مقدس صحابی اور مدینۂ منورہ میں آپ کے پہلے میزبان کو آغوشِ مرقد کے حوالے کیا گیا۔ چونکہ اندیشہ تھا اہلِ قسطنطنیہ اسلامی لشکر کی واپسی کے بعد میت کی بے حرمتی نہ کریں، اس لیے مزار زمین کے برابر کر دیا گیا۔ یزید نے مراجعت کے وقت اہلِ شہر کو متنبہ کر دیا کہ اگر اس مزارِ پاک سے کوئی گستاخی روا رکھی گئی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کی وسیع سلطنت میں کہیں بھی ناقوس نہ بج سکے گا[3]۔

حضرت ابوایوب کا مزار سات سو اسی سال تک بے نشان رہا۔ ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح عثمانی نے قسطنطنیہ فتح کیا تو ایک بزرگ کی نشان دہی پر مزار تعمیر ہوا، جو اب تک قسطنطنیہ کا مقدس ترین مقام سمجھا جاتا ہے۔

یہ حملہ جس رومی شہنشاہ کے عہد میں ہوا، اس کا نام قسطنطین رابع (۶۶۸ء۔ ۶۸۵ء) تھا اور وہ ہرقل کے خاندان کا پانچواں شہنشاہ تھا۔

دوسرا محاصرہ

حضرت امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید مسند نشین ہوا۔ اس نے صرف تین سال حکومت کی اور اس کا عہد داخلی کشمکشوں ہی میں ختم ہو گیا۔ اس کے بیٹے معاویۂ ثانی

---

[1] سیر انصار جلد اوّل ص ۱۰۳، ۱۰۴ ۔ [2] گبن جلد سوم ص ۲۱۳ ۔ [3] سیر انصار جلد اوّل ص ۱۰۴

نے حکومت سے دست برداری اختیار کر لی۔ پھر اموی حکومت مروانی شاخ میں منتقل ہو گئی اور اسلامی مرکز کو داخلی کشمکشوں سے اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ کسی بیرونی مسئلے پر توجہ ہو سکتی۔ عبدالملک ابنِ مروان (۶۸۵ء - ۷۰۵ء) نے پھر اسلامی حکومت کی بنیادیں استوار کیں۔ اس کے بیٹے ولید (۷۰۵ء - ۷۱۵ء) کے عہدِ حکومت میں بہت فتوحات ہوئیں۔ مغرب میں مسلمان ہسپانیہ پر قابض ہو گئے اور انھوں نے فرانس پر حملے شروع کر دیے۔ مشرق میں وہ ایک طرف سرحدِ چین تک پہنچ گئے۔ دوسری طرف انھوں نے سندھ اور مغربی پنجاب پر تسلط حاصل کر لیا۔ ولید کی وفات کے بعد سلیمان بن عبدالملک (۷۱۵ء - ۷۱۷ء) تختِ خلافت پر متمکن ہوا تو اُس نے از سرِ نو قسطنطنیہ کی تسخیر کے لیے اعلیٰ پیمانے پر انتظامات کیے اور اپنے بھائی مسلمہ کو سالار بنا کر اس غرض سے بھیجا کہ جس طرح مسلمان جنوبی و مغربی گوشے سے یورپ میں داخل ہو کر قلب کی طرف بڑھ رہے ہیں، اسی طرح جنوبی و مشرقی گوشے سے بھی داخلے کا انتظام ہو جائے تاکہ دونوں طرف سے پیشقدمی کرنے والی فوجیں یورپ کے عین وسط میں مل جائیں۔

اُس زمانے میں اناسٹاسیوس ثانی رومی سلطنت کا فرمانروا تھا۔ اُس نے اہلِ شہر کو حکم دے دیا تھا کہ جس کے پاس تین برس کے لیے غذائی جنسیں موجود نہ ہوں، وہ شہر چھوڑ کر چلا جائے، لیکن لیو ثالث اساری (۷۱۵ء - ۷۴۱ء) نے اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا اور خود شہنشاہ بن گیا۔

مُسلمہ کی پیشقدمی

گبن لکھتا ہے کہ مُسلمہ کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار عرب اور ایرانی فوج تھی۔ اس فوج کا بڑا حصہ سواروں پر مشتمل تھا۔ مُسلمہ یہ فوج لے کر خشکی کے راستے ایشیائے کوچک میں سے بڑھا۔ اثنائے پیشقدمی میں بعض شہروں کا محاصرہ کرنا پڑا۔ مثلاً الطوانہ[1] عموریہ[2] اور برگمس[3]۔ اس طرح تاخیر ہوئی۔ آخر اس نے دردانیال سے سمندر کو عبور کیا اور تھریس میں سے گزرتے ہوئے فصیل تک پہنچ کر قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔ اُدھر مصر و شام سے بھاری بیڑا آ پہنچا۔ تجویز یہ تھی کہ شہر پر بیک وقت خشکی اور تری دونوں جانب سے حملہ کیا جائے۔

زبردست کشمکش

مُسلمہ نے بڑی مستعدی سے حملہ کیا۔ گبن لکھتا ہے، یونانیوں کے بیان کے

ھ۱ TYANA　ھ۲ AMORIUM　ھ۳ PERGAMUS

مطابق اسلامی بیڑا اتنا زبردست تھا کہ سمندر میں ہر سمت جہاز ہی جہاز نظر آتے۔ رومی شہنشاہ نے وہ بھاری زنجیر اُتروادی، جو "شاخ زرّیں" کے دہانے پر اس غرض سے بندھی رہتی تھی کہ کوئی اجنبی جہاز اندر داخل نہ ہو سکے۔ رومیوں کی غرض یہ تھی کہ "شاخ زرّیں" کو بندش سے پاک دیکھ کر اسلامی جہاز اندر چلے آئیں، پھر آتشبار یونانی جہازوں کے ذریعے سے انھیں جلا دیا جائے۔ جہاز اندر تو نہ آئے لیکن یونانیوں نے بحیرۂ مرمرا ہی میں انھیں آگ لگادی، جس سے بہت سخت نقصان ہُوا، لیکن مُسلمہ بڑا صاحبِ عزم سالار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ خوفناک لڑائیوں میں نقصان سے مفر نہیں اور وہ تسخیرِ شہر کے لیے ہر ممکن سعی و کوشش میں مصروف رہا۔ اس اثناء میں خبر پہنچی کہ خلیفہ سلیمان نے اچانک قنسرین (شام) میں وفات پائی اور مرنے سے پہلے اپنے چچیرے بھائی اور بہنوئی حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ سلیمان نے بڑی زبردست کمک بھیجنے کا انتظام کر لیا تھا، لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ محاصرے کو طول دینے پر راضی نہ ہوئے اور ان کے فرمان کے تحت مُسلمہ کو مراجعت کرنی پڑی۔ گویا قسطنطنیہ پر یہ دوسرا حملہ بھی سترہ مہینے کی سعی و کوشش کے بعد بیچ ہی میں چھوڑنا پڑا۔ امویوں کے دَور میں قسطنطنیہ کی تسخیر کے لیے اَور کوئی کوشش نہ ہوئی۔

تیسرا باب

رومی اور عبّاسی

بنو امیّہ کا زوال حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کا عہدِ حکومت خلافتِ راشدہ کے بعد حکمرانی کے اسلامی اصول وخصائص پر کاربندی کا بہترین دَور ہے، لیکن وہ دور دو اڑھائی سال سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ان کی وفات کے بعد اموی سلطنت پر زوال طاری ہوگیا۔ اگرچہ ہسپانیہ اور فرانس میں اسلامی فتوحات جاری رہیں، لیکن خلافت کے مرکزی اور مشرقی حصّوں میں بغاوتوں اور گروہ بندیوں نے بہت نازک حالت پیدا کردی، یہاں تک کہ آخری اموی خلیفہ مروان ثانی ۷۵۰ء میں مارا گیا اور عبّاسی اسلامی سلطنت کے مالک بن گئے۔ اب مرکزِ حکومت دمشق کے بجائے بغداد میں منتقل ہوگیا۔

مذہبی اختلافات جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے، قسطنطنیہ میں ہرقل کا خاندان ختم ہوچکا تھا اور نیا خاندان برسرِ حکومت آگیا تھا، جس کا پہلا شہنشاہ لیو ثالث تھا اور اسے بالعموم لیو اساری کہتے ہیں۔ یہ لوگ آرتھوڈکس مسیحیت کے پیرو تھے اور انھیں پاپایانِ رومہ سے اختلاف تھا۔ اس اختلاف کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ قسطنطنیہ کے مسیحی شہنشاہ عموماً بین بین چلتے رہے۔ جسٹینین نے یہ کوشش کی تھی کہ پاپایانِ رومہ کا تفوق قائم ہوجائے۔ لیو اساری ان بتوں، مجسّموں اور تصویروں کی پرستش کا قائل نہ تھا، جو رومیوں کے زیرِ اثر پاپائی مسیحیت کا لاینفک جزو بن چکی تھیں۔ لیو نے بڑے اہتمام سے بتوں، اور مجسّموں اور تصویروں کے خاتمے کی ٹھان لی۔ عرفِ عام میں اس عمل کو "بُت شکنی" کہا جاتا ہے۔ گویا لیو "بُت شکن" تھا۔ اس وجہ سے مغربی مسیحی اور پاپایانِ رومہ مذہباً ان لوگوں کے سخت مخالف ہوگئے تھے۔ اس کی صرف ایک مثال پیش کردینا کافی ہے۔ لیو ثالث کا بیٹا قسطنطین خامس "بت شکنی" میں باپ سے بھی دو قدم آگے بڑھا ہُوا تھا۔ وہ کم وبیش چھتیس ۳۶ سال حکمران رہا۔ مغربی مسیحیوں نے اس کی تصویر ایسے انداز میں پیش کی کہ زنجیریں پہنا کر اسے جہنّم کے سب سے نچلے طبقے میں شیاطین کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ اس کے برعکس آرتھوڈکس مسیحی اسے خدارسیدہ سمجھ کر اس کی قبر پر دعائیں مانگنے جاتے تھے۔

لیو کا خیال تھا کہ عام مسیحیوں میں اوہام پرستی بڑھ گئی ہے۔ وہ ذاتی جد و جہد کے بجائے معجزوں اور کرامتوں کے خواہاں رہتے ہیں اور رہبانیت بہت ترقی کر رہی ہے۔ وہ ان تمام امور کے انسداد کا خواہاں تھا۔ یہ سرگرمی بھی مزید مخالفت کا باعث بن گئی۔

رومیوں کی پیشدستی

امویوں کے عہدِ زوال میں رومیوں کو موقع مل گیا اور انھوں نے جگہ جگہ جوابی حملے شروع کر دیے۔ عبّاسیوں کو اندرونی استحکامات کی تکمیل میں کچھ وقت لگا۔ رومیوں کے لیے پیشدستی کا یہ زرّیں موقع تھا۔ آخر مہدی عبّاسی کے زمانے میں رومیوں سے بدلا لینے کے انتظامات مکمل ہوئے اور خلیفہ نے ایک فوج اپنے بیٹے ہارون کی سرکردگی میں قسطنطنیہ پر یورش کے لیے بھیج دی۔ یہ سلسلہ دو سال قائم رہا (۷۸۳ء - ۷۸۵ء) اُس وقت قسطنطین سادس اور اس کی ماں ملکہ آئرین[1] بہ اشتراک حکمرانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ہارون پیشقدمی کرتا ہُوا اسقوطری (اسکدار) پہنچ گیا، جو قسطنطنیہ کے سامنے ہے۔ آئرین نے خراج کا وعدہ کر کے صلح کر لی۔

۷۸۵ء میں خود ہارون خلیفہ بن گیا۔ اُدھر آئرین اور اس کے بیٹے میں اختلاف پیدا ہُوا۔ آئرین نے بیٹے کی آنکھیں نکلوا دیں اور ۷۹۷ء میں وہ فوت ہو گیا۔ آئرین تنہا سلطنت کی مالک بن گئی۔ نسی فورس[2] (نقفور) اس کا خزانچی تھا۔

نسی فورس کی تخت نشینی

نسی فورس نے ۸۰۲ء میں بعض بلند پایہ کارکنانِ حکومت کو ساتھ ملا کر سازش کی۔ آئرین کو تخت سے اُتارا اور خود شہنشاہ بن گیا۔ معزولی کے بعد آئرین نسی فورس کے سامنے پیش ہوئی تو اس نے نئے بادشاہ کی بدعہدی صاف صاف واضح کر دی اور ساتھ ہی یہ کہا: "میں بہت سے انقلابات دیکھ چکی ہوں۔ اب اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی کہ کسی گوشے میں جا بیٹھوں اور عزّت و آرام کی زندگی بسر کروں"۔ نسی فورس اس کے لیے معمولی گزارے کا انتظام بھی کرنے پر آمادہ نہ ہُوا اور کہتے ہیں کہ آئرین کی زندگی کے باقی ایّام جزیرہ لس بوس[3] میں بسر ہوئے۔ گزارے کے لیے اسے چرخہ

---

[1] IRENE
[2] NICEPHORUS جیسا کہ متن میں درج ہے، عرب اسے نقفور کہتے تھے۔
[3] LESBOS ایشیائے کوچک کے ساحل سے قریب ایک مشہور جزیرہ، جسے میٹلین (MYTILENE) بھی کہتے ہیں۔

کاتنا پڑتا تھا۔

نسی فورس کے متعلق گبن لکھتا ہے:

"یقیناً بہت سے مستبد حکمران گزرے ہیں، جو نسی فورس سے زیادہ مجرم تھے، لیکن اپنی رعایا میں اس سے زیادہ گہرا ہمہ گیر تنفر شاید کسی نے پیدا نہ کیا۔ اس کی سیرت تین مکروہ عیوب سے داغدار تھی: ریاکاری، محسن کُشی اور حرص۔ وہ ہر نیکی سے عاری تھا اور تلافی کے لیے اس میں کوئی اعلیٰ جوہر بھی موجود نہ تھا۔ جوہروں سے معرّا ہونے کے باوجود اس میں کوئی پسندیدہ خصوصیت نہ تھی۔"[۱]

ہارون الرّشید کے نام خط

یہ نسی فورس تھا، جس نے سازش سے سلطنت پر متصرّف ہوتے ہی بہ زعم خود یہ فیصلہ کیا کہ خلافت عبّاسیہ کی خراج گزاری کا طوق گردن سے نکال ڈالے۔ اس نے ہارون الرّشید کو ایک خط بھیجا، جس میں شطرنج کے استعارے استعمال کرتے ہوئے لکھا:

"ملکہ نے تمھیں "رُخ" اور اپنے آپ کو "پیادہ" سمجھا۔ وہ بُزدل عورت خراج ادا کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ حالاں کہ اسے وحشیوں[۲] سے دُگنا خراج لینا چاہیے تھا۔ تم نے بے انصافی سے جو کچھ وصول کیا، وہ واپس کرو یا تلوار کے فیصلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"[۳]

جس قاصد کے ہاتھ یہ خط بھیجا تھا، اسی کے ہاتھ یونانی تلواروں کا ایک گٹھا بھیج دیا تھا۔ قاصد نے خط پیش کرنے کے بعد یہ مُٹھا بھی تخت کے سامنے رکھ دیا۔ ہارون الرّشید خط پڑھ کر اور تلواروں کا مُٹھا دیکھ کر مسکرایا۔ اپنی مشہور شمشیر "صمصامہ" اٹھائی اور ایک ہی ضرب سے یونانی تلواروں کے ٹکڑے کر ڈالے۔

۱؎ گبن ماڈرن لائبریری ایڈیشن جلد دوم ص ۸۸۳ ۲؎ واضح رہے کہ رومی شاہنشاہ تمام مسلمانوں کو عموماً وحشی ہی کہتے تھے حالانکہ کم از کم عباسیوں کا تمدّن اتنا بلند تھا کہ شاید آج کا یورپی تمدّن بھی اس کے مقابلے میں فوقیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ۳؎ گبن جلد دوم ص ۲۴۰

شہرۂ آفاق مکتوب

اس کے بعد ہارون الرشید نے نسی فورس کے نام وہ مکتوب لکھوایا جو اختصار، جامعیت اور قاطعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے اور اسے صدیوں سے عالمگیر شہرت حاصل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امیر المومنین ہارون الرشید کی طرف سے رومی کتے نسی فورس کے نام۔

او کافر ماں کے بیٹے! میں نے تیرا خط پڑھا۔ اس کا جواب تو سنے گا نہیں، آنکھوں سے دیکھے گا۔[1]

یہ محض دھمکی نہ تھی بلکہ ہارون الرشید خون آشام لشکر کے ساتھ رومی شہنشاہ کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گیا۔ نسی فورس کے خواب و خیال میں یہ بات نہ آئی تھی کہ ہارون اتنی تیزی اور مستعدی سے کام لے گا۔ اسے کوئی راہِ نجات نظر نہ آئی تو سرِ تسلیم خم کر دیا اور پہلے کی طرح خراج ادا کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ گبن نے لکھا ہے کہ ہارون الرشید نے اپنا جواب فریجیا[2] کے میدانوں میں خون اور آگ کے حروف میں ثبت کیا۔

نسی فورس کا حشر

نسی فورس جتنا بزدل اور حریص تھا، اتنا ہی بدعہد بھی تھا۔ خلیفہ ادائے خراج کا وعدہ لے کر لوٹ آیا تو نسی فورس نے اپنا عہد توڑ دیا اور یہ سمجھتا رہا کہ موسم سرما آ گیا ہے، خلیفہ سردی میں کہاں پیشقدمی کرے گا۔ ہارون اُس وقت رقہ میں مقیم تھا، جو دریائے فرات کے کنارے واقع ہے۔ اگرچہ یہ مقام قسطنطنیہ سے بہت دُور تھا اور سردی کے موسم میں فوج کے ساتھ پہاڑی علاقے سے گزرنا بہت مشکل تھا، تاہم خلیفہ عین موسم سرما میں بدعہد نسی فورس کو سزا دینے کے لیے دوبارہ موقع پر پہنچ گیا۔ نسی فورس نے میدانِ جنگ میں تین زخم کھائے اور بھاگ نکلا۔ اس کی رعایا کے چالیس ہزار افراد مارے گئے۔ خلیفے نے پورے ایشیائے کوچک کو پامال کر ڈالا۔ اسلامی بیڑے نے جزیرہ روڈس پر سخت حملہ کیا۔ آخر بحیرۂ اسود سے جزیرہ قبرص تک

---

[1] گبن جلد دوم ص ۲۴۰ [2] PHRYGIA ایشیائے کوچک کی پرانی تقسیمات میں یہ ایک صوبہ تھا، جو ایشیائے کوچک کے مغربی حصے میں واقع تھا۔ عموریہ (AMORIUM) اسی صوبے کا شہر تھا۔

ہر طرف تباہی پھیل گئی تو نسی فورس کو پھر صلح کے لیے التجا کرنی پڑی۔ قرار یہ پایا کہ ہرقلیہ ہمیشہ کے لیے کھنڈر کی حالت میں پڑا رہے اور رومیوں کو ہر لحظہ ان کی بدعہدی کا انجام یاد دلاتا رہے۔ جو روپیہ بطور خراج ادا کیا جائے، اس پر ہارون اور اس کے تین فرزندوں کے چہرے کندہ ہوں۔

نسی فورس ہارون الرشید سے تو جان بچا کر لے گیا، لیکن قسطنطنیہ پہنچتے ہی اسے بلغاریوں سے جنگ پیش آگئی اور اسی جنگ میں وہ مارا گیا۔

رومی بادشاہ

نسی فورس کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا، لیکن اس نے ایک جنگ میں ایسے زخم کھائے کہ تخت چھوڑ کر ایک خانقاہ میں جا بیٹھا۔ پھر نسی فورس کے داماد نے عنانِ حکومت سنبھالی، مگر دو برس کے اندر اندر اسے معزول کر دیا گیا اور لیو خامس (ارمنی) کے سر پر تاج رکھا گیا۔ سات برس کے بعد وہ بھی مارا گیا۔ پھر ایک نیا خاندان برسرِ حکومت آیا۔ اس نئے خاندان کے بانی شہنشاہ میخائیل ثانی (۸۲۰ء - ۸۲۹ء) کے عہدِ حکومت کا ایک قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ ٹامس نامی ایک سپہ سالار نے ایشیائے کوچک میں بغاوت کی اور اس کی پیش قدمی کے باعث دو مرتبہ قسطنطنیہ خطرے میں پڑ گیا۔ آخر ٹامس نے تھریس میں شکست کھائی۔ گرفتار ہوا اور مارا گیا۔

اس خاندان کے دوسرے بادشاہ تھیوفلس[1] (۸۲۹ء - ۸۴۲ء) کے عہد میں دوسری مرتبہ عباسیوں کے ساتھ خونریز کشمکش کی نوبت آئی۔ اس وقت ہارون الرشید کا تیسرا بیٹا معتصم باللہ (۸۳۳ء - ۸۴۲ء) عباسی تاج و تخت کا مالک تھا۔

اس مرتبہ بھی پہل تھیوفلس ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ شام میں ایک چھوٹا سا شہر زبطرہ[2] تھا، جہاں معتصم کی ولادت ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے معتصم کو اس مقام سے خاص محبت تھی۔ تھیوفلس نے اس پر حملہ کیا۔ وہاں کے باشندوں کو بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا، ان کی پیشانیوں پر داغ لگائے۔ ایک ہزار خواتین کو وہ گرفتار کر کے لے گیا۔ ان میں ایک عباسی خاتون تھی، جس نے بیچارگی کے عالم میں معتصم کی دہائی دی تھی۔

خاتون کی پکار اور معتصم کا جواب

معتصم دربار میں بیٹھا تھا، جب اسے زبطرہ کی تباہی کی خبر ملی۔

۱؎ THEOPHILUS

۲؎ یونانی اسے سوزوپیٹرا (SOZOPETRA) کہتے تھے۔

قاصد نے عباسی خاتون کی فریاد کا ذکر کیا تو معتصم بے اختیار لبیک کہتا ہُوا اُٹھا، وہیں سے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی فوجِ خاص کے ساتھ روانہ ہو گیا اور دوسری فوجوں کو جلد از جلد راستے میں مل جانے کا حکم بھیج دیا۔ معتصم رومی سلطنت کے قلب کو چیرتا ہُوا آگے بڑھا اور مختلف شہر برباد کر دیے۔ آخر دریائے ہالیس[۱] کے کنارے رومیوں کو شکست فاش دی۔ فتح کے بعد اس نے پوچھا کہ رومی شہنشاہ کو سب سے زیادہ کس شہر کے ساتھ تعلق ہے۔ جب بتایا گیا کہ عموریہ اس شاہی خاندان کا مولد و ماویٰ ہے تو معتصم نے زبطرہ کی بربادی کا انتقام پیشِ نظر رکھتے ہوئے عموریہ کا محاصرہ کر لیا۔ پچپن روز کے محاصرے کے بعد شہر فتح ہُوا تو اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ بعد ازاں معتصم اطمینان سے قسطنطنیہ پر یورش کی تیاری کر رہا تھا کہ ۸۴۲ء میں وفات پائی[۲]۔ اس کی اولاد میں سے کوئی بھی اس کے عزائم کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اسی سال تھیوفلس بھی فوت ہو گیا۔

---

[۱] HALYS یہ دریا وسطِ ایشیائے کوچک میں سے بہتا ہُوا بحیرۂ اسود میں گرتا ہے۔ ترک اسے قزل ارمق کہتے ہیں۔ [۲] عجیب و غریب اتفاقات کے سلسلے میں معتصم باللہ کا معاملہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ مثلاً وہ عباسی خاندان کا آٹھواں بادشاہ تھا۔ اس نے آٹھ سال آٹھ مہینے اور آٹھ دن حکومت کی۔ اس کے آٹھ بیٹے تھے اور آٹھ بیٹیاں۔ اس نے اپنے پیچھے آٹھ ہزار غلام اور آٹھ ملین دینار سُرخ چھوڑے اور زندگی میں آٹھ نہایت اہم لڑائیاں کیں۔

چوتھا باب

الپ ارسلان اور رومانوس

رومی شہنشاہ تھیوفلس کا خاندان ۸۶۶ء میں ختم ہوگیا اور ایک مقدونی خاندان برسرِ اقتدار آیا، جس کا پہلا بادشاہ باسل[1] اوّل تھا۔ اس خاندان کے حکمرانوں کی تعداد کم وبیش تیرہ ہے۔ ان میں دو ملکائیں بھی تھیں۔ قسطنطنیہ کے عام شہنشاہوں کی طرح بعض بادشاہ طبعی موت مرے، بعض کو زہر دے کر مار اگیا اور بعض قتل ہوئے۔ پھر کمنینی خاندان برسرِ اقتدار آگیا، جسے مورخ "کمنینی" اور "اینجلی"[2] خاندان کہتے ہیں۔ قسطنطنیہ کے تمام حکمران خاندانوں میں سے یہ خاندان غالباً سب سے بڑھ کر نااہل اور نالائق تھا۔ اس خاندان کے چند حکمران یہ ہیں:۔

۱۔ اس خاندان کی ایک ملکہ یوڈوشیا تھی، جو اپنے شوہر کے ساتھ تاجدار بنی۔ اس کی وفات پر تنہا حکمران رہی۔ پھر اس نے رومانوس چہارم سے شادی کر لی۔ آخر رومانوس کی وفات پر شاہی محل سے نکال دی گئی اور اس نے گمنامی میں زندگی کے دن گزارے۔

۲۔ رومانوس چہارم ۱۰۷۱ء میں مارا گیا۔

۳۔ اینڈرونکیس اوّل (۱۱۸۳ء۔ ۱۱۸۵ء) اپنے ہی خاندان کے ایک فرد آئزک ثانی (۱۱۸۵-۱۱۹۵ء) کی سازش سے معزول ہُوا۔ اس کی آنکھیں نکالی گئیں، ہاتھ کاٹے گئے اور اونٹ پر سوار کرا کے شہر میں پھرایا گیا، جہاں لوگوں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

۴۔ آئزک ثانی (اینجلوس) کے خلاف سازش ہوئی۔ سگے بھائی نے اس کی آنکھیں نکالیں اور قید میں ڈال دیا۔ اس کا بھائی خود ۱۱۹۵ء سے ۱۲۰۳ء تک حکمران رہنے کے بعد بھاگ نکلا اور مر گیا۔

۵۔ آئزک ثانی ۱۲۰۳ء میں اپنے بیٹے کے اشتراک سے دوبارہ حکمران بنا۔ تھوڑی ہی مدت میں دونوں

---

[1] BASIL

[2] COMNENI AND ANGELI

مارے گئے۔

الپ ارسلان سلجوقی

اس اثناء میں سلجوقی ترک اسلامی سلطنت کے بڑے حصے پر مسلط ہو چکے تھے اور ان کی فتوحات ایشیائے کوچک تک پہنچ چکی تھیں۔ اس خاندان کا بانی طغرل بیگ تھا، جس نے عباسی خلافت کی مختاری سنبھال لی تھی اور ایک عباسی شہزادی سے شادی بھی کر لی تھی۔ طغرل کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ اس نے اپنے بھتیجے الپ ارسلان (بن چغر بیگ داؤد) کو جانشین نامزد کیا۔ یہ اپنی یگانہ خصوصیتوں کے لحاظ سے شہنشاہوں اور سلطانوں کی صف میں نہایت ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔ شجاعت میں بے مثل، اعتقاد و عمل کے اعتبار سے اسلامیت کا پیکر، رعایا کا انتہائی ہمدرد۔ اگرچہ زندگی کا بڑا حصہ مجاہدات اور رزم و پیکار میں گزرا اور ظاہر ہے کہ رزم و پیکار میں خونریزی کے سوا چارہ نہیں، لیکن الپ ارسلان ہر موقع پر انتہائی کوشش کرتا تھا کہ لڑائی کی نوبت نہ آئے۔ لڑائی پیش آتی تھی تو مسلمانوں کی شہادت پر خون کے آنسو بہاتا تھا۔

رومیوں سے آرمینیا اور ایشیائے کوچک کے سلسلے میں کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ رومانوس[1] رابع ملقب بہ دیوجانس[2] (۱۰۶۸ء تا ۱۰۷۱ء) نے خود پیشدستی کی اور بے شمار لشکر لے کر سلجوقی سلطنت پر حملہ آور ہوا۔ گبن نے اس کے لشکر کی تعداد کم از کم ایک لاکھ بتائی ہے، جن میں فرینک اور نارمن بھی شریک تھے اور رسالے کا افسر وہ شخص تھا، جس سے سکاٹ لینڈ کے بادشاہوں کی نسل چلی۔ بعض روایتوں میں رومانوس کے لشکر کی تعداد دو لاکھ مذکور ہے۔

ملاذکرد

الپ ارسلان نے رومانوس کے حملے کی اطلاع پاتے ہی اس طرف کا رُخ کر لیا، جدھر سے رومی لشکر آ رہا تھا۔ ملاذکرد[3] کے میدان میں مقابلہ ہوا۔ گبن کے بیان کے مطابق الپ ارسلان کے ساتھ صرف چالیس ہزار سوار تھے۔ اسلامی روایتوں میں ان سواروں کی تعداد پندرہ ہزار بتائی گئی ہے۔

الپ ارسلان نے ملاذکرد پہنچتے ہی معمول کے مطابق مصالحت کی کوشش کی اور رومانوس کو

---

[1] ROMANUS اسلامی تاریخوں میں اسے "ارمانوس" لکھا گیا ہے۔ [2] DIOGENES [3] انگریزی میں مانزیکرت (MANZIKERT) ملاذکرد مشرقی اناطولیہ میں ارض روم اور وان کے درمیان تھا۔ اب اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔

پیغام بھیجا' آخر خونریزی کی کیا ضرورت ہے' کیوں نہ باہم مل جل کر کوئی فیصلہ کر لیا جائے تاکہ بندگانِ خدا کی جانیں تلف نہ ہوں۔

رومانوس کا جواب

رومانوس نے نیک نیّتی کی بنا پر دیے ہوئے اس پیغام صلح کو الپ ارسلان کی کمزوری یا خوف پر محمول کیا اور جواب میں پیغام بھیجا:

"اگر 'بربری' صلح کا خواہاں ہے تو سب سے پہلے وہ جگہ چھوڑ کر چلا جائے' جہاں خود لشکر کے ہمراہ ہے تاکہ رُومی فوج وہاں ڈیرا جما سکے۔ نیز شہرِ رے صداقتِ عہد کی ضمانت کے طور پر رومیوں کے حوالے کر دے۔ ورنہ صلح اس کے دارالحکومت پر پہنچ کر ہو گی"۔

الپ ارسلان یہ مطالبہ سن کر مسکرایا۔ لیکن چونکہ یقین ہو چکا تھا کہ لڑائی کے سوا چارہ نہیں، اس لیے یہ سوچ کر کہ آیندہ جنگ میں خدا جانے کتنے مسلمانوں کا خون بہے گا اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہ نکلا۔

مُجاہد کی تیّاری

پھر الپ ارسلان اُٹھا۔ نہایت خضوع و خشوع سے نماز پڑھی اور دُعا مانگی۔ اپنے ہاتھ سے سواری کے گھوڑے کی دُم میں گرہ[1] لگائی۔ جسم پر مُشک مَلا۔ زرہ اتار دی اور سفید لباس پہن لیا۔ وصیت کر دی کہ اگر میں میدانِ جنگ میں مارا جاؤں تو مجھے اُسی جگہ دفن کر دیا جائے' جہاں میری لاش گرے۔ رفیقوں میں اعلان کر دیا کہ موت و حیات کی جنگ درپیش ہے۔ جسے مرنا منظور ہو' ساتھ رہے۔ جسے جان عزیز ہو' وہ ابھی الگ ہو جائے۔ اس سے کوئی باز پرس نہ ہو گی۔

اس طرح الپ ارسلان میدانِ کارزار میں پہنچا اور تھوڑی سی فوج کے ساتھ رومیوں کے ٹڈی دل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

لڑائی

لڑائی شروع ہوئی۔ الپ ارسلان کے شیرانہ حملے سے بہت جلد رومیوں کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ سلجوقیوں نے تیروں کا مینہ برسایا تو جس رومی دستے کو جس سمت عافیت نظر آئی'

---

[1] ترکوں میں گھوڑے کی دُم کو گرہ لگانے کا مطلب یہ تھا کہ فتح حاصل کرنے یا جان دے دینے کا آخری فیصلہ کر لیا۔

اُدھر بھاگ نکلا اور خود رومانوس بہت سے ساتھیوں اور پادریوں کے ہمراہ گرفتار ہوگیا۔

رومانوس کا غرور

الپ ارسلان نے رومانوس کی گرفتاری کے بعد اس سے نہایت اچھا سلوک کیا۔ اپنے برابر خیمے میں ٹھہرایا اور آٹھ روز تک مہمان رکھا۔ اس اثناء میں ایک بھی لفظ زبان سے نہ نکلا، جو رومانوس کے لیے اہانت یا نفرت کا باعث ہوتا۔ البتہ یہ ضرور واضح کیا جاتا رہا کہ جنگ کے دوران میں اس سے کیا کیا غلطیاں سرزد ہوئیں۔ پھر پوچھا کہ آپ کس سلوک کے متوقع ہیں؟ رومانوس نے جواب دیا:

"اگر سلطان ظالم ہے تو مجھے موت کی سزا دے گا۔ اگر وہ فخر و غرور کا پیکر ہے تو مجھے ساتھ ساتھ لیے پھرے گا۔ اگر اُس کی نظر اپنے مفاد پر ہے تو مجھ سے فدیہ لے کر آزاد کر دے گا۔"

سلطان نے پوچھا کہ اگر آپ کامیاب ہوتے تو مجھ سے کیا برتاؤ کرتے؟ گبن لکھتا ہے کہ رومانوس نے جو جواب دیا:

"وہ ایسے جذبے کا مظہر ہے کہ احتیاط اور شکر گزاری کا تقاضا یہ تھا کہ اُسے ظاہر نہ کیا جاتا۔ رومانوس نے کہا کہ اگر میں کامیاب ہوتا تو سلطان کے جسم پر بہت سے تازیانے برساتا۔"

الپ ارسلان کی شانِ عفو

سلطان یہ جواب سُن کر بھی مُسکرا دیا اور خفگی کی کوئی علامت اس کے چہرے پر نمودار نہ ہوئی۔ صرف یہ کہا کہ مسیحی قانون میں تو دشمنوں سے بھی عفو و محبت کی تاکید کی گئی ہے، لیکن میں ایسے کسی برتاؤ کا روادار نہیں ہو سکتا، جو نازیبا ہو۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مُستقل طور پر صلح کر لو۔ دس لاکھ دینار سُرخ تاوان ادا کرو۔ تین لاکھ ساٹھ ہزار دینار سرخ سالانہ خراج دیتے رہو اور جتنے مسلمان اسیرانِ جنگ رومی سلطنت میں موجود ہیں، انھیں رہا کر دو۔

رخصت کے وقت الپ ارسلان نے رومانوس کو خلعت دیا اور دس ہزار دینار سُرخ زادِ راہ کے لیے عنایت کیے۔ جتنے پادری رومانوس کے ساتھ اسیر ہوئے تھے، ان سب کو بھی آزادی دے دی۔[1]

---

[1] یہ تمام واقعات اور تمام اقتباسات گبن سے ماخوذ ہیں تاکہ کسی کو ان کے متعلق شبہے کی گنجائش نہ رہے۔ ملاحظہ فرمائیے گبن جلد سوم ص ۴۰۱ - ۴۰۴

قسطنطنیہ پر حملے کا موقع ملاذکرد کی فتح کے بعد سلجوقیوں کے لیے قسطنطنیہ پر یورش کا راستہ صاف ہوگیا تھا، لیکن الپ ارسلان نے انتہائی فراخ حوصلگی سے کام لیتے ہوئے اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھایا اور محض ادائے خراج پر صلح کرلی، حالانکہ پیشدستی رومانوس کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد سلجوقی فوجیں آگے بڑھتیں تو ان کا اقدام غیر مناسب نہ سمجھا جاتا۔

رومانوس کا انجام بعض یورپی اور امریکی مورخوں نے لکھا ہے کہ ملاذکرد کی جنگ کے بعد رومانوس گرفتار ہُوا تو الپ ارسلان نے اس کی آنکھیں نکلوادیں اور اسی وجہ سے اس نے وفات[۱] پائی۔ بعض مورخین نے حالات ایسے انداز سے بیان کیے ہیں کہ رومانوس کی موت کا الزام الپ ارسلان پر عائد ہو۔ مثلاً انسائیکلوپیڈیا آف ہسٹری میں ہے کہ سلجوقیوں نے رومانوس کو شکست دی۔ وہ گرفتار ہُوا، پھر اسے رہا کردیا:

> "اس نے بیزنطینی تخت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر مخالفوں نے اسے شکست دی اور اندھا کردیا۔ کچھ مُدت بعد وہ فوت ہوگیا"[۲]

اس سے شُبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ رومانوس کو اندھا کرنے کے ذمّہ دار سلجوقی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلجوقیوں اور بلغاریوں کے مقابلے میں شکست کے باعث اس کی شہنشاہی خطرے میں پڑگئی تھی۔ خود اس نے جن وارثوں کو حقوق سے محروم کرکے شہنشاہی حاصل کی تھی۔ وہ اب اپنے حقوق کی بازیافت کے لیے تیار ہوگئے تھے اور رعایا کا فیصلہ یہ تھا کہ جو شخص دشمن کے ہاتھ گرفتار ہوجائے، وہ شہریت کے تمام نجی وعوامی حقوق سے بھی محروم ہوجاتا ہے۔ تا بہ شہنشاہی چہ رسد۔ رومانوس نے کہا کہ اچھا، میں بادشاہی سے دست بردار ہوتا ہوں، لیکن میرے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔ تخت کے اصل وارثوں نے اسے بصارت سے محروم کیا۔ پھر آنکھوں کا علاج بھی نہ کرایا۔ چند روز بعد بیکسی کی حالت میں اس نے وفات[۳] پائی۔

صلیبی جنگیں اور لاطینیوں کی یورش یہی کمنینی اور انجلینی خاندان ہے، جس کے زمانے میں

---

[۱] CONSTANTINOPLE (قسطنطنیہ) مصنفہ ٹامس ایلم (THOMAS ALLOM) xxxiiv

[۲] انسائیکلوپیڈیا آف ہسٹری ص ۲۵۰ [۳] گبن جلد دوم ص ۹۰۷

صلیبی جنگیں شروع ہوئیں اور سلطنت قسطنطنیہ صلیبی جنگجوؤں نیز مغربی یورپ کے مسیحی زائروں کی گزرگاہ بن گئی۔ یہی خاندانِ حکومت ہے، جس کے زمانے میں لاطینیوں نے قسطنطنیہ پر خوفناک یورش کی اور اس شہر پر تباہی و بربادی کی ایسی بجلیاں گرائیں، جن کی نظیر گزشتہ یا آیندہ تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اس کے مفصّل حالات آیندہ باب میں بیان ہوں گے

پانچواں باب

لاطینیوں کا حملہ

مذہبی اختلافات صلیبی جنگیں شروع ہوئیں تو مسیحی جنگجو اور زائر بڑی تعداد میں آنے جانے لگے۔ قسطنطنیہ ان کے راستے کی ایک اہم منزل تھا۔ اس شہر میں سے گزرے بغیر حفاظت سے ارضِ مقدس کی طرف جانے یا وہاں سے لوٹنے کا کوئی اچھا راستہ نہ تھا۔ مغربی مسیحیوں اور آرتھوڈکس مسیحیوں کے اختلافات اس زمانے میں اَور بھی نازک صورت اختیار کر گئے۔ مغربیوں کے نزدیک وہ گرجا مسیحی گرجا ہی نہ تھا، جس میں مسیح، مریم، خدا اور مسیحی اولیا کی تصویریں یا مجسّمے موجود نہ ہوں۔ آرتھوڈکس مسیحیوں کے نزدیک یہ صریح بُت پرستی تھی، جسے ختم کرنے کے لیے ان کے بادشاہ بارہا کوششیں کر چکے تھے۔ یہ حالات دونوں فرقوں میں خوشگوار تعلقات کا ذریعہ نہیں بن سکتے تھے۔ بعض اوقات اختلاف اس قدر بڑھ جاتا تھا کہ آرتھوڈکس مسیحی علی الاعلان کہتے تھے، پوپ کے سہ گوشہ تاج کے مقابلے میں ترکوں کی دستار مستحقِ ترجیح ہے۔ اختلاف کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ عشائے ربّانی میں خمیری روٹی استعمال کی جائے یا فطیری۔ گبن لکھتا ہے کہ دوسری صلیبی جنگ میں فرانس کا بادشاہ لُوئی[1] سابع بھی شریک ہُوا تھا۔ ایک فرانسیسی پادری نے اس سفر میں قربان گاہوں پر قربانیاں کی تھیں۔ یونانی پادریوں نے اسے قربان گاہوں کی بے حرمتی پر محمول کیا اور اُس وقت تک دم نہ لیا، جب تک تمام ایسی قربان گاہوں کو دھو کر پاک نہ کر لیا گیا۔

شہنشاہوں کی کشمکش ۱۱۸۰ء میں شہنشاہ مینوئل[2] اوّل کا بیٹا الیکسیس[3] ثانی (۱۱۸۰ء تا ۱۱۸۳ء) تخت نشین ہُوا۔ وہ کم سن تھا اور اس کی والدہ ماریا[4] کو نائب السلطنت بنا دیا گیا۔ ماریا کو لاطینیوں پر زیادہ بھروسا تھا، جو خاصی بڑی تعداد میں اس کے پاس ملازم تھے۔ یہ امر عوام کے لیے ناخوشگواری کا باعث بنا۔ ۱۱۸۲ء میں یکایک عوام بھڑک اُٹھے اور اُنھوں نے لاطینیوں پر حملے شروع کر دیے۔ نہ سرکاری ملازموں کو چھوڑا اور نہ تاجروں کو۔ پھر شہنشاہ اور نائب السلطنت کو

---

[1] LOUIS VII [2] MANUEL [3] ALEXIUS [4] MARIA

مجبور کر دیا گیا کہ منصب شہنشاہی میں خاندان کے ایک اَور فرد اینڈرونیکس (۱۱۸۳ء-۱۱۸۵ء) کو شریک کر لیا جائے۔ وہ کچھ مدّت کے لیے اشتراک سے کام چلاتا رہا، پھر اُس نے کم عمر شہنشاہ کا گلا گھونٹ دیا اور خود مستقل شہنشاہ بن گیا۔

اس نے دربار کو لاطینیوں سے پاک کرنے کے لیے ضبطِ املاک اور سزائے قتل سے کام لیا۔ عہدوں کی فروخت منسوخ کر دی۔ عدالتوں کی اصلاح کی اور ٹیکس کم کر دیے۔ ان اصلاحات سے بڑے بڑے عہدہ داروں اور جاگیرداروں کے اقتدار پر ضرب لگی اور وہ شہنشاہ کے سخت دشمن بن گئے۔ اسی اثناء میں نارمنوں نے البانیہ کی بندرگاہ درازّو[1] پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے یونانیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس پر یونانی امراء نے اینڈرونیکس کے خلاف بغاوت کر دی اور خاندان کی ایک دوسری شاخ کے ایک فرد آئزک اینجلوس ثانی کو شہنشاہ بنا لیا۔ اینڈرونیکس گرفتار ہُوا۔ پہلے اس کی آنکھیں نکالی گئیں۔ پھر ہاتھ کاٹے گئے۔ بعدازاں اونٹ پر سوار کر کے شہر میں پھرایا گیا۔ عوام اس کے اتنے دشمن تھے کہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

آئزک اینجلوس

آئزک اینجلوس جن حالات میں شہنشاہی تخت پر بیٹھا تھا، وہ اس کے لیے خاصے عبرت افزا تھے، تاہم اس نے کوئی عبرت حاصل نہ کی اور عیش و عشرت میں اس حد تک منہمک ہو گیا کہ کہا جاتا ہے، تخت ہی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتا اور راگ رنگ سے اسے بیدار کیا جاتا تھا۔ ۱۱۹۵ء میں وہ تھریس کی وادیوں کے اندر شکار کھیل رہا تھا کہ قسطنطنیہ میں اس کے بھائی الیکسیس (۱۱۹۵ء-۱۲۰۳ء) کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ آئزک کو اپنی معزولی کی خبر ملی تو وہ بھاگ نکلا، لیکن پچاس میل پر پکڑا گیا اور قسطنطنیہ پہنچا دیا گیا جہاں اسے بصارت سے محروم کر کے ایک بُرج میں قید کر دیا گیا، جہاں اسے معمولی کھانا وقتاً فوقتاً دے دیا جاتا۔

اس کا ایک بیٹا الیکسیس دس بارہ سال کا تھا۔ وہ موقع پا کر ایک اطالوی جہاز میں سوار ہُوا اور اس نے اٹلی جا کر پاپائے روما کی پناہ قبول کر لی۔

---

[1] DURAZZO، بحرۂ ایڈریاٹک کے ساحل پر البانیہ کی مشہور بندرگاہ۔

چوتھی صلیبی مہم ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے یروشلم کو مسیحیوں سے بزورِ شمشیر چھین لیا تھا۔ اس سے دس بارہ سال بعد پھر ایک راہب[1] نے "ارضِ مقدس" کا نعرہ لگایا اور مغربی مسیحی ممالک میں چوتھی صلیبی مہم کی تحریک جاری ہو گئی۔ جرمنی، فرانس اور انگلستان کے بادشاہ صلیبی مہموں کا تجربہ کر چکے تھے۔ ان میں سے تو کوئی دوبارہ جانے کے لیے تیار نہ ہُوا، لیکن فرانس کے امراء فوراً تیار ہو گئے۔ جہازوں کے اچھے بیڑے کی اعانت کے بغیر اس مہم کا آغاز ہی نہیں ہو سکتا تھا اور اچھا بیڑا صرف جمہوریۂ وینس کے پاس تھا۔ چنانچہ وینس کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ایک سفارت فرانس سے وہاں بھیج دی گئی۔

جمہوریۂ وینس کا صدر ہنری ڈنڈولو[2] تھا۔ اس نے سفیروں کا خیر مقدم کیا۔ ان کے نیک ارادوں کو سراہا، لیکن کہا کہ آخری فیصلہ مجلسِ شوریٰ کی منظوری کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ معاملہ مجلسِ شوریٰ میں پیش ہو گیا۔

وینس اور صلیبیوں کا عہد نامہ گفت و شنید اور غور و مشورہ کے بعد جو عہد نامہ ہُوا، اس کی تفصیل یہ تھی:

۱ - تمام صلیبی جنگجو ۲۰ - جون ۱۲۰۲ء[3] کو وینس میں جمع ہو جائیں۔

۲ - ساڑھے چار ہزار گھوڑوں اور نو ہزار سائیسوں کے لیے سپاٹ پیندے والے بحری مرکب تیار کیے جائیں۔

۳ - جہاز اتنی تعداد میں مہیّا کیے جائیں کہ ساڑھے چار ہزار افسر اور بیس ہزار پیادے ان میں سوار ہو سکیں۔

۴ - ان کے لیے اتنی خوراک مہیّا کر لی جائے، جو نو مہینے کے لیے کفایت کرے۔

۵ - جمہوریۂ وینس پچاس جہازوں کا بیڑا لے کر اس مہم میں شریک ہو۔

---

[1] پہلی صلیبی مہم کا آغاز پیٹر راہب سے ہُوا تھا۔ چوتھی مہم بھی فرانس کے ایک راہب ہی نے شروع کی تھی۔ [2] DANDOLO جمہوریۂ وینس کا صدر جسے ڈوج (DOGE) کہتے تھے۔ [3] بیانات میں مرقوم ہے کہ اجتماع کی تاریخ سینٹ جان کے جشن کی تاریخ رکھی گئی تھی۔ یہ جشن ۲۰ - جون کو ہُوا کرتا تھا، لہٰذا میں نے جشن کا ذکر کرنے کے بجائے صحیح تاریخ درج کر دی۔

۶ - جو زائرین جانا چاہیں، وہ پچاسی ہزار روپہلی مارک روانگی سے پیشتر جمع کرائیں۔

۷ - بحری یا برّی جتنی فتوحات ہوں، وہ اتحادی فریقوں میں بہ حصّہ مساوی تقسیم ہوں۔

گبن لکھتا ہے کہ یہ شرطیں سخت تھیں، لیکن ناگزیر حالات میں انھیں قبول کیے بغیر چارہ نہ تھا اور فرانسیسی امراء جان و مال دونوں بے دریغ صرف کرنے پر آمادہ تھے[1]۔ چنانچہ یہ شرطیں منظور کر لینے کے بعد معاہدے کی نقلیں تیار ہوئیں، حلف اٹھائے گئے اور ان پر مہریں ثبت ہو گئیں۔

الیکسیس کا معاملہ

اسیر شہنشاہ آئزک اینجلوس کے بیٹے الیکسیس کو اس اجتماع کا علم ہُوا تو وہ بھی وینس پہنچ گیا اور صلیبی جنگجوؤں سے درخواست کی کہ میرے والد کو قید سے رہا کرا کے شاہی تخت پر بحال کیا جائے۔ جرمنی کا بادشاہ فلپ اس کا سفارشی تھا۔ باقی اکابر نے بھی اس کی حمایت کی اور مصیبت زدہ نوجوان شہزادے کی صورت دیکھ کر سب کے دل میں ہمدردی کا جذبہ موج زن ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ پر یہ شرطیں عائد کر لیں:-

۱ - قسطنطنیہ کے تخت پر بحال ہوتے ہی مذہبی افتراق ختم کر دیا جائے گا اور رومی کلیسا کی برتری تسلیم کر لی جائے گی۔

۲ - صلیبی جنگجوؤں کی خدمت میں دو لاکھ روپہلی مارک بے تامّل پیش کر دیے جائیں گے۔

۳ - میں خود جنگجوؤں کے ساتھ مصر جاؤں گا یا ایک سال کے لیے دس ہزار آدمی صلیبی جنگجوؤں کی اعانت کے لیے مہیّا کروں گا۔

۴ - جب تک زندہ ہوں، پان سو بہادر سپاہی "ارضِ مقدّس" کی خدمت کے لیے وقف رکھوں گا۔

یہ شرطیں خاصی دلکش تھیں اور صلیبی جنگجوؤں نے وہیں الیکسیس سے دفاعی اور جارحانہ معاہدہ کر لیا۔

قسطنطنیہ کی طرف روانگی

ان انتظامات کے بعد یہ جنگجو، جن کی منزلِ مقصود "ارضِ مقدّس" تھی، قسطنطنیہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ الیکسیس سوم (برادر آئزک اینجلوس) کو اطلاع مل گئی تھی کہ اس کا بھتیجا صلیبی جنگجوؤں کو قسطنطنیہ لا رہا ہے، لیکن اس نے ابتدا میں اس پر

---

[1] یہ تمام تفصیلات گبن سے ماخوذ ہیں۔

کوئی توجہ نہ کی، یہاں تک کہ جنگجو سقوطری (اسکدار) پہنچ کر ٹھہر گئے۔ اس اثناء میں نامہ و پیام جاری رہے۔ الیکسیس نے کہلا بھیجا کہ اگر یروشلم کو غیروں کے قبضے سے نکالنا چاہتے ہو تو میں اعانت کے لیے تیار ہوں اور اگر میری سلطنت پر حملہ کیا گیا تو مقابلہ کروں گا۔ اگر تمھاری تعداد دس گنا بھی ہو جائے تو میرے غیظ سے تمھیں پناہ نہ مل سکے گی۔ جواب میں صلیبیوں نے کہا کہ ہم جائز وارثِ تاج و تخت کے حامی ہیں۔ ہماری دوستی اور وفاداری شہزادہ الیکسیس اور اس کے والد شہنشاہ آئزک کے لیے وقف ہے، جسے بصارت، تخت اور آزادی سے اس کے کافر نعمت بھائی نے محروم کر رکھا ہے۔

شہر پر یورش

سقوطری پہنچنے سے دسویں روز تمام صلیبی جنگجو چھ دستوں میں مرتّب ہوئے اور سپاٹ پیندے والی کشتیوں کے ذریعے سے بلا مزاحمت قسطنطنیہ والے ساحل پر جا اُترے۔ ان کے گھوڑے بھی ساتھ تھے۔ مقابلے پر یونانیوں کی تعداد ستّر ہزار تھی، تاہم وہ صلیبیوں کو دیکھتے ہی غائب ہو گئے۔ الیکسیس بھی خیمہ و خرگاہ چھوڑ کر شہر میں جا بیٹھا اور دروازے بند کر لیے۔

پہلا حملہ غلطہ کی جانب (مشرقی جانب) سے ہُوا اور کوشش یہ تھی کہ بندرگاہ پر قبضہ کر لیا جائے، جو شاخِ زرّیں کے دہانے پر تھی۔ جب محاصرہ طول پکڑ گیا تو لاطینیوں نے خشکی کی جانب (مغربی جانب) سے بھی حملہ کر دیا۔ دس روز کی مسلسل محنت کے بعد زمین ہموار کر لی گئی۔ فصیل کے ساتھ جو خندق تھی، وہ پاٹ لی گئی اور اڑھائی سو منجنیق لگا کر شہر پر گولے برسائے جانے لگے۔ وینس کے بیڑے نے بندرگاہ پر کامیاب حملے شروع کر دیے۔

شہنشاہ کا فرار

الیکسیس کو بچاؤ کی کوئی صُورت نظر نہ آئی تو دس ہزار پونڈ سونا اٹھایا اور ایک چھوٹی کشتی میں سوار ہو کر باسفورس کے راستے بحیرۂ اسود میں پہنچا اور اس سمندر کی ایک غیر معروف بندرگاہ میں اُتر کر روپوش ہو گیا۔ اہلِ شہر کو یہ کیفیت معلوم ہوئی تو قیدی شہنشاہ کو برج سے نکال کر شاہی لباس پہنایا اور تخت پر بٹھا دیا۔ ساتھ ہی لڑائی بند ہو گئی اور لاطینیوں نے ایک وفد گفتگو کے لیے نئے شہنشاہ کے پاس بھیج دیا اور شہزادہ الیکسیس کو اپنے ہی پاس رکھا۔

لاطینی وفد اور مجبور شاہ

لاطینی وفد شہنشاہ کے پاس پہنچا تو وہ خلوت میں بیٹھ گیا، جہاں ملکہ، حاجب اور ایک ترجمان کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہیں چاروں سفیروں کو

بلا لیا۔ انھوں نے شہزادہ الیکسیس کی مانی ہوئی شرطیں سنا دیں، جو پہلے پیش ہو چکی ہیں اور جن کا مطلب صاف الفاظ میں یہ تھا کہ مشرقی رومی سلطنت مذہبی اعتبار سے پاپائے رومہ کی تابع ہو جائے۔ "ارضِ مقدس" میں جنگ کے لیے ہر ممکن امداد دی جائے اور دو لاکھ روپہلی مارک بے تکلف صلیبیوں کے حوالے کیے جائیں۔

مجبور شہنشاہ نے جواب دیا کہ شرطیں بڑی کڑی ہیں، انھیں قبول کرنا سخت مشکل اور پورا کرنا حد درجہ دشوار ہے، لیکن آپ لوگوں نے جو خدمات انجام دی ہیں، ان کے مقابلے میں کوئی بھی شرط حد سے متجاوز نہیں سمجھی جا سکتی۔

عجیب صورتِ حال

ان امور کا فیصلہ ہو گیا تو صلیبیوں کو غلطہ میں ٹھہرا دیا گیا تاکہ اہلِ شہر سے زیادہ خلا ملا کا موقع نہ آئے۔ الیکسیس اپنے والد کے ساتھ حکومت کا کاروبار چلانے لگا۔ صلیبی روانگی کے لیے تیار ہوئے تو الیکسیس نے منت سماجت سے انھیں ایک سال کے لیے روک لیا اور درخواست کی کہ سلطنت کے یورپی علاقوں میں حکومت کا اقتدار بحال کرا دیں۔ اس کے معاوضے میں اس نے صلیبیوں کا ایک سال کا خرچ ادا کرنے کا ذمہ اٹھایا۔ چنانچہ ایک ہزار چھ سو پونڈ سونا خرچ تجویز ہوا اور مختلف علاقوں میں حکومتِ قسطنطنیہ کا اقتدار بحال ہو گیا۔ بایں ہمہ شہنشاہ آئزک اینجلوس پوری صورتِ حال کے متعلق دل میں حد درجہ مضطرب تھا۔ اگرچہ عام یونانی خاموش تھے، مگر صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے دلوں میں خوفناک طوفان جوش زن ہے۔

ہنگامے کا آغاز

یہ حالات تھے، جب ایک شخص قعرِ گمنامی سے نکل کر بروئے کار آیا۔ اس نے عوام کو ابھارا، شہنشاہ آئزک اینجلوس اور اس کے بیٹے الیکسیس کو ایک عجیب تدبیر سے موت کے گھاٹ اُتارا اور لاطینیوں پر ہلّہ بول دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لاطینیوں نے حد درجہ غلط روش سے ہر یونانی کو دشمن بنا لیا تھا۔ مثلاً گبن نے لکھا ہے کہ فلینڈرکس کے زائر قسطنطنیہ میں جس گرجے کو دیکھتے، پکار اٹھتے: "یہ مسجد ہے یا یہودیوں کا ہیکل؟ جہاں صرف ایک خدا کی پرستش ہوتی ہے۔ نہ اس کی بیوی ہے، نہ بیٹا!"[۱] اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ افکار و اقوال کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ دشمنی انتہا کو پہنچ جاتی۔ چنانچہ لاطینیوں پر جا بجا حملے ہوئے۔ انھیں دوبارہ شہر فتح کر لینے کا مرحلہ پیش آ گیا۔ پھر شہر سے جو سلوک ہوا، اس کا ذکر آج بھی بدن پر لرزہ طاری کر دیتا ہے، حالانکہ اس واقعۂ ہائلہ پر کم و بیش آٹھ صدیاں گزر چکی ہیں۔

۱؎ گبن جلد سوم ص ۵۳۱

چھٹا باب

قسطنطنیہ کی ہولناک تباہی

جوشِ انتقام

بلاشبہ یونانیوں نے لاطینیوں پر بڑی سختیاں کیں، یہاں تک کہ ان لوگوں کو بھی مار دیا یا باہر نکل جانے پر مجبور کر دیا، جو پہلے سے وہاں تجارت کر رہے تھے یا دوسرے کاموں میں مشغول تھے۔ جس یونانی نے اس ہنگامے میں ہم قوموں کی قیادت سنبھالی تھی، اس کا نام معلوم نہیں، لیکن وہ مورزوفلے[1] کے عرف سے مشہور تھا۔ اس نے تھوڑی ہی مدت میں ایسے حالات پیدا کر دیے کہ لاطینیوں کو ازسرِ نو شہر کا محاصرہ کرنا پڑا، جو مختلف روایات کے مطابق کم و بیش تین مہینے جاری رہا۔ یہاں اس کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ بحری و بری دونوں جانب سے حملہ ہوا، فصیل تقریباً ایک سو مختلف مقامات پر توڑی گئی۔ سمندر کی جانب سے دو دو جہازوں کو باہم جکڑ کر آگے بڑھایا گیا۔ جب مدافعت بالکل ناکام ہوتی نظر آئی تو مورزوفلے بھی شہنشاہ الیکسیس کی طرح خاموشی سے بھاگ نکلا اور اہلِ شہر کے نمائندوں نے ایک جلوس کی شکل میں باہر نکل کر شہر کی حوالگی کا اقرار کیا۔ ان کے ساتھ صلیبیں بھی تھیں اور مقدس بت بھی۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا تھا کہ لاطینیوں کے دل میں رحم کا زیادہ سے زیادہ جذبہ پیدا کیا جا سکے اور انھیں یقین دلایا جا سکے کہ اہلِ شہر بہرحال مسیحی ہیں اور اگرچہ مذہبی اعتبار سے ان کا نقطۂ نگاہ وہ نہ رہا ہو، جو لاطینیوں کا تھا، تاہم انھیں لاطینیوں کا نقطۂ نگاہ قبول کر لینے میں بھی تامل نہیں۔

زہرہ گداز حالات

حوالگی کے بعد قسطنطنیہ سے لاطینیوں نے جو سلوک کیا، اس کی خونچکاں داستان ٹامس ایلم کی زبان سے سُنیے۔ موصوف رقم طراز ہے:

”اس کے بعد کشت و خون اور قتل و غارت کا جو منظر رونما ہوا، وہ انسانیت کے

---

[1] MOURZOUFLE بیان کیا جاتا ہے کہ یونانی میں اس عرف کے معنی ہیں پیوستہ ابرو یا وہ شخص جس کی بھووں کے بال بہت گھنے ہوں۔

نزدیک مستوجب صد نفرین ہے۔ پاپائے رومہ نے اس مہم میں شریک ہونے والوں کے لیے ابتداءً اعلانِ عفو کر دیا تھا، لیکن وہ بھی اس وحشت و درندگی کی مذمّت پر مجبور ہُوا۔ جنابِ پاپا نے فرمایا کہ (لاطینی) جن حلیفوں کی امداد و اعانت کے لیے آئے تھے، ان میں سے نہ کسی کی عمر اور صنف کا کوئی لحاظ رکھا، نہ مذہب و عقیدے کا۔ "دن کی روشنی میں نہایت تاریک اعمال کا ارتکاب ہُوا۔ کیتھولکوں کے کیمپ میں شریف خواتین اور مقدّس راہبات کی آبرو ریزی ہوئی[1]۔"

گبن نے ان خوفناک جرائم کی معذرت میں مختلف نکتے پیدا کیے ہیں، مثلاً:

۱۔ شہنشاہوں کی موت اور مورزوفلے کے غصب نے جھگڑے کی نوعیت تبدیل کر دی تھی۔ اب بحث یہ نہ تھی کہ لاطینیوں کے حلیفوں نے ان کی خدمات کی قدر نہ کی اور واجبات نظرانداز کر دیے۔ لاطینی اس بات پر جوش میں آ گئے تھے کہ یونانیوں نے قاتل (مورزوفلے) کے سر پہ تاج رکھ دیا۔

۲۔ قسطنطنیہ کو بزورِ شمشیر فتح کیا گیا تھا اور اس عہد کے قوانینِ جنگ کے مطابق فاتحین پر مذہب اور انسانیت کے سوا کوئی پابندی نہ تھی[2]۔

تاہم ظاہر ہے کہ دونوں عذر بے محل ہیں۔ قسطنطنیہ اور رومہ میں ایک دو مرتبہ نہیں، بیسیوں مرتبہ قاتلوں ہی کے سر پہ تاج رکھے جا چکے تھے۔ خود آئزک اینجلوس نے بھی اینڈرونیکس کو قتل ہی کرا کے شہنشاہی حاصل کی تھی۔ مورزوفلے کا فعل کتنا ہی مکروہ ہو، تاہم قسطنطنیہ یا رومیوں کی تاریخ میں انوکھا نہ تھا۔ باقی رہا دوسرا عذر تو بیشک لاطینیوں پر انسانیت اور مذہب کے سوا کوئی پابندی عائد نہ تھی، لیکن دردناک واقعہ تو یہ ہے کہ صلیب کی خاطر جنگ کا حلف اٹھا چکنے کے باوجود اُنھوں نے ہم مذہبوں کے جان و مال اور آبرو کا احترام ملحوظ نہ رکھا۔ کسی خاص مذہب کے پابند ہونے کے علاوہ وہ انسان تھے اور جو کچھ انھوں نے کیا، وہ یقیناً انسانیت کے ہر تقاضے کے خلاف تھا۔

شاہدِ عینی کا بیان | نسیتاس[3] نام قسطنطنیہ کا ایک دولتمند شخص شاہی زمانے کے مشیروں میں سے تھا۔

---

[1] کانسٹینٹیونپل مصنفہ ٹامس ایلیم ص ۱۲۰ [2] گبن جلد سوم ص ۵۳۳، ۵۳۵

[3] NICETAS

اسے اس ہنگامے میں مصائب کے جس طوفان سے گزرنا پڑا، اس کی پوری کیفیت اس نے خود بیان کی ہے۔ بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ نسیٹاس کا عالی شان مکان جلاکر خاکستر کر دیا گیا۔ اس نے بھاگ کر شہر کے حوالی میں ایک نہایت معمولی مکان کے اندر پناہ لی، جس کا مالک نسیٹاس کا دوست تھا۔ جب موقع ملا تو وہ اپنی زندگی اور بیٹی کی عصمت وعفت بچانے کے لیے نکل پڑا۔ اُس وقت غیظ وغضب میں بھرے ہوئے صلیبی شہر کو بیدردی سے لُوٹ رہے تھے۔ اس کی بیوی کی آغوش میں شیر خوار بچہ تھا۔ موسم سرما کی رات تھی اور جو کچھ ان کے پاس باقی رہ گیا تھا، اسے گٹھڑی بناکر نسیٹاس نے کندھے پر اُٹھا رکھا تھا۔ پھر یہ بھی ضروری تھا کہ اس کا در ہیر یا خط وخال کسی پر آشکارا نہ ہوں۔ چنانچہ انھوں نے لباس اور جسم کیچڑ میں لت پت کر لیے تھے۔ تعاقب کے خوف سے وہ ایک لمحے کے لیے بھی کہیں ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ اسی حالت میں بھاگتے دوڑتے قسطنطنیہ سے چالیس میل دُور نکل گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ مشرقی مسیحی کلیسا کا معزز اسقفِ اعلیٰ بھی جان بچاکر بھاگا جا رہا ہے۔ اس کی حالت یہ تھی کہ ایک گدھے پر سوار تھا اور ستر پوشی کے سوا جسم پر کوئی لباس نہ تھا۔

یہ ایک ذی حیثیت امیر کی کیفیت تھی، جس نے بعد ازاں اس دردناک عہد کے حالات تفصیلاً لکھے[1]۔

ایا صوفیہ کی بے حرمتی

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ لاطینیوں کے نزدیک مشرقی مسیحیوں کے گرجے، گرجے ہی نہ تھے، کیونکہ ان میں اقانیم ثلاثہ کی پرستش نہیں ہوتی تھی۔ ٹامس ایلم لکھتا ہے کہ فاتحین ہر جذبے کی تسکین کا سامان بہم پہنچا چکنے کے بعد ایا صوفیہ نیز دوسری مقدس عبادت گاہوں میں وحشیانہ انداز سے داخل ہوئے اور بے پروایانہ ان مقامات کی سخت بے حرمتی کی:

> "عشائے ربانی کے جام اٹھاکر شراب پینے کے لیے استعمال کیے اور مسیحیوں کی عبادت کی مقدس چیزیں پامال کر ڈالیں۔ ایا صوفیہ کے مقدس پردے اس لیے پھاڑ ڈالے کہ ان کی جھالریں بڑی قیمتی تھیں۔ نفیس ترین مقدس فنی یادگاریں اس لیے توڑ دی گئیں کہ ان کی دھاتوں یا پتھروں سے فائدہ اُٹھانا مقصود تھا۔ اس وحشیانہ

---

[1] کانسٹنٹینوپل مصنفہ ٹامس ایلم ص ۷

دست درازی کی تمام تفصیلات حد درجہ قابلِ نفرین ہیں۔ میں صرف ایک واقعے پر اکتفا کرتا ہوں۔ لاطینیوں نے اسقفِ اعظم کی خاص نشست گاہ پر ایک بازاری عورت[۱] کو بٹھا دیا، جو گرجے میں گاتی اور ناچتی رہی، اور مشرقی مسیحیوں کی عبادات میں جو مقدس گیت گائے جاتے تھے یا جو جلوس نکالے جاتے تھے، ان کا مذاق اڑایا گیا[۲]۔

غارت گری اور اوباشی

گبن نے نسیٹاس کے بعض مزید بیانات نقل کیے ہیں، مثلاً عشائے ربّانی کے جام اٹھائے تو پہلے موتی اور جواہرات ان سے الگ کیے، پھر انھیں شراب پینے کے لیے استعمال کیا گیا۔ جن میزوں پر وہ شطرنج کھیلتے یا جشن مناتے تھے، ان پر حضرت مسیحؑ اور مقدس بزرگوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ انھیں جہاں جہاں چاندی یا دوسری دھاتوں کا کام ملا، اسے اکھاڑ کر خچروں پر لاد لیا۔ خچر بوجھ کے باعث ٹھوکر کھا کر گرے تو بے صبر لاطینی خنجر سے ان کے پہلو چیر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ مُردے بھی ان کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہ رہے۔ حواریوں کے کلیسا میں بادشاہوں کی قبریں تھیں۔ وہ بھی اکھاڑ دی گئیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کچھ صدیوں کے بعد جسٹینین کی لاش نکلی تو اس پر بگڑ جانے کا کوئی اثر نمایاں نہ تھا۔ فرانس اور فلینڈرز کے باشندوں نے منقش لباس پہنے اور گھوڑوں کو بھی پہنائے۔ ان کے سروں پر ململ کی پگڑیاں باندھ دیں۔ یونانیوں کو محرّروں اور عالموں کی قوم سمجھا جاتا تھا، جن کے امتیازی نشان قلم، دوات اور کاغذ کے سوا کچھ نہ تھے۔ لاطینیوں نے ان امتیازی نشانوں کی نمائش ایسے انداز میں کی، جس سے ظاہر ہو کہ یہ چیزیں بھی یونانیوں کے ہاتھ میں بے کار ہو چکی ہیں[۳]۔

فنی شاہکاروں کی بربادی

نسیٹاس نے یہ بھی بتایا ہے کہ لاطینیوں نے دورِ قدیم کے بہت سے فنی شاہکار تباہ کر دیے، جو قسطنطنیہ میں محفوظ تھے۔ گبن نے ان میں سے بارہ شاہکاروں کا ذکر کیا ہے[۴]۔ ٹامس ایم لکھتا ہے کہ اس موقع پر اس عالی شان شہر کو پہلی مرتبہ بربادی سے

۱؎ کہا جاتا ہے کہ وہ بیلیل (BELIAL) کی بیٹی تھی (گبن جلد سوم ص ۵۳۸) ۲؎ کانسٹینٹینوپل ص ۸۔

۳؎ گبن جلد سوم ص ۵۳۸ ۴؎ ایضاً ایضاً ص ۵۳۹، ۵۴۰۔

سابقہ پڑا۔ قدیم فنون کی بہت سی یادگاریں دُنیا کے مختلف حصّوں سے فراہم کی گئی تھیں۔ یا تو ان کی شکلیں بگاڑ دی گئیں یا انھیں توڑ ڈالا گیا۔ اس فعل کو مذہبی تعصّب کا نتیجہ نہ سمجھنا چاہیے بلکہ یہ علم اور سائنس کے خلاف جہالت کی وحشیانہ حرکت تھی۔ اب قسطنطنیہ ان یادگاروں سے بالکل خالی ہے۔ یہ لاطینی وحشیوں کے تباہ کارانہ افعال کی واضح شہادت ہے[1]۔

لاطینیوں کے ہاتھوں قسطنطنیہ کی تباہی کا ماتم عام مورخوں نے کیا ہے۔ کلارنس رچرڈ جانسن جس کی کتاب ۱۹۲۲ء میں مرتب ہوئی تھی، لکھتا ہے:

> ۱۲۰۴ء میں صلیبیوں نے قسطنطنیہ کو تباہ کر دیا۔ اُس وقت سے ۱۴۵۳ء میں (عثمانیوں کے ہاتھوں) فتح تک شہر کی حالت دردناک ہی رہی[2]۔

فرانسس ایلیٹ نے بھی اس واقعے کو صلیبیوں کی عزت پر کبھی نہ مٹنے والا دھبّا قرار دیا ہے[3]۔

مورزوفلے کا انجام

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ مورزوفلے شہر سے بھاگ گیا تھا۔ اس نے مفرور شہنشاہ الیکسیس ثالث سے مل کر مدافعت کی کوئی تدبیر کرنی چاہی۔ الیکسیس نے اسے پکڑ کر آنکھیں نکلوا دیں اور عبرت کا مرقع بنا کر آزاد چھوڑ دیا۔ اسی حالت میں وہ ایشیائے کوچک پہنچنا چاہتا تھا۔ راستے میں پہچانا گیا۔ گرفتار ہو کر لاطینیوں کے ہاتھ لگا۔ اس کی آنکھیں پہلے نکالی جا چکی تھیں۔ لاطینیوں نے ہاتھ کٹوا دیے۔ پھر اسے تھیوڈوسیس کے مینار پر لے گئے، جو ایک سو سینتالیس(۱۴۷) فٹ اُونچا تھا۔ وہاں سے سر کے بل نیچے گرا یا اور اس کی ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو گئیں۔

سلطنت کی تقسیم

اب لاطینی صلیبی یونانی سلطنت کے مالک بن چکے تھے، لہٰذا یہ سوال زیرِ غور آیا کہ اس سلطنت کی تقسیم اور آئندہ کے لیے انتظامات کی شکل کیا ہو۔ غور و مشورہ کے بعد قرار پایا کہ بارہ آدمیوں کو شہنشاہ کے انتخاب کا اختیار دیا جائے۔ ان میں سے چھ فرانسیسی امراء اور چھ جمہوریہ وینس کے نمائندے ہوں۔ اکثریت کی بنا پر جو فیصلہ ہو، اس پر عمل کیا جائے، لیکن اگر رائیں مساوی ہوں تو قرعہ ڈال لیا جائے۔

---

[1] کانسٹینٹینوپل ص x [2] CONSTANTINOPLE TODAY ص ۲۳

[3] DIARY OF AN IDLE WOMAN IN CONSTANTINOPLE ص ۱۷۹

عام رائے یہ تھی کہ جمہوریۂ وینس کے صدر ڈنڈولو کو شہنشاہ بنالیا جائے، مگر جمہوریۂ وینس کے نمائندے اس پر راضی نہ ہوئے کیونکہ ان کے نزدیک صدر جمہوریہ کی شہنشاہی پیچیدگیاں پیدا کرنے کی موجب ہوسکتی تھی۔ ڈنڈولو یوں اس سلسلے سے خارج ہوگیا تو فلینڈرس کے کاؤنٹ بالڈون کو شہنشاہ منتخب کرلیا گیا۔ سلطنت کا ایک چوتھائی حصہ براہِ راست شہنشاہ کے حوالے ہوا اور قسطنطنیہ کے شاہی قصروں میں سے دو قصر اسے دے دیے گئے۔ باقی تین چوتھائی سلطنت اہلِ فرانس اور اہلِ وینس میں بہ حصہ مساوی تقسیم ہوگئی۔ اسی طرح ہر امیر نے اپنے لیے ایک ایک قصر حاصل کرلیا، البتہ یہ طے ہوگیا کہ تمام امیر شہنشاہ کی وفاداری کا حلف اٹھائیں۔ صرف ڈنڈولو کو سن وسال اور خاص احترام کی بنا پر اس حلف سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ فاتحوں میں مفاہمت کی صرف ایک اَور شرط قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ جس فریق سے شہنشاہ منتخب ہو، وہ اسقفِ اعظم کا عہدہ دوسرے فریق کے لیے چھوڑ دے۔

لاطینی اقتدار کا دَور

۱۲۰۴ء میں لاطینیوں نے قسطنطنیہ کی شہنشاہی حاصل کی تھی اور ۱۲۶۱ء تک وہ اس پر قابض رہے۔ ستاون برس کی اس مدت میں ان کے لیے امن واطمینان کی کوئی ساعت نہ آئی۔ یونانیوں نے قوت کے رُوبرو سر جھکا دیا تھا۔ پھر ان کی آنکھیں کھلیں تو خفیہ یا علانیہ مخالفت کی تدبیریں سوچتے رہے۔ انھوں نے بلغاریوں اور دوسرے وحشیوں سے اتحاد میں بھی تامل نہ کیا، یہاں تک کہ ۱۲۶۱ء میں لاطینیوں کو قسطنطنیہ سے نکال دیا گیا اور ایک نیا یونانی خاندانِ حکومت برسرِکار آیا، جسے پیلیئولوگی[1] خاندان کہا جاتا ہے۔ اس خاندان کے بھی متعدد بادشاہ ہوئے۔ یہ آخری مسیحی خاندان تھا، جو قسطنطنیہ پر حکمران رہا۔ اسی کے زمانے میں عثمانی ترک ایشیائے کوچک پہنچے اور ان کے عروج واقتدار کا دَور شروع ہوا۔ اسی خاندان کے زمانے میں ترکوں نے ایشیائے کوچک کو مسخر کرتے ہوئے یورپ میں عمل دخل حاصل کیا اور ایڈریانوپل کو اپنا دارالحکومت بنالیا۔ پھر آخری قدم اُٹھا کہ قسطنطنیہ پر قابض ہوئے۔ اُس وقت سے چار سو ستر سال تک یہ مقام عثمانی ترکوں کا مرکز اور چار سو تین سال تک دنیائے اسلام کا قلب بنا رہا

---

[1] PALAEOLOGI

کیونکہ یہ اسلامی خلافت کا مرکز بن گیا تھا۔

یہاں اتنا اور بتا دینا چاہیے کہ پہلا لاطینی شہنشاہ بالڈون اوّل تاج پوشی سے کچھ مدت بعد بلغاریوں کے خلاف جنگ کے لیے نکلا، شکست کھائی، گرفتار ہوا اور قید ہی میں مر گیا۔ پھر اس کا بھائی ہنری شہنشاہ بنا۔ چونکہ متعدد ریاستیں قائم ہو گئی تھیں، اس لیے کچھ پتا نہیں چلتا کہ کس نے کس وقت شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔ بعض اوقات ایک ایک وقت میں دو دو شخص شہنشاہی کے دعویدار رہے۔ آخری لاطینی شہنشاہ بالڈون ثانی تھا، جسے ۱۲۲۸ء میں تخت پر بٹھایا گیا۔ اس کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔ ۱۲۳۷ء تک ایک شخص نائب السلطنت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ۱۲۶۱ء میں بالڈون قسطنطنیہ سے نکل کر اٹلی جا بیٹھا۔ پوپ نے اس کی حمایت میں آواز اٹھائی اور نئی صلیبی مہم کی تیاریاں شروع ہو گئیں، لیکن پیلا ئیولوگی خاندان کے بانی نے تدبر سے کام لیتے ہوئے مصالحت کی صورت پیدا کر لی۔ پوپ سے کہا کہ ہم آپ کو پہلا اسقف مانتے ہیں۔ اپنے مذہبی پیشواؤں سے کہا کہ اس طرح جھگڑا ختم ہوتا ہے اور ہماری آزادی میں کوئی مداخلت نہ ہو گی۔ گویا بالڈون ثانی کے لیے امید کی کوئی بھی کرن باقی نہ رہی[1]۔

۱؎ یہ حالات مختلف تاریخوں سے ماخوذ ہیں، مثلاً گبن جلد سوم۔

ساتواں باب

عثمانیوں کا ابتدائی دور

آغازِ حکومت عثمانی ترکوں کا بھی اصل وطن سلجوقیوں اور خوارزمیوں کی طرح وسطِ ایشیا ہی تھا۔ وہ اسلام قبول کر چکے تھے۔ دنیائے اسلام پر تاتاریوں کی یورش ہوئی تو اس سیل کے خطرات نے انھیں ایشیائے کوچک کی طرف بڑھنے پر مجبور کر دیا۔ دریائے فرات کو عبور کرتے ہوئے ان کا سردار ڈوب گیا اور مرحوم کا بیٹا ارطغرل قوم کا سردار مقرّر ہُوا۔ ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کی ایک شاخ حکمران تھی، جس کا مرکز قونیہ تھا۔ یہ گروہ جائے امن کی تلاش میں جا رہا تھا۔ راستے میں دیکھا کہ ایک مقام پر دو فریقوں میں لڑائی ہو رہی ہے۔ عثمانیوں نے ایک فریق کی امداد کی، وہی کامیاب ہُوا۔ کامیابی کے بعد معلوم ہُوا کہ یہ سلجوقی سلطان کا فریق تھا۔ سلطان نے خوش ہو کر انھیں ایک جاگیر دے دی جس کی حد مشرقی رومی سلطنت سے ملتی تھی۔

ارطغرل کے بعد اس کا بیٹا عثمان قبیلے کا سردار منتخب ہُوا۔ سلجوقی سلطنت کا شیرازہ بکھرا تو عثمان نے مستقل حیثیت حاصل کر لی اور ارد گرد کے علاقے فتح کر کے اپنی جاگیر بڑھا لی۔ یہی عثمان ہے، جس کی وجہ سے ترکوں کا یہ گروہ عثمانی مشہور ہُوا۔

عثمان بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے اورخاں کو بروسہ کی تسخیر کے لیے بھیج دیا۔ اورخاں عثمانی خاندان کے نہایت قابل حکمرانوں میں سے تھا۔ ۱۳۲۶ء میں اس نے بروسہ فتح کر لیا۔ اسی سال عثمان نے وفات پائی اور عنانِ اقتدار اورخاں کے ہاتھ آئی۔

اورخاں اورخاں نے سلطنت کے استحکام اور توسیع کا کام بڑی مستعدی سے جاری رکھا۔ اس کا بھائی علاء الدین وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر مامور تھا۔ اُس وقت تک عثمانی ترکوں نے باقاعدہ فوج کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ جب کہیں لڑائی کی ضرورت پیش آتی، قبیلے کے افراد رضا کارانہ شریک ہو جاتے اور مالِ غنیمت میں سے انھیں حصّہ ملتا۔ علاء الدین اور اورخاں نے باقاعدہ فوج مرتّب کی اور اسے اعلیٰ پیمانے پر تربیت دی۔ بہت سی منجنیقیں بھی تیار کرا لیں تاکہ کسی

موقع پر محاصرے کی ضرورت پیش آجائے تو کام دے سکیں۔

اورخاں اور علاء الدین ہی نے اس شہرۂ آفاق فوج کی بُنیاد رکھی، جو ینی چری کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس کی ابتدا یُوں بتائی جاتی ہے کہ لڑائیوں میں جو غیر مسلم قیدی پکڑے آتے تھے، انھیں علماء و صلحا کی صحبت میں تربیت دی جاتی۔ وہ مسلمان ہو جاتے تو انھیں فوجِ خاص میں بھرتی کر لیا جاتا۔ ان کی راحت و آسائش کے لیے تمام ضروری اسباب مہیّا رکھے جاتے۔ وہ جفاکشی، ایثار اور جوانمردی کے پیکر ہوتے اور سلطان کو عقیدت و وفا کا مرکزِ خاص جانتے۔ حاجی بکتاش اس عہد کے مشہور بزرگ تھے۔ اورخان کو ان سے خاص ارادت تھی۔ فوج پہلے پہل مرتّب ہوئی تو اورخاں نے مرشد کو دعا کی تکلیف دی۔ اس مقدس بزرگ نے دُعا بھی کی، ساتھ ہی کہا: "یہ ینی چری، یعنی "نئی فوج" ہیں۔ یہ فوج اس درجہ بے پناہ تھی کہ کوئی اس کے مقابلے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

غرض اورخاں اور علاء الدین کے مشترکہ اہتمام سے ایشیائے کوچک کا پُورا ساحلی علاقہ مسخر ہو گیا۔

یورپ میں پہلا قدم

قسطنطنیہ کے یونانی بادشاہوں میں تاج و تخت کے لیے آئے دن کشمکش جاری رہتی تھی اور مختلف مسیحی بادشاہ اور حاکم ضرورت کے وقت عثمانیوں سے امداد لیتے رہتے تھے۔ ۱۳۴۱ء میں جان پنجم شہنشاہ بنا تو خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ وہ کمسن تھا۔ عام لوگ اس کے حامی تھے، امراء کا طبقہ جان کانٹاکوزین[1] کا حامی بن گیا اور اس نے سلطنت کے لیے لڑائی شروع کر دی۔ ۱۳۴۷ء میں کانٹاکوزین قسطنطنیہ پر قابض ہو گیا اور جان ششم کے لقب سے اس نے بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ ۱۳۵۳ء میں اسے سربیوں کی پیشقدمی کے باعث مشکلات سے سابقہ پڑا تو عثمانیوں کو امداد کے لیے بُلا لیا۔ عثمانیوں نے سربیوں کو شکست دے کر کانٹاکوزین کو محفوظ کر دیا اور خود گیلی پولی میں مرکز بنا کر بیٹھ گئے۔ گویا یہ مشہورِ عالم خطہ یورپ میں عثمانیوں کی پہلی قدم گاہ تھا۔

۱۳۵۵ء میں جان پنجم نے کانٹاکوزین کو دست برداری پر مجبور کر دیا۔ سربیوں کا بادشاہ بھی اسی سال فوت ہُوا اور اس کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکوں کی فتوحات کے لیے

---

[1] JOHAN CANTACUZENE

یورپ کی فضا سازگار ہوگئی۔ ۱۳۶۰ء میں اورخاں نے وفات پائی۔ اس وقت تک عثمانی ترک ایشیا میں مستحکم سلطنت کے مالک بن چکے تھے اور یورپ میں ان کی فتوحات کا آغاز ہوچکا تھا لیکن اورخاں اپنے آپ کو "امیر" ہی کہتا رہا۔ بادشاہ یا سلطان کا لقب اختیار نہ کیا۔

مُرادِ اوّل

اورخاں کے بعد اس کے فرزند مُرادِ اوّل نے قوم کی قیادت سنبھالی۔ وہ بھی اورخاں کی طرح بڑا جوانمرد تھا۔ چنانچہ اس نے سربیوں اور بلغاریوں کو شکست دے کر ان کے پورے علاقے چھین لیے۔ ۱۳۶۵ء میں ایڈریانوپل (ادرنہ) کو فتح کیا۔ مراد چونکہ یورپ میں پیشقدمی جاری رکھنے کا فیصلہ کرچکا تھا اس لیے اُس نے دارالحکومت بروسہ سے ایڈریانوپل میں منتقل کرلیا۔ مُراد کی فتوحات سے یورپ بھر میں تہلکہ مچ گیا۔ چنانچہ سربیوں، بلغاریوں اور دوسرے گروہوں نے مل کر مُراد کے مقابلے میں بمقام قصوہ[۱] بڑی زبردست فوج جمع کی۔ ۲۰ر جون ۱۳۸۹ء کو جنگ ہوئی مُراد نے اتحادیوں کو شکست فاش دی۔ جنگ کے بعد ایک مسیحی عرضداشت پیش کرنے کے بہانے مُراد کے پاس پہنچا اور آناً فاناً چھرے سے ایسا مہلک زخم لگایا کہ مُراد نے وہیں وفات پائی اور اس کا بیٹا بایزید اوّل حکمران بنا۔

بایزید اوّل

یہی پہلا ترک فرمانروا ہے، جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ وہ شجاعت میں یگانۂ روزگار تھا۔ اس کے حملے اتنے بے پناہ اور اچانک ہوتے تھے کہ تاریخ میں وہ یلدرم (برقِ خاطف) کے لقب سے مشہور ہوگیا۔ اس نے ایشیا اور یورپ میں بہت سے علاقے فتح کیے۔ مرادِ اوّل کی طرح ہنگری اور بلقان کے حکمرانوں نے بایزید کے خلاف بھی ایک بہت بڑا جتھا تیار کیا، جس میں پاپائے رومہ کے حسب فرمان فرانس، جرمنی اور اٹلی کے بڑے بڑے مشہور جنگجو بھی شریک ہوئے۔ بایزید اس زمانے میں ایشیائے کوچک کے بعض سرکشوں کی تادیب میں مصروف تھا۔ تھوڑی سی فوج لے کر بے تابی کے پروں سے اڑتا ہوا یورپ پہنچا۔ ۲۵ر ستمبر ۱۳۹۵ء کو نکوپوس[۲] کے میدان میں لڑائی ہوئی۔ اتحادی بُری طرح پامال ہوئے۔ ہزاروں مارے گئے

---

[۱] KOSSOVO یوگوسلافیہ کا ایک مقام ہے۔ اس نام کا ایک میدان بھی ہے، جو دریائے آئبر کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ [۲] NICOPOLIS بلغاریہ میں دریائے ڈینیوب کے کنارے ایک مشہور مقام ہے۔ اسے عموماً نکوپولی کہتے ہیں۔

اور بہت سے شہزادگان اور امرا اسیر ہوئے۔ گفت وشنید کے بعد فیصلہ ہوا کہ سلطان فدیہ لے کر اسیروں کو رہا کر دے۔ دو لاکھ ڈوکٹ[1] فدیہ قرار پایا۔ اس رقم کا بہت بڑا حصہ برگنڈی کے ڈیوک کے ذمے تھا اور اس نے رعایا سے وصول کیا۔ عہد نامے میں یہ بھی مرقوم تھا کہ تمام فرانسیسی امیر اقرار کرتے ہیں، وہ سلطان کے خلاف پھر کبھی ہتھیار نہ اُٹھائیں گے۔ سلطان نے برگنڈی کے ولیعہد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"میں تیری قسموں اور تیرے ہتھیاروں کو حقیر سمجھتا ہوں۔ تُو نوجوان ہے اور تیرے دل میں یقیناً یہ جذبہ ہوگا کہ اس پہلی جنگ میں جو ذلّت اٹھائی ہے اور جو شکست کھائی ہے، اس کا داغ دامن سے دھو ڈالے۔ جا، اپنی قوت فراہم کر اور خوب تیاری کر لے۔ یقین رکھ کہ بایزید دوبارہ میدانِ جنگ میں مقابلے کی خبر پا کر خوش ہوگا۔"[2]

اس فتح کے بعد بایزید نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا، لیکن قسطنطنیہ اور اس کے حکمران خوش نصیب تھے کہ اس اثناء میں وسطِ ایشیا سے ایک نیا طوفان اُٹھا، جس نے بایزید کی توجہ قسطنطنیہ کی طرف سے ہٹا دی اور رومی شہنشاہوں کی تدبیر یا شجاعت یا ان کی فوج کی پامردی سے نہیں بلکہ ایشیائی طوفان کی وجہ سے محاصرہ اُٹھانا پڑا اور قسطنطنیہ کو مزید پچاس سال کی مُہلت مل گئی۔

---

[1] DUCAT ایک طلائی سکہ تھا جس کی قیمت نو شلنگ سے قریب تھی۔ [2] گبن جلد سوم ص ۹۵۰

آٹھواں باب

تیمُور اور بایزیدؔ

دوشیروں کی ٹکّر تیمور وسطِ ایشیا میں معمولی حیثیت سے اٹھ کر بہت بڑا فاتح بن چکا تھا۔ یقیناً وہ غیر معمولی عزم وہمّت اور حزم وتدبیر کا مالک تھا، لیکن افسوس کہ اس کی تمام خوبیاں اکثر وبیشتر بے جا استعمال ہوتی رہیں۔ جہاں کہیں کوئی اسلامی حکومت تھی، اس نے صرف اس خیال سے اس پر حملہ کردیا کہ لُوٹ مار کرے اور ایک نئے خطّے کی پیشانی پر اس کی حکمرانی کی مُہر ثبت ہوجائے۔ عام روایات کے مطابق وہ ہندوستان میں تھا، جب اسے خبر ملی کہ اس کے گرجستانی علاقوں میں خلل رونما ہوگیا ہے اور سلطان بایزید کی طرف سے حملے کا خطرہ ہے۔ بایزید نے اناطولیہ کے بعض سرکش رئیسوں کو سختی سے دبایا تھا، انھوں نے اپنے آپ کو تیمور کی پناہ میں دے دیا۔ تیمور نے بایزید کو لکھا کہ ان رئیسوں کی ریاستیں فوراً بحال کردی جائیں۔ یہ مطالبہ بھی بایزید کو خوشگوار معلوم نہ ہوسکتا تھا اور بظاہر خط کا انداز بھی بڑا متکبّرانہ تھا۔ بایزید شعلہ مزاج تھا ہی، خط دیکھتے ہی برافروختہ ہوگیا اور کہتے ہیں کہ اس نے تیمور کو بڑا سخت جواب لکھا۔ تیمور نے اس پر بایزید کو جو پیغام بھیجا، اس کا مفہوم یوں بیان کیا جاتا ہے:

"کیا تمھیں معلوم نہیں کہ ایشیا کا بہت بڑا حصہ ہماری تلواروں کے سایے میں ہمارے قانون کا پابند ہے اور ہماری فوجیں ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک پھیلی ہوئی ہیں؟ دُنیا کے حکمران ہمارے دروازے کے سامنے صف باندھے کھڑے ہیں.... تیری گستاخی اور حماقت کی بُنیاد کیا ہے؟ یقیناً تُو نے یورپی مسیحیوں پر کچھ فتوحات حاصل کرلی ہیں۔ رسولِ خدا صلعم نے تیری تلوار کو برکات سے مشرف فرمایا اور کافروں کے خلاف جہاد میں تُو نے قرآن کے احکام کی پیروی کی۔ محض اسی وجہ سے ہم تیرے مُلک کے خلاف قدم اٹھانے میں متامّل رہے اور اسے اسلامی دُنیا کا مورچہ سمجھتے رہے۔ عقل وہوش سے

کام لو' سوچو' مخالفت سے باز آجاؤ۔ ہمارے انتقام کی برقِ خاطف سے بچو' جو تمھارے سر پر معلق ہے۔ تمھاری حیثیت ایک چیونٹی کی ہے' پھر وہ ہاتھیوں سے لڑائی مول لینے کے درپے کیوں ہے؟ آہ! ہاتھی اسے کچل کر رکھ دیں گے۔"[1]

بایزید نچلا کیونکر بیٹھ سکتا تھا؟ اس نے بھی نہایت سخت جواب دیتے ہوئے لکھا:

"تیرے پاس بے شمار فوج ہے اس سے کیا ہوتا ہے؟ بھاگنے والے تاتاریوں کے تیر میرے ثابت قدم اور ناقابلِ شکست ینی چریوں کے تبر و شمشیر کے سامنے کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ جن رئیسوں نے میری پناہ قبول کر لی ہے' ان کا محافظ میں ہوں۔ وہ میری خیمہ گاہ میں بیٹھے ہیں۔ ارزنجان اور ارضِ روم میرے شہر ہیں۔ اگر بقایا خراج کوڑی کوڑی ادا نہ ہوگا تو میں طارس اور سلطانیہ کی دیواروں کے پاس پہنچ کر وصول کروں گا۔"[1]

جنگ انقرہ غرض اسی قسم کے اشتعال انگیز پیغامات سے وقت کے دو جنگجو شیروں کے درمیان ٹکر ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عثمانی سلطنت نے تسخیرِ یورپ کا جو کام اعلیٰ پیمانے پر شروع کر رکھا تھا' وہ پچاس سال پیچھے پڑ گیا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے' سلطان بایزید نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ تیمور سے مقابلہ ناگزیر ہو گیا تو اس نے محاصرہ اٹھا کر تھوڑی سی فوج ساتھ لی اور ایشیائے کوچک پہنچ گیا۔ انقرہ[2] کے میدان میں تیمور اور بایزید کے درمیان مقابلہ ہوا۔ بایزید جرأت و جوانمردی کا پیکر تھا۔ اس کے مقابلے میں تیمور عیار اور دور اندیش بھی تھا۔ اس کی عمر لڑائیوں میں گزری تھی۔ جوانمردی کے ساتھ اس میں غور و تدبر کا مادّہ بھی بہت زیادہ تھا۔ وہ ٹھنڈے دل سے سوچ سکتا تھا کہ کب اور کس موقع پر حملہ کرنے سے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ بایزید تیمور سے عہدہ برآنہ ہو سکا۔ شکست کھائی اور گرفتار ہو گیا۔ تیمور یقیناً بہت خوش ہوا ہوگا کہ وقت کے سب سے بڑے سالار اور سلطان پر فتح پائی' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس فتح نے بڑی حد تک

---

[1] گبن جلد سوم ص ۲۶۳ [2] اس مقام کا پہلا نام انگورہ تھا۔ غازی کمال اتاترک مرحوم نے اسے جمہوریہ ترکیہ کا مرکز بنایا تو انگورہ کو انقرہ کہنے اور لکھنے لگے۔

تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ اگر یہ لڑائی پیش نہ آتی اور بایزید کی پیش قدمیاں یورپ میں مسلسل جاری رہتیں تو یقیناً یورپ کی تاریخ کا نقشہ سراسر مختلف ہوتا۔

عثمانیوں کی پریشان حالی

جنگ کے بعد فاتح نے مفتوح سے جو سلوک کیا، اس کے متعلق روایتیں مختلف ہیں۔ بعض بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ تیمور نے بایزید کے لیے لوہے کا ایک پنجرہ بنا لیا تھا اور اس میں بند کر کے اسے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا۔ بعض بتاتے ہیں کہ تیمور نے بایزید سے اچھا برتاؤ کیا۔ بہرحال انقرہ کے میدان میں شکست کھانے کے بعد بہت جلد بایزید نے وفات پائی۔ تیمور واپس گیا تو بایزید کے بیٹوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ محمدؔ، سلیمان اور موسیٰ کئی سال لڑتے رہے، آخر ۱۴۱۳ء میں محمدؔ کی حکومت قائم ہوئی۔ سلاطین عثمانیہ کی تاریخ میں اسے محمدؔ اوّل کہتے ہیں۔ آٹھ سال بعد اس کی وفات پر مُرادِ ثانی بادشاہ بنا۔

مُرادِ ثانی

مُرادِ ثانی ۱۴۲۱ء میں تخت نشین ہوا، لیکن اس کے بھائی مصطفیٰ نے قسطنطنیہ کے یونانی شہنشاہ سے امداد لے کر جنگ شروع کر دی۔ مینوئل ثانی (۱۳۹۱ء ۔ ۱۴۲۵ء) نے مصطفیٰ کی امداد میں مُراد کو ایڈریانوپل پر شکست دی، لیکن مصطفیٰ قدم آگے نہ بڑھا سکا۔ گرفتار ہوا اور مارا گیا۔ مراد ثانی کو خانہ جنگی کی طرف سے اطمینان ہوا تو اس نے انتقاماً قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔

سلاطینِ قسطنطنیہ کی تگ و دو

فرمانروائے قسطنطنیہ نے اوّلاً پاپائے رومہ اور دوسری مسیحی حکومتوں سے امداد طلب کی۔ ثانیاً سالونیکا کا علاقہ جمہوریہ وینس کو دے کر ترکوں کے خلاف جنگ کے لیے اپنے ساتھ ملا لیا۔ ترکی بیڑے نے وینس کے وہ تمام مرکز تباہ کر ڈالے، جو بحیرۂ ایجین میں جابجا قائم کر رکھے تھے اور ۱۴۳۰ء میں سالونیکا پر بھی قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں البانیہ اور ایپرس[1] کے بڑے حصے بھی لے لیے۔ اس اثنا میں وینس کو میلان سے جنگ پیش آگئی اور اس نے ترکوں سے صلح کر لی۔

ترکوں کے خلاف زبردست یورپی اتحاد

بلقان سے بڑی حد تک فارغ ہو کر ترکوں نے ہنگری میں پیش قدمی شروع کر دی۔ اس پر ہنگری، پولینڈ،

---

[1] EPIRUS یونان کا وہ حصہ، جو بحیرۂ آئی اونیا پر واقع ہے۔

بوسنیا، ولاشیا اور سرویہ نے ترکوں کے مقابلے کے لیے ایک مشترکہ جمعیت تیار کی لیکن گفت و شنید سے باہم دس سال کے لیے صلح ہوگئی۔ سلطان مُراد بڑا نیک اور عبادت گزار شخص تھا۔ ۱۴۴۴ء میں اس نے اپنے بیٹے محمدؒ کو جانشین بنایا۔ کاروبارِ حکومت ایک مجلس کے حوالے کیا اور خود دست بردار ہوگیا۔ پوپ نے جب دیکھا کہ چودہ پندرہ سال کا ایک طفلِ نوخیز ترکی سلطنت کا مالک ہے تو دہ سالہ معاہدہ یورپی مسیحیوں سے فسخ کرالیا اور ہنگری کی سرکردگی میں ترکی کے خلاف جنگ شروع ہوگئی۔

وارنا اور قوصوہ

یہ ترکی سلطنت کے لیے بڑا نازک وقت تھا۔ امراء اور علماء کے اصرار پر سلطان مراد نے از سرِ نو حکومت کا کاروبار سنبھالا۔ ۱۰۔ نومبر ۱۴۴۴ء کو بمقام وارنا[1] نہایت خوفناک لڑائی ہوئی، جس میں مسیحی لشکر نے بُری طرح شکست کھائی۔ چار سال بعد ہنگری کے فرمانروا نے سرویہ پر حملہ کیا تو سلطان مراد ثانی کے ساتھ اسی میدان میں لڑائی ہوئی، جہاں پچاس سال پیشتر مراد اوّل بڑے یورپی جتھے کو شکست دے چکا تھا یعنی قوصوہ کے میدان میں (۱۷۔ اکتوبر ۱۴۴۸ء) اس مرتبہ بھی مسیحیوں نے شکست فاش کھائی۔

قسطنطنیہ کا بادشاہ جان ہشتم ۱۴۲۵ء سے ۱۴۴۸ء تک حکمران رہا۔ اس کی وفات پر قسطنطین سیزدہم تخت نشین ہُوا۔ یہ قسطنطنیہ کا آخری مسیحی فرمانروا تھا۔

سلطان مراد ثانی نے ۱۴۵۱ء میں وفات پائی اور اس کا نوجوان فرزند محمدؒ عثمانی سلطنت کا تاجدار بنا۔ شمار کے لحاظ سے یہ محمدؒ ثانی تھا۔ یہ عموماً محمدؒ فاتح کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ قسطنطنیہ اسی کے ہاتھوں فتح ہُوا تھا اور یہ اتنا بڑا کارنامہ تھا، جس کی بنا پر اس کے لیے فاتح کا لقب ہر اعتبار سے موزوں تھا۔

---

[1] VARNA یہ بحیرۂ اسود پر بلغاریہ کی مشہور بندرگاہ ہے۔

نواں باب

فتح قسطنطنیہ

(۱)

سلطان کا عزم

تخت نشین ہوتے ہی سلطان محمّد ثانی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ قسطنطنیہ کو مسخر کر لینا چاہیے کہ اس کے بغیر اطمینان سے یورپ میں پیش قدمی نہیں کی جا سکتی۔ قسطنطنیہ کے شہنشاہوں نے ایک طرف سلطنت عثمانیہ سے معاہدے کر رکھے تھے اور ان کے پاس غالباً ایک ترک شہزادہ بھی پناہ گزیں تھا، جس کے لیے وہ باقاعدہ رقمیں وصول کیا کرتے تھے۔ اس کا نام اورخاں تھا۔ دوسری طرف وہ پاپائے روم یا مسیحی حکومتوں سے ساز باز بھی کرتے رہتے تھے۔

ان شہنشاہوں نے دربارِ عثمانیہ کے بعض بلند پایہ عہدہ داروں سے نہایت خوشگوار تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ ان میں سے ایک خلیل پاشا بھی تھا، جو سلطان محمّد ثانی کا وزیر تھا بلکہ گبن نے اسے مسیحیوں کا "خفیہ[1] دوست" قرار دیا ہے۔ سلطان فتح و تسخیر کی تدبیروں میں مصروف تھا۔ اس اثناء میں قسطنطنیہ کے سفیر ایڈریانوپل پہنچے اور خلیل پاشاہ سے ملے۔ ساتھ ہی ترک شہزادے کے وظائف میں اضافے کی تجویز پیش کی۔

خلیل پاشا کا انتباہ

خلیل پاشا نے جواب دیا:

"احمق اور بدبخت رومیو! ہمیں تمھاری چالوں کا علم ہے۔ تمھیں اس خطرے کا کوئی احساس نہیں، جو تمھارے سر پر منڈلا رہا ہے۔ محتاط سلطان مراد چل بسا۔ اس کا تخت ایک نوجوان فاتح کے قبضے میں ہے، جو اپنے آپ پر کسی بھی پابندی کا روادار نہیں اور جس کے راستے میں کوئی مشکل رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اگر اس کے ہاتھ سے بچ نکلے تو اسے خدا کی رحمت سمجھنا اور یقین کر لینا کہ

---

[1] گبن جلد سوم ص ۰ ۷۵

ابھی خدا تمھارے گناہوں کی سزا میں ڈھیل دے رہا ہے۔ تم بے سُود اور بالواسطہ دھمکیوں سے ہمیں ڈرانے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟ تم اورخاں کو رہا کر دو۔ اسے رومانیہ کا بادشاہ بنا دو۔ دریا پار سے اہلِ ہنگری کو اپنی امداد کے لیے بُلالو۔ ہمارے خلاف مغربی قوموں کو میدانِ جنگ میں لے آؤ۔ غرض جو چاہو، کرو، مگر یقین رکھو، نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ہمیں اشتعال دلاؤ گے اور اپنی تباہی قریب تر لے آؤ گے۔"[۱]

خلیل پاشا کے اس انتباہ سے واضح ہے کہ حکومت قسطنطنیہ چاہتی تھی اورخاں کو رومانیہ کا بادشاہ بنا کر سلطان محمدؒ کے خلاف رزم آرائی کے لیے تیار کر دیا جائے اور پُورا یورپ اس کی امداد پر آمادہ ہو جائے۔

سُلطان کا ابتدائی اقدام

باسفورس کے مدخل پر ایشیائی جانب سلطان بایزید یلدرم نے ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا، جسے "اناطولی حصار" کہتے تھے۔ سلطان محمدؒ ثانی مدخل کے یورپی جانب ایک قلعے کی تعمیر کا حکم دے دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اوّلاً دونوں قلعوں میں فوج کے علاوہ اعلیٰ درجے کی توپیں رکھی جائیں تاکہ آبنائے باسفورس اور بحیرۂ اسود میں آمد و رفت ترکوں کی مرضی کے مطابق جاری رہے۔ ثانیاً یہ کہ قسطنطنیہ سے صرف تین چار میل کے فاصلے پر ایک مستحکم فوجی مرکز تیار ہو جائے، جہاں سے شہر پر حملے کے دوران میں امداد ملتی رہے اور اگر حملے میں ناخوشگوار صورت پیدا ہو تو یہ حصار سلطانی فوج کے لیے ایک زبردست دفاعی مورچے کا کام دے۔

یونانی سفیروں نے اس کے خلاف اعتراض کرتے ہوئے سلطان سے کہا کہ آپ کے جدِّ امجد نے قلعہ بنانے کی اجازت مانگی تھی تو نہیں دی گئی تھی، اب اس قلعے کی تعمیر معاہدے کی صریح خلاف ورزی ہو گی۔ سلطان نے جواب دیا:

"میں نے شہر کے خلاف ابھی کوئی عزم نہیں کیا، لیکن ظاہر ہے کہ قسطنطنیہ کی سلطنت کے حدود شہر کی فصیل پر ختم ہو جاتے ہیں۔ کیا تم لوگوں کو میرے والد کی پریشانیوں کا زمانہ یاد نہیں رہا، جب اہلِ ہنگری سے اتحاد کر کے تم ہمارے

---

[۱] گبن جلد سوم ص ۷۵۱

ملک پر حملہ آور ہوئے تھے اور فرانسیسی بیڑے نے درۂ دانیال کو روک لیا تھا؟ مُراد زور و قوّت سے کام لے کر آبنائے باسفورس میں سے گزرا اور تمھاری قوّت تمھارے عناد و عداوت کا ساتھ نہ دے سکی۔ میں اس وقت ایڈریانوپل میں کمسن تھا۔ مسلمان کانپ رہے تھے اور گبر ہماری عزّت چھیننے کے درپے تھے، لیکن جب میرے والد نے وارنا کے میدانِ جنگ میں فتح حاصل کی تو قسم کھائی تھی کہ باسفورس کے مغربی ساحل پر ضرور قلعہ تعمیر کیا جائے گا۔ میرا فرض ہے کہ وہ قسم پوری کروں۔ کیا تمھیں حق ہے اور تم میں قوّت ہے کہ جس خطّے کا میں مالک ہوں، وہاں میرے اعمال پر پابندی عائد کرو؟ یہ خطّہ میرا ہے۔ باسفورس کے کناروں پر ایشیائی جانب ترک آباد ہیں۔ یورپی جانب رومیوں نے خالی کر دی ہے۔ واپس جاؤ اور اپنے بادشاہ کو بتادو، موجودہ عثمانی سلطان اپنے پیشرووں سے مختلف واقع ہُوا ہے۔ میرے عزائم پیشرووں کی خواہشات سے بہت آگے ہیں۔ میں وہ سب کچھ پُورا کر دینا چاہتا ہوں، جو میرے پیشرووں کے عزائم میں بھی نہ آیا تھا۔ تمھیں بہ حفاظت جانے کی اجازت ہے، لیکن پھر کوئی سفیر اس قسم کا پیغام لے کر آیا تو وہ کھال کھینچے جانے کا سزاوار ہوگا۔"[1]

رومِ ایلی حصار کی تعمیر

فرمانِ سلطانی کے مطابق قلعے کا مقام تجویز کر لیا گیا۔ یورپ اور ایشیا سے خشکی اور تری کے راستے بڑی تیزی کے ساتھ سامانِ تعمیر موقع پر پہنچنے لگا۔ چونا تیار کرا لیا گیا۔ لکڑی کٹوا لی گئی۔ پتھر جمع ہو گئے۔ ایک ہزار معمار موقع پر پہنچ گئے۔ ہر معمار کے ساتھ دو مزدور تھے۔ ہر معمار کا فرض یہ تھا کہ دن بھر میں دو مربع فٹ دیوار تیار کر دے۔ قلعہ شکل میں مثلث تھا۔ ہر گوشے پر نہایت مضبوط و مستحکم بُرج بنوا دیے گئے۔ دیواریں بائیس فٹ چوڑی تھیں اور بُرجوں کی چوڑائی تیس فٹ رکھی گئی۔ سلطان اور اس کے وزیر

---

[1] گبن جلد سوم ص: ۷۵۱، ۷۵۲

اور قاضی خود موقع پر موجود تھے۔ یونانی بادشاہ قلعہ بنتا ہوا دیکھ رہا تھا، لیکن اسے انگلی تک اُٹھانے کی ہمت نہ ہوئی[1]۔

قلعے کی تکمیل کے بعد وہاں فوج بٹھا دی گئی اور اسے حکم مل گیا کہ گھوڑوں اور خچروں کو ارد گرد کی چراگاہوں میں چراؤ۔ اگر کوئی مقامی شخص کسی کو آزار پہنچانا چاہے تو اسے سزا دی جائے۔ ساتھ ہی باسفورس میں سے گزرنے والے جہازوں پر محصول عائد کر دیا گیا۔ وینس کے ایک جہاز نے محصول دینے سے انکار کیا تو گولا مار کر اسے سمندر کی تہ میں پہنچا دیا گیا۔ یہ ۱۴۵۲ء کا واقعہ ہے۔ ۱۴۵۳ء کے موسم بہار میں قسطنطنیہ پر حملے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

خاص توپ

سلطان محمدؒ نے انتظار کا وقت بڑے اضطراب میں گزارا۔ گبن نے لکھا ہے کہ اس نے مشغولیت کی غرض سے ایڈریانوپل میں ایک خاص قصر کی بُنیاد رکھ دی تھی، جس کا نام رفعت کی بنا پر "جہاں نما" تجویز ہُوا[2]۔ اسے خود جنگی آلات کے اسرار و رموز میں مہارتِ تامّہ حاصل تھی۔ لاطینی قومیں اُس وقت تک جتنے آلاتِ ایجاد کر چکی تھیں، سلطان محمدؒ نے ان کا بغور مطالعہ کیا اور ایسا توپ خانہ تیار کر لیا، جو اُس وقت تک دنیا کے کسی فرمانروا کو میسّر نہیں آیا تھا۔ توپ سازی کا ایک ماہر اسے مل گیا تھا، جسے گبن نے ڈنمارک یا ہنگری کا باشندہ قرار دیا ہے۔ وہ یونانیوں کے پاس رہا، مگر کسی نے اس کی مہارتِ فن کی قدر نہ کی اور وہ مجبُور ہو کر سلطان کے پاس چلا گیا[3]۔ سلطان نے پُوچھا: کیا ایسی توپیں بنا سکتے ہو، جن کے گولے قسطنطنیہ کی دیواروں کو توڑ سکیں۔ تشفّی بخش جواب مل جانے کے بعد ضروری سامان مہیا کر دیا گیا اور ایک ایسی توپ ڈھالی گئی، جس کا دہانہ ۱۲ انچ تھا اور وہ

---

[1] مشہور ہے کہ اس قلعے (روم ایلی حصار) کے بُرج اس طریق پر بنائے گئے کہ دُور سے دیکھا جائے تو وہ دیواروں سے مل کر "محمدؐ" کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور دُور سے دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مبارک نام دیوقامت حروف حجر میں لکھ کر اعلان کے طور پر ہوا میں معلق کر دیا گیا ہے (مقام خلافت صہ ۱۰۱) ٹامس ایلیم کی کتاب میں روم ایلی حصار اور اناطولی حصار دونوں کی نہایت عمدہ تصویریں ہیں (ملاحظہ ہو صہ ۹ و صہ ۷۷)۔ روم ایلی حصار کی اس تصویر سے تو بیان کردہ صُورت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کسی خاص زاویہ نگاہ سے دیکھنے پر یہ کیفیت نمایاں ہوتی ہو۔

[2] گبن، جلد سوم صہ ۷۵۴ [3] ایضاً صہ ۷۵۵۔

چھ سو پونڈ کا سنگی گولا ایک میل کے فاصلے پر پھینک سکتی تھی۔[1]

توپ مکمل ہو گئی اور اسے تجربے کی غرض سے سر کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ہر سمت ساڑھے بارہ میل تک اس کی آواز سنی گئی۔ گولا جہاں گرا، زمین میں چھ فٹ کا گڑھا پڑ گیا۔ اس توپ کو دوسری جگہ لے جانے کے لیے تیس گاڑیاں باہم جوڑی گئیں اور انھیں کھینچنے کے لیے ساٹھ بیلوں کی ضرورت پڑی۔ ڈیڑھ سو آدمی دونوں جانب سے توپ کو تھامے ہوئے تھے اور اڑھائی سو آدمی آگے آگے راستہ ہموار کرتے جا رہے تھے۔ قسطنطنیہ تک ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ تقریباً دو مہینے میں طے ہوا۔[2]

مولانا شبلی نے سفرنامۂ روم و مصر و شام میں لکھا ہے:

"لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ محمدؐ فاتح نے جب قسطنطنیہ کے فتح کرنے کا عزم کیا تو اس وقت توپ اور گولے کا عام رواج نہ تھا۔ محمدؐ نے خود توپیں ڈھالیں اور مٹی کے گولے بنوائے۔ جن میں سے چند یادگار کے طور پر اب بھی محفوظ ہیں۔ یہ گولے پختہ اور نہایت مضبوط ہیں۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ لوہے کے گولے سے کم نہیں۔"[3]

سلطان کا اضطراب

سلطان ان دنوں اتنا مضطرب تھا کہ بعض اوقات ساری ساری رات آنکھ نہیں لگتی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ نصف شب کے وقت دوسرا پہر ابد لنے والا تھا تو سلطان کا فرمان فوری حاضری کے لیے خلیل پاشا کے پاس پہنچا۔ مسیحیوں کے ساتھ پاشا کے خصوصی تعلقات کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ چنانچہ اسے خیال ہوا کہ شاید سلطان کے دل میں بے اعتمادی پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے بیوی بچوں سے وداعی ملاقات کی اور کشتی میں اشرفیاں بطور نذرانہ لگا کر سلطان کے پاس پہنچا۔ سلطان نے کہا کہ میں تمھیں جو کچھ دے چکا ہوں، اسے واپس لینے کا خواہاں نہیں بلکہ نہایت قیمتی تحفہ لینا چاہتا ہوں اور وہ ہے قسطنطنیہ۔ پاشا نے جواب دیا کہ رومی سلطنت اللہ تعالیٰ نے آپ کے قبضے میں دے دی ہے۔ ایک شہر باقی رہ گیا ہے، یہ بھی مل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے سلطان کی جنگی قوت فتح کا یقین دلا رہی ہے۔ میں خود یا حضور کے

---

[1] گبن جلد سوم ص ۵۵، [2] ایضاً ایضاً ص ۵۶، [3] سفرنامۂ روم و مصر و شام مطبوعہ رحمانی پریس دہلی ص ۲۱۔

دوسرے وفادار غلام جان و مال قربان کر دینے میں دریغ نہ کریں گے۔

سلطان خواب گاہ میں تھا، بولا:

"لالہ! یہ تکیہ دیکھتے ہو؟ ساری رات اضطراب میں گزری ہے۔ کبھی تکیہ اُٹھا کر اس طرف رکھتا تھا اور کبھی اس طرف۔ کبھی اُٹھ بیٹھتا تھا، کبھی لیٹ جاتا تھا۔ ساری رات نیند آنکھوں سے گریزاں رہی۔ رومیوں کے سیم و زر کی ترغیب سے بچو۔ جنگی قوت میں ہم ان پر فائق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رسول اللہ صلعم کی برکات سے ہم بہت جلد قسطنطنیہ کے مالک بن جائیں گے۔[1]"

سپاہ کے دلی خیالات معلوم کرنے کی غرض سے وہ اکثر بھیس بدل کر بازاروں میں پھرتا رہتا۔ گھنٹوں قسطنطنیہ کا نقشہ سامنے رکھ کر غور کرتا رہتا کہ فصیل پر کہاں کہاں حملہ کیا جائے۔ انجنیروں اور سپہ سالاروں کو پاس بٹھا کر مشورے کرتا کہ توپیں کہاں کہاں نصب کی جائیں، سرنگوں کا انتظام کہاں کہاں کیا جائے، سیڑھیاں کہاں کہاں لگائی جائیں۔

قسطنطنیہ اور مسیحی دُنیا

سلطان کی تیاریوں کا یہ عالم تھا اور رومی شہنشاہ آسمان و زمین سے امداد کے لیے التجائیں کر رہا تھا۔ مگر گبن کے قول کے مطابق تمام غیر مرئی قوتیں ان التجاؤں کی طرف سے کان بند کیے بیٹھی تھیں۔ بعض مسیحی حکومتیں کمزور تھیں، بعض قسطنطنیہ سے بہت دُور تھیں۔ بعض کے نزدیک خطرہ محض وہم و خیال کی تخلیق تھا، بعض اسے اٹل سمجھتی تھیں:

"مغربی حکمران اپنی لامتناہی اور داخلی کشمکشوں میں الجھے ہوئے تھے۔ پاپائے روما یونانیوں کی غلط روی اور اصرار پر بگڑا بیٹھا تھا۔ نکولس خامس[2] نے اٹلی کی جنگی قوت اور مالی امداد قسطنطنیہ کے لیے وقف کر دینے کے بجائے پیشگوئی کر دی تھی کہ شہر تباہ ہو جائے گا۔ اور اب اس پیشگوئی کو پورا کرنے میں مصروف تھا۔[3]"

موریا اور جزیروں کے یونانی حاکم بھی غیر جانب دار رہے۔ غلطہ میں جنوا کی جو بستی تھی، اس نے خفیہ خفیہ سلطان سے معاہدہ کر لیا۔ بہت سے عوام اور امرا خطرے کو بھانپتے ہوئے شہر چھوڑ کر چلے گئے۔

---

[1] گبن جلد سوم ص ۷۵۵ - [2] NICHOLAS پاپائے روما (۱۴۴۷ء - ۱۴۵۵ء)

[3] گبن جلد سوم ص ۷۵۶، ۷۵۷

دسواں باب

فتح قسطنطنیہ

(۲)

محاصرے کا آغاز ۱۴۵۳ء کے موسمِ بہار میں سلطانی عساکر کے ہراول نے قسطنطنیہ کی فصیل تک تمام قصبات و دیہات پر قبضہ کر لیا۔ خود سلطان پوری فوج کے ساتھ ایڈریانوپل سے نکلا اور قسطنطنیہ سے پانچ میل کے فاصلے پر کچھ دیر ٹھہرا رہا۔ پھر تیاریوں کا جائزہ لیتا ہُوا شہر کے سامنے پہنچ گیا۔ سلطان کا خیمہ قسطنطنیہ کے اس دروازے کے سامنے تھا، جسے یونانی دور میں باب سینٹ رومانوس[۱] کہتے تھے۔ ترکوں کے زمانے میں اس کا نام "طوپ قپوسی" رکھا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دُہری فصیل کا یہ حصّہ بہت کمزور تھا۔ اسی کے سامنے سلطان نے سب سے بڑی توپ نصب کرائی تھی۔ جو گولے اس توپ سے پھینکے گئے تھے، ان میں سے بعض اب تک محفوظ ہیں۔ ۶ر اپریل سے قسطنطنیہ کا محاصرہ شروع ہو گیا۔

سلطان اور محصورین کی افواج کے متعلق زیادہ بحث کی ضرورت نہیں۔ مسیحیوں نے سلطانی فوج کی تعداد دو لاکھ تک پہنچا دی تاکہ شہر کی تسخیر کا واقعہ زیادہ سے زیادہ قابلِ یقین سمجھا جائے۔ گبن کے بیان کے مطابق فللفس[۲] نام ایک شخص نے بتایا تھا کہ پوری ترکی فوج ساٹھ ہزار سواروں اور بیس ہزار پیادوں سے زیادہ نہ تھی۔[۳] اس کے برعکس محصور فوج تقریباً پانچ ہزار بتائی جاتی ہے۔ ۱۲ر اپریل کو جسٹینیانی[۴] پانچ جہاز لے کر قسطنطنیہ پہنچ گیا تھا، جن پر پانچ ہزار جنگجو سوار تھے۔ اس طرح محصور فوج کی تعداد دس ہزار ہو گئی، لیکن اصل سوال افواج کی تعداد کا نہیں۔ قسطنطنیہ

---

[۱] ST. ROMANUS یہ دروازہ خشکی کی جانب کی فصیل کے تقریباً وسط میں تھا۔ چونکہ اس کے سامنے بہت بڑی توپ لگائی گئی تھی، اس لیے ترکوں نے اس کا نام طوپ قپوسی رکھا۔

[۲] PHILELPHUS

[۳] گبن جلد سوم ص ۷۵۸۔

[۴] JUSTINIANI یہ جنوآ کا ایک امیر تھا۔

میں جو بھی مردِ موجود تھا، وہ بہرحال شہر کے اندر رہ کر ان تمام فرائض کو انجام دے سکتا تھا، جو کسی تربیت یافتہ سپاہی کے ذمے عائد کیے جا سکتے تھے اور سلطان کی فوج کم تھی یا زیادہ، قسطنطنیہ وقت کے مخصوص حالات کی بنا پر قطعاً ناقابلِ تسخیر مانا جاتا تھا کیونکہ جنوب مشرق اور شمال کی جانب سمندر تھا۔ "شاخِ زرّیں" کے دہانے پر بھاری زنجیر بندھی ہوئی تھی اور کوئی جہاز اہلِ شہر کی مرضی کے خلاف اس میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف مغربی سمت سے پیش قدمی ممکن تھی، اور اُدھر دُہری فصیل موجود تھی۔

فصیل کی کیفیت

فصیل پورے شہر کو گھیرے ہوئے تھی، گویا بحیرۂ مرمرا اور "شاخِ زرّیں" کے پانیوں کے ساتھ ساتھ بھی فصیل موجود تھی۔ پوری فصیل کی لمبائی ۱۹½ کلومیٹر (تقریباً بارہ میل) تھی اور اس کے ساتھ ساتھ چار سو بُرج بنے ہوئے تھے۔ مختلف اطراف میں تقریباً پچاس دروازے تھے۔ خشکی کی جانب فصیل دُہری تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی چوڑائی گیارہ فٹ سے کم نہ تھی۔ فصیل کے باہر خندق تھی، جس کی چوڑائی بعض نے چھیالیس سے باسٹھ فٹ تک بتائی ہے اور گبن لکھتا ہے کہ وہ ایک سو فٹ گہری تھی۔

فوج کے علاوہ سلطان کے ساتھ کم و بیش ڈیڑھ سو جنگی جہاز بھی تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ اگر شہر پر خشکی کی جانب سے نیز "شاخِ زرّیں" کی جانب سے بیک وقت حملہ ہوتا تو اس کی تسخیر میں تاخیر نہ ہوتی، لیکن سلطان کے جنگی جہاز بحیرۂ مرمرا یا باسفورس کی طرف سے "شاخِ زرّیں" میں داخل نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ اس کا مدخل بھاری زنجیر نے بند کر رکھا تھا۔

زبردست حملے

سلطان نے خشکی کی جانب جا بجا موزوں مقامات پر توپیں نصب کرائیں، جن سے بے پناہ گولے دیواروں پر برستے تھے۔ بڑی توپ چند مرتبہ چل چکنے کے بعد پھٹ گئی اور آس پاس کے آدمی مارے گئے۔

سلطان نے خندق کوڑے کرکٹ سے بھر والی اور توپوں کے علاوہ منجنیقوں سے بھی کام لیا گیا اور سرنگیں بھی لگائی گئیں۔ اُس زمانے میں فصیلوں پر حملے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ لکڑی کے اونچے اونچے بُرج بنائے جاتے، جن کی منزلیں تین تین چار چار ہوتیں۔ ان میں سپاہی بٹھا دیے جاتے۔ بُرجوں کے نیچے پہیے لگے ہوتے اور بیلوں کے ذریعے سے انھیں فصیل کے قریب پہنچا دیا جاتا۔ پھر اوپر کی منزل کے سپاہی موقع پاتے تو فصیل پر پہنچ جاتے۔ ان میں سے کوئی مارا جاتا تو نیچے کی

منزلوں سے دوسرا آدمی پہنچ کر مقتول کی جگہ لے لیتا۔ حملے کے اس طریقے سے بھی فائدہ اُٹھایا گیا، تاہم شہر کی تسخیر کی کوئی صورت نہ بنی۔

گبن کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مقام پر فصیل میں شگاف پڑا تو سلطان خود گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچ گیا، لیکن یہ حملہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔

خشکی پر جہاز

اب سلطان نے کوئی دوسری تدبیر سوچنی شروع کی۔ سوچتے سوچتے اسے یہ تدبیر سُوجھی کہ کسی طرح جہاز باسفورس سے سیدھے "شاخِ زرّیں" کے اندر پہنچا دینے چاہئیں اور دہانے سے گزرنے کی بے سود کوشش ترک کر دینی چاہیے۔ چنانچہ باسفورس سے "شاخِ زرّیں" کے اس مقام تک جسے خلیج قاسم پاشا کہا جاتا ہے، ایک راستہ تجویز کر لیا گیا، جو گبن کے بیان کے مطابق تقریباً دس میل تھا[1]۔ بعض لوگ اس کی لمبائی صرف پانچ میل بتاتے ہیں۔ کسی قطعی نتیجے پر پہنچنا اس لیے مشکل ہے کہ اب اس حصے کی حالت بالکل بدل گئی ہے اور کوئی شخص چل پھر کر بھی صحیح مقام معلوم کرنا چاہے تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔

بہرحال باسفورس کے کسی حصے سے، جو ببک[2] اور ارنود کوئی[3] کے آس پاس ہوگا، ایک راستہ خلیج قاسم پاشا تک تجویز کر لیا گیا۔ پوری زمین ناہموار تھا اور جگہ جگہ جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ سلطان نے ایک ہموار راستہ تیار کرایا اور اس پر لکڑی کے تختے بچھوا دیے۔ ان پر بھیڑ بکری اور گائے بیل کی چربی خوب ملوا دی گئی۔ پھر درمیانے درجے کی تقریباً اسّی کشتیاں باسفورس سے خشکی کے اس راستے پر پہنچا دی گئیں اور وہاں سے کھینچتے کھینچتے خلیج قاسم پاشا پر "شاخِ زرّیں" میں ڈال دی گئیں۔ ان پر آدمی سامانِ جنگ کے ساتھ سوار تھے۔

صرف ایک اندیشہ تھا کہ اہلِ جنوآ کی جو بستی غلطہ میں آباد تھی، اس کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ ہو۔ سلطان نے پہلے سے جابجا توپیں لگا کر اس کا انتظام کر لیا تھا اور حکم دے دیا تھا کہ برائے نام بھی مزاحمت ہو تو پوری بستی توپوں سے اُڑا دی جائے۔

آخری حملہ

اس طرح خشکی اور تری دونوں جانب سے بیک وقت حملے کا انتظام ہو گیا۔ سُلطانی فوج کے حوصلے بڑھ گئے۔ محصورین کی امیدوں کے مطلع پر تاریکی چھا گئی۔ سلطان نے ابتدا ہی میں رومی حکمران کو پیغام بھیج دیا تھا کہ مزاحمت بے سود ہے۔ شہر کو مسخر کیے بغیر میں واپس نہ

---

[1] گبن جلد سوم ص ۷۶۶ - [2] BABEC [3] ARNOUT KIOY ہر دو مقامات کے لیے ملاحظہ ہو نقشہ باسفورس

جاؤں گا۔ بہتر یہ ہے کہ لڑائی کے بغیر شہر حوالے کر دو۔ یہ تجویز قبول نہ کی گئی۔

۲۷۔ مئی کی شام کو سلطان نے حکم دے دیا کہ ۲۹ کی صبح کو آخری حملہ ہو گا۔ سب نے خلوص سے دعائیں کیں۔ ۲۹۔ مئی کو سلطانی فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ قسطنطین سیز دہم کی لاش کشتوں کے انبار سے ملی۔ آبادی کا بڑا حصہ ایا صوفیہ کے گرجے میں جمع ہو گیا تھا۔ سلطان خود وہاں پہنچا اور سب کے لیے امان کا مژدہ سنا دیا۔ اُس وقت سے ۱۹۲۴ء تک قسطنطنیہ سلطنت عثمانیہ کا مرکز رہا۔ ۱۵۱۷ء میں سلطان سلیم اوّل نے مصر پر قبضہ کیا تو منصبِ خلافت بھی عثمانیوں ہی کو مل گیا۔ گویا چار سو سات سال تک قسطنطنیہ کو دنیائے اسلام کا قلب ہونے کی عزت حاصل رہی۔ اس کے بعد جمہوریہ ترکیہ نے انقرہ کو مرکز بنا لیا، تاہم قسطنطنیہ آج بھی ترکی کا سب سے بڑا شہر ہے اور اس کے ساتھ سلاطینِ عثمانیہ کی جو یادیں وابستہ ہیں، ان کی وجہ سے اسے مذہبی اعتبار سے نہیں تو کم از کم دنیوی اعتبار سے مقاماتِ مقدسہ کے بعد سب سے اونچا رتبہ حاصل ہے۔

شہر کی آبادی

بہت سے یونانی باشندے تسخیرِ شہر سے پیشتر ہی نکل گئے تھے۔ خاصی تعداد محاصرے کے دوران میں ماری گئی۔ اس کے بعد سلطان نے اس شہر میں ترکوں کی خاصی بڑی تعداد بسائی۔ ان کے علاوہ ارمنوں اور دوسرے مسیحیوں کو آباد ہونے کی اجازت مل گئی۔ آرتھوڈکس مشرقی مسیحیت کا سب سے بڑا مرکز قسطنطنیہ ہی تھا۔ سلطان نے اسقفِ اعظم کے تمام مذہبی حقوق بحال کر دیے اور مسیحیوں پر اسے پہلے کی طرح مقتدر بنا دیا۔ پھر مرکزیت کی بنا پر شہر کی آبادی بڑھنے لگی، یہاں تک کہ یہ ترکی کا سب سے بڑا شہر بن گیا۔

بلدۂ طیّبہ

مولانا شبلی نے سفرنامہ میں لکھا ہے:

"مسلمانوں نے قرنِ اوّل ہی میں اس (قسطنطنیہ) کو تسخیر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ چنانچہ سب سے اوّل جس نے اس کی شہر پناہ کے آہنی دروازے پر تلوار ماری، وہ عبداللہ بن المطلب، خلیفہ ولید بن عبدالملک کا سپہ سالار تھا۔ اس کے بعد اَور خلفاء و سلاطین نے بھی اس پر حملے کیے، لیکن قیصرانِ روم کا خاتمہ محمد فاتح کے نام سے ہونے والا

تھا، جس نے ۸۵۷ھ (۱۴۵۳ء) میں اس عظیم الشان دارالسلطنت پر صلیب کے بجائے عَلَمِ اسلام بلند کیا۔ اس حیرت انگیز معرکے کی یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چونکہ عیسائیوں نے بندرگاہ کا راستہ دریا (سمندر) کی طرف سے روک رکھا تھا، ترکوں نے باسفورس اور گولڈن ہارن (شاخِ زریں) کے درمیان جو سنگلاخ زمین ہے، اس پر پانچ میل تک لکڑی کے تختے بچھا دیے اور جہازوں کو، جن میں پہیے لگائے تھے، اس پر چلا کر تمام فوجیں گولڈن ہارن میں اتار دیں۔ اُس وقت اس نامور فاتح کی عمر کُل تیئیس ۲۳ برس کی تھی۔ اس فتح کا مادۂ تاریخ "بلدۃ طیّبۃ" ہے[۱]۔

فتح کے بعد ترکوں نے اس شہر کا نام "استنبول" رکھا، جسے بعض اوقات "استانبول" اور "اسلامبول" بھی کہتے رہے۔ یہ نام قسطنطنیہ کے ایک یونانی نام پر مبنی ہے۔ اگرچہ عام طور پر یہ قسطنطنیہ ہی کے نام سے مشہور رہا یا اسے "بابِ عالی" کہا جاتا تھا، جو حکومت عثمانیہ کی تین بڑی وزارتوں (وزارتِ عظمیٰ، وزارتِ خارجہ اور وزارتِ داخلہ) کے مشترکہ دفاتر کا نام تھا۔ مسلمان عموماً اسے مقامِ خلافت کہتے تھے۔

اہلِ یورپ کو اُبھارنے کی تدبیریں

گبن لکھتا ہے کہ قسطنطنیہ کی اہمیت کا سب کو احساس تھا اور اس کا نقصان بُری طرح محسوس کیا گیا۔ پوپ نکولس خامس کی تذلیل ہوئی۔ لاطینیوں کے دل میں غم و غصہ تازہ ہو گیا۔ برگنڈی کے ڈیوک فلپ نے فلینڈرز کے ایک مقام پر امراء کے لیے دعوت کا انتظام کیا۔ اس موقع پر ایک ڈراما بھی دکھایا گیا، یعنی ایک مسلمان ہاتھی پر سوار ہال میں داخل ہُوا اور اس نے قلعہ بھی ہاتھی کی پشت پر لاد رکھا تھا۔ پھر ایک خاتون ماتمی لباس میں اس قلعے سے نمودار ہوئی۔ یہ مذہب کی تمثال تھی۔ وہ آہ و فغاں کر رہی تھی کہ مجھے بچانے والوں نے دیر لگا دی۔

---

[۱] سفرنامۂ ارض القرآن/ دورۂ مصر و شام ص ۲۶۔ یہاں اتنا اور عرض کر دینا چاہیے کہ قسطنطنیہ پر حملہ ولید بن عبدالملک نے نہیں بلکہ اس کے بھائی سلیمان عبدالملک نے کیا تھا اور جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، مسلمہ اسلامی فوج کا سالار تھا۔ مولانا نے جو یہ فرمایا ہے کہ تمام فوجیں گولڈن ہارن میں اتار دیں تو یہ صحیح نہیں۔ فوج کا بڑا حصہ خشکی کی جانب رہا، البتہ ایک حصہ گولڈن ہارن میں بھی پہنچ گیا تھا۔

گبن کہتا ہے کہ فلپ جب تک زندہ رہا، ترکوں کے خلاف جنگِ مقدس کی تیاریوں میں مصروف رہا۔ دوسرے امراء نے بھی اس کی پیروی میں حلف اٹھائے۔ اگر سویڈن سے نیپلز تک تمام مسیحی اسی روح سے معمور ہو کر متحدہ کوشش کرتے تو ترکوں کو درِ دانیال بلکہ دریائے فرات سے بھی پیچھے دھکیلا جا سکتا تھا، مگر ایک مدبر اور خطیب نے وقت کی مسیحی دنیا کی کیفیت یوں بیان کی تھی:

"یہ ایک جمعیت ہے، جس کا کوئی رئیس نہیں۔ ایک جمہوریت ہے، جو قوانین سے بھی عاری ہے اور قوانین نافذ کرنے والوں سے بھی۔ پوپ اور شہنشاہ بلند القاب سے مزین ہیں، لیکن ان کی حیثیت شاندار مجسموں کی ہے۔ وہ نہ حکم دے سکتے ہیں، نہ کوئی ان کا حکم ماننے کے لیے تیار ہے۔ ہر ملک کا الگ حکمراں ہے۔ ہر حکمراں کا اپنا مفاد ہے۔ کون سی خطابت ان متصادم و متحارب قوتوں کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر سکتی ہے؟ اگر انھیں مسلح صورت میں جمع کیا جا سکے تو کون سالاری کا منصب سنبھالنے کی جسارت کرے گا۔ ان میں نظم کیونکر قائم رکھا جا سکے گا؟ فوجی ڈسپلن کی کیا صورت ہو گی؟ اس بے پناہ ہجوم کے لیے رسد کا انتظام کون کرے گا؟ ان کی متعدد زبانیں کون سمجھے گا؟ یا اجنبی اور ناموافق طور طریقوں کے ہوتے ہوئے کون انھیں یکجا رکھے گا؟ کیا کوئی انسان ہے جو انگریزوں اور فرانسیسیوں، اہلِ جنوآ اور اہلِ اراگان، اہلِ جرمنی یا باشندگانِ ہنگری و بوہیمیا کو اکٹھا رکھ سکے گا؟ اگر اس مقدس جنگ کے لیے کم سپاہ بھرتی کی گئی تو غیر مسیحی اس کا تختہ الٹ دیں گے۔ اگر زیادہ سپاہ بھرتی کی گئی تو وہ اپنے بوجھ اور ابتری کے باعث خود تباہ ہو جائے گی"۔[1]

---

[1] گبن جلد سوم ص ۴۸۷۔

گیارھواں باب

سلاطین عثمانیہ

۱۴۸۱ء - ۱۸۳۹ء

بایزید ثانی سلطان محمد فاتح نے استنبول کی تسخیر کے بعد بہت سی فتوحات حاصل کیں لیکن ان کا تعلق ترکی سلطنت کی تاریخ سے ہے، نہ کہ شہر استنبول کی تاریخ سے۔ ۱۴۸۱ء میں اس نے وفات پائی اور اس کا بیٹا بایزید ثانی کے لقب سے بادشاہ بنا، لیکن تخت و تاج کے لیے جنگ ہندوستان کے مغل شہزادوں کی طرح عثمانی شہزادوں کی بھی خصوصیت رہی۔ چنانچہ بایزید کے بھائی، شہزادہ جم جسے یورپین مورخ جِم لکھتے ہیں، نے بروسہ میں اپنی سلطانی کا اعلان کر دیا۔ دونوں بھائیوں میں لڑائی ہوئی۔ جم نے شکست کھائی، اور یہ شہزادہ پناہ گاہ کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ہُوا اہلِ یورپ کے پاس پہنچ گیا، جہاں مختلف بادشاہوں نے اسے سلطنت عثمانیہ کے خلاف مُہرے کی طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی۔ شہزادے کو اس صورتِ حال پر بے حد قلق ہُوا۔ وہ اپنے تاج و تخت کے لیے لڑ سکتا تھا، لیکن غیروں کا آلۂ کار بن کر اپنی آبائی سلطنت کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ آخر پوپ الیگزانڈر ششم نے اسے اپنے پاس بُلا لیا۔ پھر بایزید ثانی سے بھاری رقم لے کر شہزادے کو زہر دے دیا۔

بایزید کے عہد میں وینس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان جنگ ہوئی۔ عثمانی بیڑے نے وینس کے مقبوضات کو بُری طرح تباہ کیا۔ آخر جمہوریۂ وینس صلح پر مجبور ہوگئی۔

سُلطان سلیم اب سلطنت عثمانیہ کا وہ دَور شروع ہُوا، جس میں اس کی بحری و بری قوت اوجِ کمال پر پہنچی اور اس کے حدود زیادہ سے زیادہ وسیع ہوئے۔ اس دَور کا پہلا سُلطان سلیم ہے، جو شمار کے لحاظ سے سلیم اور عادات و خصائل کے اعتبار سے سلیم یاؤز یعنی ہیبتناک یا تُند مزاج کہلایا۔ سلیم کو ایران، شام اور مصر میں لڑائیاں پیش آئیں۔ ایرانیوں کو چالدران کے مقام پر شکست دی اور بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ جو مرصع زریں تخت آج کل استنبول کے قدیم شاہی محل کے عجائب خانے میں موجود ہے، یہ سلطان سلیم ہی ایران سے لایا تھا۔ اُدھر آخری مملوک سلطان

قانصوہ غوری سے مرجِ دابق (شام) میں لڑائی ہوئی، جس میں قانصوہ مارا گیا اور سلطان سلیم شام و مصر کا مالک بن گیا۔

۱۲۵۸ء میں ہلاکو نے بغداد فتح کر لیا تھا اور عباسی خلافت وہاں ختم ہو گئی تھی تو ممالیک مصر نے عباسیوں ہی کے ایک فرد کو خلیفہ بنا کر مصر میں خلافت قائم کر دی تھی، جسے کوئی ملکی اختیار حاصل نہ تھا اور اس کی حیثیت محض ایک مذہبی و روحانی منصب کی تھی۔ سلطان سلیم آخری عبّاسی خلیفہ کو استنبول لے گیا۔ خلیفہ کو وظیفہ دے دیا اور منصبِ خلافت خود سنبھال لیا۔ ۱۵۱۷ء میں شریفِ مکّہ نے اطاعت قبول کر لی۔ اس طرح سلطان سلیم نے خلیفہ ہونے کے علاوہ خادمِ حرمین شریفین ہونے کا شرف بھی حاصل کر لیا۔

سلیمانِ اعظم

سلطان سلیم آٹھ سال کی حکومت کے بعد ۱۵۲۰ء میں فوت ہُوا تو اس کا بیٹا سلیمان جانشین ہُوا، جس کے عہد میں عثمانیوں کا اقتدار نصف النّہار پر پہنچا۔ اسے سلیمان اوّل اور سلیمان اعظم بھی کہتے ہیں۔ ترکوں میں یہ سلیمان قانونی کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس نے نظم و نسق کے نہایت عمدہ قوانین و ضوابط بنا کر سلطنت میں نافذ کیے تھے۔ اس کے عہد میں سلطنت عثمانیہ مغربی جانب الجزائر تک اور شمالی جانب وی آنا تک پہنچ گئی۔ سلیمان ہی نے مشہور ترین مسلمان امیر البحر خیر الدین پاشا باربروس کو اپنے بیڑے کا مختار بنا لیا تھا جس نے عثمانیوں کی بحری قوت اس پیمانے پر پہنچا دی کہ وینس، چارلس خامس اور پوپ نیز دوسری مسیحی قوتوں کے متحدہ بیڑے بھی اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ استنبول میں پیرا سے آگے دولما باغچہ کے قریب بشکطاش ایک مشہور مقام ہے، جس کے لفظی معنی ہیں گہوارہ والی پہاڑی۔ اس مقام کو بشکطاش اس لیے کہنے لگے کہ اس پر خیر الدین پاشا باربروس کا مزار ہے، جس کی وضع قطع گہوارے کی سی ہے۔

سلیمانِ اعظم کے حسنِ انتظام کی کیفیت یہ تھی کہ آس پاس کی مسیحی آبادیاں درخواستیں کر کر کے سلطنت میں شامل ہوتی تھیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف ہسٹری میں مرقوم ہے کہ سلیمانِ اعظم نے اپنے پیچھے جو سلطنت چھوڑی، وہ یورپ کی وسیع ترین سلطنت تھی۔ اس کا نظم و نسق بہترین تھا اور یورپی طاقتیں، جو خاندانی اور مذہبی کشاکشوں کے باعث خستہ حال تھیں، اس کے

مقابلے پر ٹھہر نہیں سکتی تھیں۔[1]

سلیمان کے بعد کی صدی

سلیمانِ اعظم نے ۱۵۶۶ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد ایک صدی میں یکے بعد دیگرے نو بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ اگرچہ کچھ مدت تک زوال کی پرچھائیں کا احساس نہ ہُوا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ زوال آہستہ آہستہ شروع ہو چکا تھا کیونکہ ترقی رُک گئی تھی اور مختلف سمتوں سے حملے شروع ہو گئے تھے۔ بلاشبہ بعض اوقات ترک سلاطین شکست کھاتے رہے، مگر بعض اوقات انھوں نے خاصی کامیابیاں حاصل کیں۔ ینی چریوں کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ اس عہد میں بعض قابل وزیروں نے سلطنت کو سنبھالے رکھا۔ مثلاً رستم پاشا، جو سلیمانِ اعظم کا داماد تھا۔

سلیمان کے جانشین سلیم ثانی کے عہد میں پاپائے رومہ نے ایک "مقدس جمعیت"[2] بنائی اور میسینا میں زبردست بیڑا جمع کر لیا۔ لیپانٹو[3] میں شدید بحری جنگ ہوئی، جس میں ترکوں کے بہت سے جہاز تباہ ہو گئے، تاہم امیر البحر علی پاشا نے انتہائی مستعدی سے نیا زبردست بیڑا تیار کر لیا۔

اس زمانے میں یہودیوں کو ہسپانیہ اور بعض دوسرے مسیحی ملکوں سے نکالا جا رہا تھا۔ ہسپانیہ کے ایک یہودی ڈان جوزف نسی[4] نے سلطان سلیم ثانی سے بڑے خوشگوار تعلقات پیدا کر لیے اور سلطان نے خارج شدہ یہودیوں کو استنبول، ایڈریانوپل اور دوسرے مقامات میں آبادی کی اجازت دے دی۔ اس وقت سے استنبول میں یہودیوں کو خاصی نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی۔

مراد ثالث، محمد ثالث، احمد اوّل اور مصطفیٰ اوّل چنداں قابلِ ذکر نہیں۔ مصطفیٰ اوّل ایک مرتبہ معزول ہُوا، کچھ مدت بعد اسے دوبارہ قید سے نکال کر سلطان بنایا گیا۔ عثمان ثانی بھی قابلِ ذکر نہیں۔ ان میں سے بعض سلاطین کو ینی چریوں نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا، البتہ مراد رابع (۱۶۲۳ء۔ ۱۶۴۰ء) کے عہد میں خاصی فتوحات حاصل ہوئیں۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر صرف چودہ سال کی تھی، تاہم اس نے بہت جلد سرکش ینی چریوں پر قابو پا لیا۔ پھر اکثر علاقے دوبارہ مسخر کر لیے، جن پر عباس اعظم کے عہد میں

---

[1] ص ۲۲۳ ۔ [2] THE HOLY LEAGUE اس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف مسیحی قوتیں مل کر عثمانیوں کو ختم کریں۔

[3] LEPANTO یہ مقام یونان میں خلیج کارنتھ کے شمالی ساحل پر واقع ہے۔ [4] DON JOSEPH NASSI

ایرانی قابض ہوچکے تھے۔ مراد نے ینی چریوں کو ختم کرنے کے لیے نئی فوجی تنظیم کی داغ بیل ڈالی لیکن ۱۶۴۰ء میں اس کی وفات پر اصلاحات کا سلسلہ رُک گیا۔

مراد کے بعد ابراہیم، پھر محمّد رابع (۱۶۴۸ء۔ ۱۶۸۷ء) تخت نشین ہُوا۔ یہ بھی کمسن ہی تھا، لیکن اس کے عہد میں کوپرلی خاندان نے نظم و نسق سنبھال لیا۔ پہلے محمّد کوپرلی وزیرِ اعظم رہا۔ پھر اس کے بیٹے احمد اور مصطفیٰ یکے بعد دیگرے نظم و نسق سلطنت کے ذمّہ دار ٹھہرے۔ ان کے حسنِ انتظام سے پھر فتوحات شروع ہوگئیں اور سلیمان اعظم کے بعد ۱۶۸۳ء میں دوسری مرتبہ ویانا کا محاصرہ کیا گیا۔

سلطان محمّد رابع کے عہد کا ایک قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ ۱۶۶۶ء میں فلسطین کے ایک یہودی سباتھی لیوی[ل] نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا اور بہت سے لوگ اس کے مُعتقد ہو گئے۔ سلطان نے اسے استنبول بلایا اور وعدہ کیا کہ اگر تمھارا دعویٰ صحیح ثابت ہُوا تو یروشلم تمھارے حوالے کر دوں گا۔ استنبول پہنچنے کے بعد سوال و جواب ہوئے تو اس نے کہا کہ مجھ پر گولی اثر نہیں کر سکتی، لیکن جب اسے ہدف بنا کر گولیوں کی زد میں بٹھایا گیا تو ہمت جواب دے گئی اور اس نے اقرار کر لیا کہ میں نے جھوٹا دعویٰ کیا تھا۔ چنانچہ اسے مناسب سزا دی گئی۔

سلیمان ثانی سے محمُود ثانی تک

محمود رابع کے بعد مصطفیٰ رابع تک دس سلطان تخت نشین ہوئے۔ ان میں سے صرف سلیم ثالث (۱۷۸۹ء۔ ۱۸۰۷ء) قابلِ ذکر ہے۔ اسی کے عہد میں نپولین نے پہلے مصر پر، بعد ازاں شام پر حملہ کیا تھا۔ اس نے بھی ینی چریوں کا زور توڑنے کے لیے نظم و نسق میں اصلاحات شروع کی تھیں، لیکن ینی چریوں نے موقع پاکر اسے تخت سے اُتار دیا اور اس کے بھتیجے مصطفیٰ رابع کو سلطان بنا دیا۔ ایک سالار نے، جو بیرقدار کے لقب سے مشہور تھا، استنبول پر حملہ کیا اور وہ کامیاب ہوگیا، لیکن قصرِ شاہی میں پہنچ کر سلیم ثالث کی بحالی سے پیشتر ہی ینی چریوں نے سلطان کو قتل کر دیا۔ مصطفیٰ رابع صرف چند مہینے سلطان رہا، پھر اس کا بھائی محمود ثانی (۱۸۰۸ء۔ ۱۸۳۹ء) تخت نشین ہُوا، جسے

ل SABATHI LEVI

اصلاحات کے باعث محمود مصلح کہتے ہیں۔ محمود مصلح نے تدبّر سے کام لیتے ہوئے نئی وضع کی فوج تیار کرلی۔ پھر ینی چریوں کو حکم دیا کہ جو چاہے، اس نئی فوج میں بھرتی ہو جائے۔ ینی چریوں نے اپنی عام روش کے مطابق سرکشی اختیار کی۔ سلطان محمود نے توپ خانہ لگا کر انھیں تباہ کر دیا۔ یوں عثمانیوں کی وہ شہرۂ آفاق فوج اپنی سرکشی اور کوتاہ اندیشی کے باعث ۱۸۲۶ء میں ختم ہوئی، جو سلطان اورخاں کے زمانے سے عثمانیوں کی فتوحات میں درخشاں ترین کارنامے انجام دے چکی تھی۔

سلطان محمود کے ارادے بڑے نیک تھے، لیکن اسے قدم قدم پر مختلف سمتوں سے رکاوٹیں پیش آئیں اور ان میں سلطنت کو بہت نقصان پہنچا، مثلاً:

۱ - یونانیوں نے یورپی طاقتوں کی انگیخت پر آزادی کے لیے جنگ شروع کر دی۔

۲ - نجد کے وہابیوں نے حجاز اور حرمین شریفین پر قبضہ کر لیا۔ سلطان کے حکم کے ماتحت مصر کے گورنر محمد علی پاشا نے ان سے جنگ کی۔ اس طرح ایک اسلامی قوّت دوسری اسلامی قوّت سے ٹکرا کر تباہ ہوئی۔

۳ - پھر سلطان اور حاکمِ مصر کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی، جس میں یورپی طاقتوں کو مداخلت کا موقع ملا۔ ایک طرف محمّد علی پاشا حاکمِ مصر کی قوّت کو نقصان پہنچا، دوسری طرف مصر کے لیے سلطنت عثمانیہ سے علٰحدگی کی داغ بیل پڑ گئی۔

سلطان محمود نے ترکوں کے لیے نیا لباس تجویز کیا، جس میں دستار کی جگہ طربوش کو رواج ملا۔ اسی طرح اس نے اور اصلاحات بھی کیں۔ ۱۸۳۹ء میں وفات پائی۔ اُس وقت تک عثمانی سلطنت خاصی کمزور ہو چکی تھی، تاہم بیرونی دنیا میں اس کا رُعب داب اور اقتدار بدستور قائم تھا۔

بارھواں باب

سلاطین عثمانیہ

(۱۸۳۹ء سے آخر تک)

عبدالمجید اوّل محمود مُصلح کے بعد اس کا بیٹا عبدالمجید اوّل (۱۸۳۹ء - ۱۸۶۱ء) تخت نشین ہُوا۔ اس کے عہدِ حکومت میں اصلاحات نے زیادہ معیّن صورت اختیار کی اور اس سلسلے میں پہلا قدم یہ اُٹھایا گیا کہ ۳۔ نومبر ۱۸۳۹ء کو ایک فرمان جاری ہُوا، جو "خطِ شریف گلخانہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں سلطنت عثمانیہ کی ساری رعایا کے جان و مال اور آزادی کی حفاظت کے لیے بُنیادی اصُول واضح کیے گئے تھے۔ اور وعدہ کیا گیا تھا کہ فوج اور محاصل کے سلسلے میں مناسب اصلاحات جاری کی جائیں گی۔ پھر آئندہ دس سال میں بہت سے قواعد و ضوابط نافذ ہوئے، جن کے مطابق صوبوں میں مجالس شوریٰ قائم ہوگئیں۔ مرکز کے لیے ممتاز اعیان کی ایک مجلس بن گئی۔ جگہ جگہ مخلوط عدالتیں قائم ہوگئیں۔ فنی تعلیم کے لیے ادارے کھول دیے گئے۔

روس کا دباؤ سلطنت عثمانیہ پر بڑھ رہا تھا اور اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں روس استنبول اور آبناؤں پر قابض ہو کر فرانس اور برطانیہ کے لیے خطرات کا باعث نہ بن جائے۔ اس خطرے کے انسداد کے لیے فرانس اور برطانیہ نے سلطنت عثمانیہ کی حمایت شروع کردی۔ اصلاً یہ عثمانیوں کی حمایت نہ تھی، بلکہ ان یورپی ملکوں کے سیاسی مفاد کی حفاظت کا تقاضا ہی تھا۔ اسی سلسلے میں جنگ کریمیا پیش آئی (۱۸۵۴ء - ۱۸۵۶ء)، جس میں فرانس اور برطانیہ نے روس کے خلاف سلطنت عثمانیہ کا ساتھ دیا۔

۱۸۵۶ء میں سلطان عبدالمجید نے اصلاحات کا ایک نیا فرمان جاری کیا، جو "خطِ ہمایوں" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں مسیحیوں کے جان و مال اور عزت کی حفاظت کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا۔ نیز اعلان کر دیا گیا کہ مسیحی رعایا اصولاً فوج میں بھرتی ہو سکتی ہے اور اگر ان میں سے کوئی شخص چاہے تو روپیہ دے کر فوجی خدمت سے معافی حاصل کر سکتا ہے۔ غیر ملکیوں کو خاص حالات میں سلطنت کے

اندر جائداد خریدنے کی اجازت دے دی گئی۔

سلطان عبدالمجید ہی کے عہد میں استنبول کے اندر امریکی مشنریوں نے رابرٹ کالج کی بنیاد رکھی (سنہ ۱۸۶۰ء)۔ پھر لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک درسگاہ قائم کر دی گئی، جسے سنہ ۱۸۷۱ء میں کالج کا درجہ دے دیا گیا۔ سنہ ۶۱-۱۸۶۰ء میں شام کے دروزیوں اور مارونیوں کے درمیان سخت کشمکش شروع ہوئی، جس نے خونریز جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ فرانسیسی حکومت نے مسیحیوں کے محافظ خصوصی کی حیثیت میں سلطان سے اجازت لے کر فساد زدہ علاقے میں فوج اتاری جو قیام امن کے بعد وہاں سے رخصت ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لبنان کا خطّہ، جہاں دروزی اور مارونی آباد تھے، شام سے الگ کر دیا گیا اور اس کے لیے ایک خاص نظام حکومت تجویز ہوا۔

عبدالعزیز

سلطان عبدالمجید کے انتقال پر اس کا بھائی عبدالعزیز (سنہ ۱۸۶۸ء تا سنہ ۱۸۷۶ء) تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں مزید اصلاحات ہوئیں، مثلاً سنہ ۱۸۶۹ء میں استنبول کی یونیورسٹی بنی۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں قانون کی درسگاہ قائم ہوئی۔ عثمانی سلطانی بنک کی بنیاد پڑی، لیکن اس کے عہد میں حالات یکایک بگڑ گئے۔ سبب یہ ہوا کہ سلطان کو نئے محل تعمیر کرنے کا بڑا شوق تھا اور اس نے یورپ کی سیاحت بھی کی۔ اس طرح بے اندازہ روپیہ خرچ ہوا۔ یہ خرچ سرکاری قرضے پر اثر انداز ہوا۔ سرکاری قرضے میں بیرونی سرمایہ داروں کے علاوہ ملکی امرا اور عوام نے بھی بڑی رقمیں دے رکھی تھیں۔ وہ خطرے میں پڑیں تو ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی۔ آخر اس قرضے کے انتظام کے لیے ایک خاص مجلس بنائی گئی، جس میں یورپ کے سرمایہ داروں نے حصّہ لیا۔ اس طرح عوام کا روپیہ محفوظ ہوا۔

سنہ ۱۸۶۸ء میں استنبول کو بذریعۂ ریل ہنگری کی لائنوں سے ملا دینے کا فیصلہ ہو گیا۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں اس کے لیے کام شروع ہوا۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کا افتتاح عمل میں آیا۔ سنہ ۱۸۷۴ء میں سرکاری قرضہ اتنا بڑھ گیا کہ نصف سود منسوخ کرنا پڑا۔ اس سے پھر سراسیمگی پیدا ہو گئی۔ پھر بوسینا اور ہرزیگوینا میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ سلطان عبدالعزیز کے عزل کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۷۶ء میں اسے الگ کر کے اس کے بھتیجے مراد خامس (بن عبدالمجید اوّل) کو سلطان بنایا گیا۔ اس کی دماغی حالت اچھی نہ تھی، چنانچہ چند ماہ بعد اسے بھی معزول کر دیا گیا اور اس کے بھائی عبدالحمید کو

تخت پر بٹھایا گیا، جو عبدالحمید ثانی کہلایا اور جس کے عہد میں سلطنت عثمانیہ سے اسلامی دُنیا کی عقیدت بطورِ خاص تازہ ہوئی۔

مُدحت پاشا اصلاحات کے سلسلے میں جس تُرک مدبر نے ابتداءً سب سے بڑھ کر کام کیا، وہ مدحت پاشا تھا۔ وہ ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۹ء تک بلغاریہ کے نظم و نسق کا ذمہ دار رہا۔ پھر چار پانچ سال بغداد کی حکومت اس کے حوالے رہی۔ اس نے دونوں جگہ اتنا اعلیٰ انتظام کیا کہ دُنیا بھر میں اسے شہرت حاصل ہوگئی۔ عبدالعزیز کے عہد میں اسے وزارتِ عظمیٰ کا منصب دے دیا گیا۔ اسی نے اصلاحِ احوال کے شدید تقاضوں کی بنا پر پہلے عبدالعزیز کو، پھر مراد کو حسنِ تدبیر سے علیٰحدہ کر کے سلطان عبدالحمید کو تخت پر بٹھایا تھا تاکہ پارلیمانی دستور کی بنیادیں استوار ہو جائیں۔ آٹھ نو مہینے تک تو مدحت پاشا اطمینان سے کام میں لگا رہا، پھر سلطان نے، جو مطلق العنانی کی بحالی کے لیے مضطرب تھا، مدحت پاشا کو وزارت سے الگ کر دیا۔

سلطان عبدالعزیز نے معزولی کے بعد خود کشی کر لی تھی، لیکن ایک گروہ کی رائے تھی کہ اسے قتل کرایا گیا ہے۔ سلطان عبدالحمید نے مدحت پاشا کو اس قتل کا ذمہ دار ٹھہرا کر مقدمہ چلوایا (۱۸۸۱ء) یورپی سلطنتوں نے مداخلت کی تو مدحت پاشا کو قید کر کے طائف (حجاز) بھیج دیا گیا اور وہیں ۱۸۸۴ء میں اسے مروا دیا گیا۔

سُلطان عبدالحمید سلطان عبدالحمید (۱۸۷۶ء۔ ۱۹۰۹ء) کا عہد مختلف وجوہ سے سلطنت عثمانیہ کے لیے مصیبت خیز ثابت ہُوا۔ اس میں سلطنت مزید کمزور ہوئی۔ اہلِ ملک ترقی کے ہر میدان میں پیچھے رہ گئے کیونکہ سلطان عبدالحمید کو تعلیم، روشن خیالی، عوامیت اور دستوریت کی ہر تحریک سے شدید اندیشہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ عوام کو جو بھی قدم اٹھانے کی اجازت دی جائے گی، قاہری و مطلق العنانی خطرے میں پڑ جائے گی۔ پھر اس نے مطلق العنانی سے نہ خود کوئی فائدہ اُٹھایا اور نہ قوم و مُلک کو فائدہ پہنچایا۔ پہلے عثمانی سلطان کم از کم جمعہ کی نماز ایا صوفیہ میں پڑھتے تھے اور وہاں سلاملق[۱] کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ سلطان عبدالحمید نے ابتدا ہی سے

---

[۱] اس کی تفصیل آگے چل کر ایک مستقل باب میں بیان ہوگی۔

یلدز میں سکونت اختیار کر لی تھی، جو "شاخِ زریں" کے مشرق میں واقع تھا اور استنبول کی آبادی سے باہر تھا۔ وہیں ایک مسجد جمعہ کی نماز کے لیے تعمیر کر لی گئی اور اسی مسجد میں سلاملق کی رسم ادا ہوتی رہی۔ گویا اسے عوام سے چنداں سروکار ہی نہ رہا، البتہ تماشائی ہر جمعہ کو وہاں پہنچ جاتے تھے اور دُور کھڑے ہو کر تماشا دیکھ لیتے تھے۔

سلطان کے عہد کی ایک اہم چیز حجاز ریلوے کی تعمیر تھی، جس کے ذریعے سے مدینۂ منوّرہ شام کی ریلوے لائن سے ملا دیا گیا۔ اس طرح زائروں کی آمد و رفت میں سہولت پیدا ہو گئی، نیز ان کی تعداد بڑھ گئی اور زیادہ قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ حجاز کے قلب میں اشیائے خوردنی اور دوسری ضروری چیزیں پہنچانے میں آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ مدینۂ منوّرہ سے اس لائن کو مکّہ معظّمہ اور وہاں سے جدّہ پہنچانا منظور تھا، لیکن شریفِ مکّہ نے یہ کہہ کر بدوؤں کو برانگیختہ کر دیا کہ ریل بن جانے کے بعد اونٹ بیکار ہو جائیں گے اور ان کے لیے روزی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے گا۔ اس وجہ سے سلسلۂ تعمیر آگے نہ بڑھ سکا۔

نوجوان ترکوں کی تحریک سلطان عبدالحمید ہی کے زمانے میں نوجوان ترکوں کی تحریک پیدا ہوئی، جس کا مقصد یہ تھا کہ ترکی میں دستوری نظام بحال کیا جائے۔ یہ تحریک خفیہ خفیہ فوج میں پھیلی۔ سلطان نے جاسوسوں کی اطلاعات کے مطابق ممتاز کارکنوں کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ ۵۔ جولائی ۱۹۰۸ء کو نیازی بے نے رسنا (مقدونیہ) میں انقلاب کا عَلَم بلند کر دیا۔ تین روز بعد انور بے اور بعض دوسرے افراد نیازی بے سے جا ملے۔ ۱۳ جولائی کو نوجوان ترکوں کی شہرۂ آفاق مجلس "انجمن اتحاد و ترقی" نے دستوری نظام کی تحریک اپنا لی اور جو فوجیں انقلابیوں کی گرفتاری کے لیے بھیجی گئیں، وہ خود انقلابیوں میں شامل ہو گئیں۔ سلطان نے جو خاص افسر اس کام پر مامور کیے تھے، ان میں سے بعض مارے گئے اور بعض زخمی ہو کر قسطنطنیہ پہنچ گئے۔

فوج کی بیداری نے دوسرے طبقوں میں بھی حرکت پیدا کر دی۔ آخر سلطان عبدالحمید کو مجبور ہو کر ۱۸۷۶ء کا دستوری نظام بحال کرنا پڑا اور مُلک کی عنانِ اقتدار نوجوان ترکوں کے ہاتھ آ گئی۔

۱۷۔ دسمبر ۱۹۰۸ء کو پارلیمنٹ کا اجلاس ہُوا، جس میں اکثریت نوجوان ترکوں کے حامیوں کی تھی۔

سُلطان عبدالحمید کا عزل

اگر سلطان عبدالحمید خلوص کے ساتھ دستوری نظام پر کاربند رہتا تو یقین تھا کہ حالات بہت جلد سلجھ جاتے اور معاملات روبراہ ہوجاتے، لیکن وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے خفیہ خفیہ دستوری نظام کو برباد کرنے کی تدبیریں اختیار کرلیں۔ حالات لحظہ بہ لحظہ بگڑتے گئے۔ سلطان کو یقین تھا کہ اس طرح خود ترکوں اور بیرونی دنیا پر واضح ہوجائے گا کہ صحیح نظامِ حکومت وہی تھا، جس پر سلطان بطورِ خود کاربند تھا۔ نوجوان ترکوں نے جو دستور تجویز کیا اور اسے سلطان اور نیز قوم پر ٹھونسا، وہ کسی بھی صورت میں قابلِ عمل یا ملکی نظم و نسق کے لیے موزوں نہ تھا۔ بس اسی خیال کے ماتحت سلطان انتظامات کی خرابیوں میں اضافہ کرتا رہا۔

جب حالات کی خرابی حد سے تجاوز کرگئی تو ملک و قوم کے حقیقی بہی خواہوں میں اضطراب پیدا ہُوا۔ "انجمن اتحاد و ترقی اصلاحی قدم اُٹھانے کے لیے بے تاب تھی، لیکن اسے مختلف گروہوں کے افکار و امیال کا صحیح اور قابلِ اعتماد اندازہ نہ تھا۔ اُس وقت قدرت ایک ایسی شخصیت بروئے کار لے آئی، جو ہر اعتبار سے قیادت کی اہل تھی اور اس نے جلد از جلد تمام معاملات کا فیصلہ کردیا۔

یہ غازی محمود شوکت پاشا تھے جو مقدونیہ کی فوج کے سالار تھے اور سالونیکا ان کا مرکز تھا۔ "انجمن اتحاد و ترقی" کے ممبروں نے انھیں مشورے کے لیے بُلایا تو انھوں نے بے تکلف فرمایا کہ میں دستوری نظام کی اطاعت کا حلف اٹھا چکا ہوں۔ اس پر قائم ہوں اور قائم رہوں گا۔ چنانچہ محمود شوکت نے اپنی فوج کو تیاری کا حکم دیا اور چُپ چاپ استنبول پہنچ کر ہلال کی شکل میں شہر، پیرا، غلطہ، یلدز وغیرہ کا محاصرہ کرلیا۔ پھر فوج کے دستے شہر میں داخل ہوگئے۔ سلطان بالکل بے دست و پا رہ گیا۔ مجلسِ ملّی (پارلیمنٹ) کی طرف سے آخر کار دو نمائندوں کو سلطان کے پاس بھیجا گیا، جنھوں نے معزولی کی خبر پہنچادی۔ ان میں سے ایک کا نام کراسو[۱] تھا اور دوسرے کا اسد پاشا۔

---

[۱] CARASSO یہ نمائندہ یہودی تھا۔

سُلطان اور پالیمانی نمائندے

ان نمائندوں اور سلطان کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ ذیل میں درج ہے:

سلطان: تم لوگ کیوں آئے ہو؟

اسد پاشا: جو فتویٰ شائع ہو چکا ہے، اس کے مطابق قوم نے حضور کو معزول کر دیا ہے۔ مجلس ملّیہ حضور کی اور حضور کے خاندان کی حفاظت کا ذمہ اٹھاتی ہے۔ حضور کے لیے خوف کی کوئی وجہ نہیں۔ یقین رکھیں۔

سلطان: میں مجرم نہیں..... یہ میری قسمت ہے..... یہ بتاؤ کیا میری جان محفوظ ہے؟ (کراسو آفندی نے بتایا کہ یہ سوال کرتے وقت سلطان کی آنکھوں میں آنسو تھے)

اسد پاشا: ملّتِ عثمانیہ شریف اور فراخ حوصلہ ہے۔ اس نے کبھی بے انصافی سے کام نہیں لیا۔

سُلطان: جو کچھ تم کہتے ہو اس کے لیے قسم کھاؤ۔ ممکن ہے، کل یہ اعلانات تبدیل ہو جائیں۔ قسم کھاؤ کہ جو کچھ تم کہتے ہو، اس سے نہ ہٹو گے۔

اسد پاشا: میں پھر عرض کرتا ہوں کہ ملّتِ عثمانیہ شریف ہے اور کبھی بے انصافی کی مرتکب نہیں ہوتی۔ مجلسِ ملّیہ نے حضور کی حفاظت کا ذمہ اٹھا لیا ہے، اس لیے اضطراب کی کوئی وجہ نہیں۔

سُلطان: کیا تم مجھے یہاں نہیں رہنے دو گے؟ میں چاہتا ہوں کہ قصرِ چراغاں میں مجھے رہنے دیا جائے۔ میں نے اپنے بھائی[1] کو وہیں رکھا تھا۔ صلاح الدین آفندی اور کمال الدین[2] پاشا سے وہ محل

---

[1] بھائی سے مراد سلطان مراد خامس ہے، جو عبدالعزیز کی معزولی کے بعد صرف چند مہینے سلطان رہا۔ اسے خرابی دماغ کی بنا پر سلطنت سے الگ کیا گیا تھا اور علیحدگی کے بعد بتیس سال زندہ رہا۔ یہ پورا وقت قصرِ چراغاں میں گزارا۔ سلطان عبدالحمید نے تخت نشین ہوتے وقت حلف اٹھایا تھا کہ اگر سلطان مراد کی دماغی حالت درست ہو گئی تو اس کے لیے تخت خالی کر دیا جائے گا۔ [2] سلطان عبدالحمید کا داماد۔ سلطان نے جاسوسوں کی رپورٹوں اور اپنی بیٹی کی اطلاعات پر کمال الدین پاشا کو سازشی اور دشمن قرار دیا تھا۔ سلطان کی بیٹی اس وجہ سے شوہر کے خلاف تھی کہ اس نے خفیہ خفیہ ایک اَور عورت سے تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ کمال الدین پاشا نے صلاح الدین آفندی نام ایک ڈاکٹر کو ساتھ ملا کر سلطان کی بیٹی کو زہر دینے کی کوشش کی، اس وجہ سے دونوں کو عمر قید کی سزا ملی اور انھیں قصرِ چراغاں میں رکھا گیا۔

خالی کرالیا جائے کیونکہ ہمارے قوانین، حرم کو یکبار رکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ نیز میرا کنبہ بڑا ہے، وہی اس میں بمشکل سما سکے گا۔ میں فوراً وہاں جانے کے لیے تیار ہوں۔

اسد پاشا: میں حضور کی خواہش مجلس ملیہ تک پہنچا دوں گا اور اس کا فیصلہ حضور کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ مجھے پوری امید ہے کہ حضور کی خواہش کے مطابق انتظام ہو جائے گا۔

سلطان: میں نے ترکی اور یونان کی جنگ میں کامیابی حاصل کی۔ تاریخ اس حقیقت کی گواہی دے گی کہ میں نے قومی مفاد کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ بہرحال میں مجرم نہیں۔

اسد پاشا: دستوری نظام کے ماتحت کسی شخص کو سزا نہیں دی جا سکتی، جب تک اس کے خلاف جرم ثابت نہ ہو۔ مجرمیت کا فیصلہ محتاط تفتیش کے بعد ہی ہو سکتا ہے[۱]۔

سالونیکا اور استنبول

غرض سلطان کو استنبول سے سالونیکا بھیج دیا گیا۔ جنگ بلقان میں سالونیکا کے لیے خطرہ پیدا ہوا تو اسے استنبول لے آئے اور قصر بیگلر بیگی میں رکھا۔ وہیں اس نے وفات پائی۔ عبدالحمید کی جگہ اس کے بھائی محمد رشاد خاں کو سلطان محمد خامس کے لقب سے بادشاہ بنایا گیا۔

---

[۱] THE FALL OF ABDUL HAMID BY FRANCIS MC CULLAGH

تیرھواں باب

جنگ بلقان اور جنگ یورپ

سلطان محمد خامس جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے، سلطان عبدالحمید کے بعد اس کا بھائی محمد رشاد خاں تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر کا بڑا حصہ نظر بندی میں گزر چکا تھا اور جو بھی صلاحیتیں قدرت نے اسے عطا کی تھیں، ان سے کام لینے کا موقع آیا ہی نہیں تھا۔ قصرِ سلطانی کا ماحول ایسا تھا کہ اہلِ خاندان میں سے کسی کی معمولی اور معصومانہ حرکت بھی شبہات کا موجب بن سکتی تھی۔ پھر سلطان عبدالحمید کو تو چوبیس گھنٹے یہی اندیشہ دامن گیر رہتا تھا کہ اس کے خلاف مسلسل سازشیں ہو رہی ہیں۔ ان حالات میں محمد رشاد خاں کے لیے کسی بھی نوع کی انتظامی معلومات حاصل کرنے یا ان کے عملی حسن و قبح کو سوچنے کا کیا موقع پیش آسکتا تھا۔ سلطان بننے پر اس کی حیثیت محض ایک نشان کی سی تھی اور یہ معاملہ اس لحاظ سے قومی و ملکی مصلحتوں کے لیے سازگار تھا کہ دستوری نظام کی بنیادیں بے خلش مستحکم کی جاسکتی تھیں۔

نئی پارلیمنٹ سلطان محمد رشاد خاں یعنی محمد خامس کے تخت نشین ہوتے ہی ۱۸۷۶ء کے دستوری نظام میں ترمیمیں کردی گئیں، مثلاً پہلے سلطان خود تمام وزیر نامزد کرتا تھا اور جب چاہتا، پارلیمنٹ کو توڑ سکتا تھا۔ اب فیصلہ ہوگیا کہ سلطان صرف وزیرِ اعظم کو نامزد کرسکے گا۔ باقی وزراء کی ترتیب اور مختلف پارلیمانی گروہوں سے گفت و شنید کو صرف وزیرِ اعظم پر چھوڑ دیا گیا۔ نیز پارلیمنٹ کو توڑنے کا اختیار ختم کردیا گیا۔ اس طرح وزارت پارلیمنٹ کے روبرو جواب دِہ قرار پائی۔

نئے انتخابات میں "انجمن اتحاد و ترقی" کو اکثریت حاصل ہوئی۔ عام حالات میں یقین کیا جاسکتا تھا کہ انتظامات کے تمام شعبے جلد از جلد اطمینان بخش صورت اختیار کرلیں گے، اگر یورپی طاقتوں کو سلطنت عثمانیہ کی ترقی و خوشحالی منظور رہی نہ تھی۔ کچھ فتنے خود مختلف خطہ ہائے سلطنت کی کوتاہ اندیشی سے پیدا ہوئے۔ مثلاً البانیہ کی طرف سے آزادی کا مطالبہ شروع ہوگیا۔ عربوں

میں بھی اسی قسم کی تحریک پیدا ہوئی، تاہم زیادہ بڑے فتنے سامراجی یورپی طاقتوں کی انگیخت سے پیدا ہوئے، جن کے انسداد کی کوششوں میں مصروف ہو جانے کے باعث انجمن اتحاد و ترقی کو اصلاح و فلاح کا کام جاری رکھنے کا موقع ہی نہ ملا۔

جنگِ طرابلس

۲۹- ستمبر ۱۹۱۱ء کو اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا۔ اٹلی بہ طور خود ایسا کوئی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ برطانیہ، فرانس اور روس خفیہ خفیہ اسے حمایت اور پشتیبانی کا یقین دلا چکے تھے۔ اس کا سبب بالکل واضح تھا۔ فرانس اور ہسپانیہ نے الجزائر، ٹیونس اور مراکش پر قبضہ کر لیا تھا۔ برطانیہ مصر پر قابض ہو چکا تھا۔ اٹلی بار بار اپنے حصے کا مطالبہ پیش کر رہا تھا۔ اسے طرابلس پر پیشقدمی کرنے کی شہ دے دی گئی۔ یہ طرابلس ہے جسے اٹلی کے تصرف کی ابتدا سے لیبیا کہتے ہیں اور آج بھی اس ملک کا نام یہی ہے۔

طرابلس میں ترکوں کی کوئی قابلِ ذکر فوج موجود نہ تھی۔ غازی انور، غازی مصطفیٰ کمال، غازی عصمت وغیرہ نوجوان محبانِ وطن نے بھیس بدلے اور مصر سے خفیہ خفیہ گزرتے ہوئے وہ طرابلس پہنچے، جہاں مقامی عربوں کے دستے مرتب کر کے اٹلی کا مقابلہ شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اٹلی کی فوجیں ساحل سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکیں۔ ترکوں کے پاس کوئی قابلِ ذکر بیڑا نہ تھا۔ اٹلی نے ان بارہ جزائر پر قبضہ کر لیا، جو ایشیائے کوچک کے سامنے واقع ہیں۔

جنگِ بلقان

جب یورپی طاقتوں نے دیکھا کہ اٹلی کے حصولِ مقصد میں مشکلات پیدا ہو گئی ہیں تو انھوں نے چھوٹی چھوٹی بلقانی ریاستوں ــــــ بلغاریہ، رومانیہ، سرویا، مانٹی نیگرو ــــــ کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف جنگ پر ابھار دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مجاہد نوجوان ترک طرابلس کو چھوڑ کر وطن کی حفاظت کے لیے ترکی پہنچے۔ گویا اٹلی کے لیے طرابلس میں من مانی کارروائیاں کرنے کے لیے میدان صاف ہو گیا، تاہم دس بارہ سال تک اٹلی کی فوجیں ساحل ہی پر رہیں، اندرونِ ملک میں نہ جا سکیں۔

جنگِ بلقان کی تفصیلات ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ترکوں نے حتی الامکان مدافعت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ایک موقع پر بلقانی فوجیں تشلجہ پہنچ گئی تھیں اور خود استنبول کے لیے شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا، لیکن ترکوں نے ہمت نہ ہاری اور مقابلے پر ڈٹے رہے۔ یورپی طاقتوں کی

طرف سے سازباز کا سلسلہ جاری تھا۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں البانیہ کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔ پھر بلقانی ریاستوں کے ساتھ صلح کا ایک ایسا منصوبہ تیار ہُوا، جس میں ایڈریانوپل ہمیشہ کے لیے بلغاریا کے حوالے کر دینے کی تجویز تھی۔ کامل پاشا وزیرِ اعظم تھا، جس نے برطانیہ سے خاص تعلقات پیدا کر رکھے تھے اور برطانیہ جو کچھ چاہتا، اس کے ذریعے سے پُورا کرا لیتا۔ اس موقع پر انجمن اتحاد و ترقی کی طرف سے حُبِّ وطن کا ایک اور ثبوت غازی محمود شوکت پاشا اور انور پاشا کی سرکردگی میں ظاہر ہُوا، یعنی محمود شوکت کی فوج نے ایک مظاہرہ کیا۔ انور جان ہتھیلی پر رکھ کر وزارت کے اجلاس میں پہنچا۔ ناظم پاشا وزیرِ جنگ نے مزاحمت کی اور اس کے ایڈی کانگ نے انور پر گولی چلا دی۔ انور کو قدرت نے بچا لیا۔ جوابی آتش باری میں ناظم اور اس کا ایڈی کانگ دونوں مارے گئے۔ وزارت سے استعفا لے لیا گیا۔ تمام وزیروں کو قید کر دیا گیا۔ محمود شوکت پاشا نے نئی وزارت بنائی۔ یورپی طاقتوں کی طرف سے صلح کی جو تجویز پیش ہوئی تھی، وہ ٹھکرا دی گئی۔ چند روز بعد خود بلقانی ریاستیں مالِ غنیمت کی تقسیم پر باہم لڑ پڑیں۔ انور نے اس زرّیں موقع سے فائدہ اٹھا کر ایڈریانوپل پر قبضہ کر لیا۔ مئی ۱۹۱۳ء میں جنگِ بلقان ختم ہوئی۔

طلعت اور انور

دشمنوں کو تکمیلِ مقاصد کی اور کوئی تدبیر نظر نہ آئی تو نوجوان ترکوں کے اکابر پر قاتلانہ حملے شروع کر دیے۔ چنانچہ غازی نیازی بے وطن میں شہید کر دیے گئے۔ غازی محمود شوکت پاشا وزیرِ اعظم و وزیرِ جنگ کو جون ۱۹۱۳ء میں جامِ شہادت پلایا گیا۔ اس کے بعد طلعت پاشا وزیرِ اعظم اور انور پاشا وزیرِ جنگ ہوئے۔

اب کسی قدر اطمینان نصیب ہُوا تو ترک اپنی فوجی قوّت کی درستی میں مصروف ہو گئے۔ جرمنی سے لیمان فان سانڈرس کی خدمات مستعار لی گئیں، جو عسکریات کا مشہور ماہر تھا۔ یورپی طاقتوں کے عناد کا یہ عالم تھا کہ انھیں ہر وہ تدبیر ناخوشگوار معلوم ہوتی تھی، جس سے ترکوں کو فائدہ پہنچ سکتا تھا یا ان کی حالت بہتر ہو سکتی تھی۔ چنانچہ روس نے سب سے پہلے فان سانڈرس کے تقرّر پر اعتراض کیا۔ پھر یہ مطالبہ کیا کہ کم از کم اسے استنبول میں نہ رکھا جائے۔ فرانس نے جوش و خروش سے روس کی حمایت کی۔ جرمنی نے خود دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے کہہ دیا کہ فان سانڈرس کو استنبول کی جگہ کسی دوسرے مقام پر متعیّن کر دیا جائے۔

جنگِ یورپ

یہ حالات تھے، جب ولیعہد آسٹریا سراجیوو میں مارا گیا اور اس وجہ سے یورپی طاقتوں میں کشمکش شروع ہوگئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۴ ۔ اگست کو جنگِ یورپ کا آغاز ہوا، جسے بالعموم "پہلی عالمی جنگ" کہا جاتا ہے۔ برطانیہ، فرانس، روس اور سرویا ایک فریق تھے، جرمنی اور آسٹریا دوسرا فریق۔

ترک اور جنگ

یورپی طاقتوں کا دستور یہ چلا آتا تھا کہ کہیں لڑائی ہوتی، صلح کے سلسلے میں ترکی سلطنت کا کوئی نہ کوئی حصہ ہتھیا لینے کی ضرور کوشش کرتیں۔ ان حالات میں ترکوں کے لیے ان طاقتوں پر خصوصاً روس پر اعتماد ممکن نہ تھا، جو بارہا انھیں نقصان پہنچا چکی تھیں، جب حالات بہت بگڑ گئے تو ترکوں نے جرمنی کے ساتھ معاہدۂ اتحاد کر لیا کیونکہ روس کے مقابلے میں جرمنی ہی سے ہر ممکن امداد مل سکتی تھی۔ برطانیہ اور فرانس سے جو روس کے حلیف تھے، کوئی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ جنگ شروع ہوئی تو ترکوں کے لیے بھی اپنے حلیف کی امداد ضروری ہوگئی۔ اگرچہ وہ اس پر مجبور نہ تھے، لیکن حالات نے یکایک ایسی صورت اختیار کر لی کہ انھیں شرکتِ جنگ کے سوا چارہ نہ رہا۔

جنگی جہازوں کا معاملہ

جنگ کے اسباب فراہم ہونے سے بہت پہلے ترکوں نے برطانیہ کو دو جنگی جہاز تیار کر دینے کے لیے کہا تھا اور یہ جہاز تیار ہو رہے تھے۔ جوا گی کا وقت قریب آیا تو جنگ کی گھٹائیں فضا میں منڈلانے لگیں۔ حکومتِ برطانیہ نے دونوں جہاز اس عذر کی بنا پر روک لیے کہ خود ہمارے ملک کو ان کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ اصل غرض یہ تھی کہ جہاز ترکی کے پاس نہ جائیں تاکہ بحری قوت کی کمی اسے بے دست و پا رکھے۔ برطانیہ کی طرف سے جہازوں کی بہم رسانی میں انکار ہوا تو حکومتِ ترکیہ نے جرمنی سے دو جنگی جہاز خرید لیے۔ گویا وہ اپنے حلیف سے اور بھی قریب ہو گئے۔ روس اپنے مقاصد کے لیے آبناؤں کو استعمال کرنے پر تیار تھا۔ ترکوں نے مزاحمت کی کیونکہ ایک محارب فریق کی طرف سے آبناؤں کا استعمال ترکوں کی غیر جانبداری کے منافی تھا۔ اس پر روس سے کشمکش ہوئی۔ حکومتِ روس نے ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ چند روز بعد برطانیہ اور فرانس نے بھی اپنے حلیف کی حمایت میں حکومتِ ترکیہ کو دشمن قرار دے دیا۔

قفقاز اور گیلی پولی

روس کو جرمنی سے سخت جنگ درپیش تھی۔ ترکوں نے قفقاز میں روس کے خلاف پیش قدمی شروع کر دی۔ روس نے برطانیہ اور فرانس سے

مطالبہ کیا کہ محاذِ قفقاز پر دباؤ کم کرنے کے لیے ترکوں کے خلاف کوئی زبردست کارروائی ہونی چاہیے۔ چنانچہ برطانیہ اور فرانس نے گیلی پولی میں فوجیں اُتارنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۹۔ فروری ۱۹۱۵ء کو بحری حملے کا آغاز ہو گیا۔ اٹھارہ جہازوں کے بیڑے نے آبناؤں سے گزرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے چار چند لمحوں میں تباہ ہو گئے۔ آخر خشکی پر فوج اُتاری گئی۔ لیمان فان ساندرس اس محاذ پر ترکی کا کمانڈر اعظم تھا۔ غازی مصطفیٰ کمال اس کے ساتھ متعین تھے۔ انھوں نے دفاع کا ایسا انتظام کیا کہ برطانیہ اور فرانس کی فوجیں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکیں۔ ساتھ ہی آبدوزوں کے حملے شروع ہو گئے اور برطانیہ کے تین بڑے جنگی جہاز ڈبو دیے گئے۔ گیلی پولی کی جنگ ایک سال دس مہینے جاری رہی۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں برطانیہ اور فرانس نے گیلی پولی کی مہم سے دست برداری اختیار کر لی اور فوجیں وہاں سے نکال لیں۔

متارکۂ جنگ

ترکوں نے نہر سویز پر دو مرتبہ حملے کیے، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۹۱۶ء میں برطانیہ نے ایک طرف شریفِ مکہ کو بغاوت پر آمادہ کر دیا، دوسری طرف عراق میں فوجیں اُتار دیں، جہاں پہلی مرتبہ انگریزوں نے شکست کھائی اور جنرل ٹاؤنشینڈ گرفتار ہو گیا۔ پھر فلسطین اور شام میں پیشقدمی کا آغاز ہوا۔ جولائی ۱۹۱۸ء میں سلطان محمد خامس نے وفات پائی اور اس کا بھائی وحید الدین محمد سادس کے لقب سے بادشاہ بنا۔ ۱۳۔ اکتوبر کو محمد سادس نے طلعت پاشا کی وزارت برطرف کر دی۔ طلعت اور انور جرمنی چلے گئے۔ عزت پاشا وزیر اعظم بنا۔ اس نے جمہوریۂ امریکہ کے صدر مسٹر ولسن کے سامنے متارکۂ جنگ کی درخواست پیش کر دی۔ ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو مدروس میں عہد نامہ التوائے جنگ پر دستخط ہو گئے۔ اتحادیوں کے جتنے قیدی ترکوں کے پاس تھے، رہا کر دیے گئے اور ترک علاقے میں اتحادیوں کو ضروری فوجی کارروائیوں کی اجازت دے دی گئی۔ ۱۱۔ نومبر ۱۹۱۸ء کو جرمنی نے ہتھیار ڈال دیے۔ ۱۳۔ نومبر کو اتحادی بیڑا دردانیال سے گزرتا ہوا استنبول پہنچ گیا۔ ۲۹۔ مئی ۱۴۵۳ء کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اجنبی قوتوں کا بیڑا مقامِ خلافت کی مقدس گودیوں میں لنگر انداز ہوا۔

اتحادیوں کے اضطرابی معاہدے

برطانیہ، فرانس اور روس نے تشویشناک حالات میں عجیب و غریب اور متضاد معاہدے کر لیے تھے۔ مثلاً پہلے یہ فیصلہ کیا کہ روس کو استنبول اور آبنائیں دے دی جائیں گی۔ ۱۹۱۷ء میں زار روس کا تختہ اُلٹا اور بالشویک برسرِ اقتدار

آگئے تو انھوں نے یہ خفیہ معاہدہ شائع کر دیا۔ اس اثناء میں برطانیہ اور فرانس نے عربی ممالک کی تقسیم کے لیے ایک خفیہ معاہدہ کر لیا، جو شریف حسین کے ساتھ برطانیہ کے معاہدے سے متصادم تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ دورانِ جنگ میں حالات سخت خطرناک تھے اور جو قول و قرار وقتی طور پر مفید نظر آتے تھے، ان پر دستخط کر دینے میں قطعاً تامّل نہیں کیا جاتا تھا۔ جنگ کے بعد یہ تمام چیزیں بلائے جان بن گئیں، لیکن جس طرح قول و قرار بے پس و پیش کر لیے گئے تھے، اسی طرح انھیں توڑنے میں بھی اتحادی طاقتوں کو بالکل تامّل نہ ہُوا۔ اٹلی اور یونان کو اناطولیہ میں مختلف علاقے دے دیے گئے اور مئی ۱۹۱۹ء میں یونانی فوجیں اتحادیوں کی امداد سے سمرنا میں داخل ہو گئیں۔

مصطفیٰ کمال پاشا

حالات بہت پریشان کُن تھے۔ امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ اس حالت میں مصطفیٰ کمال استنبول سے نکل کر اناطولیہ پہنچا۔ سیواس کے قومی اجتماع میں دفاعِ وطن کا فیصلہ کر لیا گیا اور مصطفیٰ کمال کی سرکردگی میں قومی لشکر فراہم ہونے لگے۔ سلطان محمّد سادس کی حکومت نے مصطفیٰ کمال کو باغی قرار دے دیا اور اعلان کر دیا کہ جسے بھی موقع ملے، اسے گولی مار دے۔ کوئی باز پُرس نہ ہو گی۔ ۱۹۲۰ء میں معاہدۂ سیورے مرتب ہُوا تو اس میں ترکوں کی قومی آزادی ختم کر دی گئی تھی۔ سلطان کی حکومت نے اسے قبول کر لیا، مگر مصطفیٰ کمال کی سرکردگی میں جو قومی حکومت بمقام انقرہ قائم ہو چکی تھی، اس نے معاہدۂ سیورے کو ٹھکرا دیا۔

اٹلی اور فرانس نے قومی حکومت سے مصالحت کر لی۔ یونان کو ذلّت آمیز شکستیں دے کر اناطولیہ سے نکال دیا گیا۔ پھر قومی فوجوں نے استنبول پر پیشقدمی شروع کر دی۔ برطانیہ کے وزیرِ اعظم لائڈ جارج نے لڑائی کا سروسامان کیا۔ قوم نے ساتھ نہ دیا تو وہ مستعفی ہو گیا۔ سلطان محمّد سادس استنبول چھوڑ گیا۔ گویا قومی مجاہدوں کی قربانیوں سے اس قابلِ احترام مقام کو آزادی ملی۔ لوزان میں آخری معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے سلطنت ختم کر دی۔ سلطان عبدالعزیز کے فرزند عبدالمجید ثانی کو خلیفہ بنا دیا گیا (۱۸۔ نومبر ۱۹۲۲ء) جمہوریۂ ترکیہ کا صدر مقام انقرہ قرار پایا۔ خلافت کا مقام بدستور استنبول رہا۔ ۳۔ مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت بھی ختم کر دی گئی اور خلیفہ عبدالمجید ثانی، نیز عثمانی خاندان کے دوسرے افراد ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ اس طرح استنبول کی عظیم القدر مرکزیت ختم ہو گئی اگرچہ اس کے شاندار ماضی کی درخشانیاں اس وقت تک یقیناً قائم رہیں گی، جب تک یہ دُنیا قائم ہے۔

تیسرا حصّہ

از مولف

(استنبول کے مناظر اور گرد و پیش)

پہلا باب

شہر کا عام منظر

یگانہ محلِ وقوع استنبول کا محلِ وقوع مختلف اعتبارات سے یگانہ ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ دُنیا کا کوئی دُوسرا شہر پیش نہیں کیا جاسکتا، جو دو برِاعظموں کے ساحلوں پر چھایا ہُوا ہو اور ایک تنگ آبنائے ان ساحلوں کو جُدا کرتی ہو۔ دوم کوئی اور شہر بھی پیش نہیں کیا جاسکتا، جو بحیرہ مرمرا جیسے سمندر پر واقع ہو، جسے بڑی حد تک زمین بند کہنا مناسب ہوگا کیونکہ اسے ایشیا اور یورپ کے ساحلوں نے اس طرح محدُود کر رکھا ہے کہ شرق و غرب میں دو تنگ آبناؤں کے سوا اس کا کوئی مدخل و مخرج نہیں۔ یہ سمندر عموماً ساکن رہتا ہے۔ اس میں بڑے سمندروں کی طرح پُرجوش لہریں نہیں اُٹھتیں، گویا قدرتی نیلے پانی کے تمام فائدے استنبول کو حاصل ہیں اور کسی نقصان و مضرت کا اندیشہ نہیں۔ پھر اس سمندر میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بہت سے جزیرے موجود ہیں، جن کی حیثیت سر سبز پہاڑیوں کی ہے۔ ان پر خوب صورت عمارتوں اور آبادیوں نے حسنِ منظر کو چار چاند لگا رکھے ہیں۔ دردانیال سے گزرتے ہوئے استنبول کی طرف جائیں تو پہلے مرمرا اور چند چھوٹے چھوٹے جزیرے آتے ہیں۔ مزید آگے بڑھیں تو دائیں جانب مرمرا کی ایک شاخ زمین کے اندر کی طرف مُڑ گئی ہے۔ یہ خلیج اسمد ہے۔ وہاں سے ایشیائی ساحل ہلالی شکل میں آبنائے باسفورس کے دہانے تک چلا گیا ہے۔ دہانے سے قریب زمانۂ قدیم میں یہاں ایک شہر کیلسیڈون آباد تھا، جس کی جگہ آج کل "قاضی کوئی" کی آبادی ہے۔ اس سے آگے حیدر پاشا اور سقوطری ہیں۔ سقوطری کو ترک اسکدار کہتے ہیں۔ یہیں ایک بہت بڑا اسلامی قبرستان ہے۔ حیدر پاشا اناطولیہ کی ریلوے لائن کا آخری سٹیشن ہے۔

پیرا اور غلطہ یورپی ساحل کی طرف آئیں تو باسفورس کے دہانے پر خشکی کے دو گوشے ذرا آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ انھیں باسفورس ہی کی ایک شاخ جُدا کرتی ہے۔ یہ شاخ زیادہ چوڑی نہیں اور چار پانچ میل اندر کی طرف چلی گئی ہے۔ اسی کا نام "شاخِ زرّیں" ہے۔

اس کے انتہائی گوشے پر شمالی جانب سے دو دریا گرتے ہیں۔ ان میں سے مشرقی جانب کے گوشے یا بہ اعتبارِ شکل جزیرہ نما کا عام نام پیرا[1] ہے۔ سمندر کے ساحل سے یہ خطہ تدریجاً اوپر اُٹھتا جاتا ہے۔ اس کے نشیبی حصے کا نام غلطہ ہے، یہاں کسی زمانے میں وینس اور جنوآ والوں نے تجارتی منڈی قائم کر لی تھی۔ آج کل اس حصے میں بڑی رونق ہے۔ دولمہ باغچہ، بشکطاش، قصرِ چراغاں، یلدز کوشک، جامع حمیدیہ، تقسیم میدان[2]، استقلال قدسیی وغیرہ مشہور عمارتیں یہیں واقع ہیں۔ امراء اور یورپی سفیروں نے بھی سُلطانی زمانے میں یہاں مرکز بنا لیے تھے۔

استنبول شاخِ زرّیں کی مغربی جانب کے خشک خطے پر استنبول واقع ہے۔ اس کے جنوب میں بحیرۂ مرمرا، مشرق، شمال اور شمال مغرب میں "شاخِ زرّیں" ہے۔ یہ خطہ بلحاظِ شکل مثلث ہے، جس کا قاعدہ خشکی کی جانب ہے۔ زمانۂ قدیم میں اس طرف دُہری فصیل بنی ہوئی تھی اور حفاظت کی غرض سے "شاخِ زرّیں" نیز مرمرا کے ساتھ ساتھ بھی فصیل بنا دی گئی تھی، جس میں دروازوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہی۔ بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت میں انتیس دروازے تھے۔ حاجی خلیفہ کاتب چلپی نے جہاں نما کے نقشے میں جن دروازوں کا ذکر کیا ہے، ان کی تعداد انتیس سے زیادہ ہے۔

بہرحال اس شہر کا محلِ وقوع قطعی طور پر یگانہ ہے۔ زمانۂ قدیم میں اس محلِ وقوع نے شہر کو استحکام کا خاص درجہ عطا کر دیا تھا، اگرچہ اس پر بار بار حملے ہوئے، بار بار اس کے محاصرے کیے گئے اور یہ مسخر بھی ہوتا رہا۔ آج کل استحکام سے قطع نظر ماحول کی اتنی خوبیاں دُنیا کے کسی دوسرے شہر کے حصے میں نہ آئی ہوں گی۔

حُسنِ منظر مختلف سیاحوں نے اس کے منظر کی مدح و ستائش کی ہے، مثلاً آئرلینڈ کا ایک شاعر آبرے ڈی ویرے[3] کہتا ہے:

---

[1] PERA [2] سلطان محمود اول نے ۱۷۳۲ء میں باغچہ کوئی کے قریب، جو بیرک درہ (آبنائے باسفورس) کے پیچھے بنا ہوا ایک مشہور مقام ہے۔ ایک راہ آب تعمیر کرائی تھی، جس کے ذریعے سے خاصا پانی آتا تھا۔ پیرا، غلطہ اور بشکطاش کو پانی بہم پہنچانے کے بعد یہاں سے اس راہ آب کا پانی شہر میں تقسیم ہوتا تھا۔ اس وجہ سے اس مقام کا نام "تقسیم" پڑ گیا۔ اب یہاں کے چوک کو تقسیم میدان کہتے ہیں۔ [3] AUBREY DE VERE

"سمندر کی طرف سے استنبول کا نظارہ ان تمام مناظر سے بدرجہا زیادہ شاندار ہے، جو بڑے بڑے مراکزِ حکومت انسانی آنکھ کے لیے پیش کرتے ہیں۵۰"

مسز میکس ملر

مسز میکس ملر نے ۱۸۹۷ء میں اپنے فاضل شوہر کے ساتھ استنبول کی سیر کی تھی۔ وہ بحیرۂ مرمرا کی طرف سے وہاں پہنچے تھے۔ منظر کی دلآویزی کا ذکر کرتے ہوئے مسز میکس ملر لکھتی ہے:

"ہم پہلے پہل شہر کے قریب پہنچے تو محسوس ہوا کہ ناخوشگوار موسم میں بھی منظر حد درجہ خوب صورت تھا۔ جتنے مقامات اب تک ہم نے دیکھے ہیں، یہ ان سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ پھر خوش نصیبی سے ہمیں یہ منظر مختلف اوقات میں دیکھنے کا موقع ملا ___ دوپہر کی تیز روشنی میں، بعد دوپہر کی ہلکی روشنی میں، غروب آفتاب کی شفق میں، رات کی تاریکی میں جب مکانوں سے ہزاروں روشنیاں جلوہ افشاں ہوتی ہیں ___ اور سب سے بڑھ کر مسحور کن منظر وہ تھا، جو چاندنی میں دیکھا، جب ہر عمارت صاف صاف الگ الگ نظر آتی تھی۔ ہر روشنی میں اور رات دن کے ہر موقع پر بحیرۂ مرمرا سے قسطنطنیہ کا منظر بہ اعتبار دلآویزی بالکل یگانہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے سبک نقوش، ان کے گوناگوں رنگ اور شاندار عمارتیں مل کر ایسا منظر پیش کرتی ہیں، جس میں سٹاک ہولم، وینس اور خلیج نیپلز کے تمام محاسن بیک وقت جمع ہو جاتے ہیں۵۱"

ٹامس ایلم

ٹامس ایلم رقم طراز ہے:

"بحیرۂ مرمرا کی طرف سے اس شاندار شہر کی طرف آئیں تو منظر کا حسن دُنیا کے تمام شہروں سے بڑھا ہوا ہے۔ ناظر کے سامنے رومانی جذبوں کا جھنڈ نظر آتا ہے"

---

۵۰ LETTERS FROM ص ۴۵ YOUR HOLIDAY IN TURKEY ۵۱

CONSTANTINOPLE ص ۴-۵

جو صنوبر، شاہ بلوط اور دوسرے سدا بہار درختوں سے ڈھنپے ہوئے ہیں اور ان کی چوٹیوں پر یونانی کلیسا کی کوئی نہ کوئی خانقاہ نظر آتی ہے۔ یہ خوب صورت جزیرے سمندر کی سطح پر تیرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ سمندر عموماً اس قدر ساکن رہتا ہے کہ اس پر لہر کا ہلکا سا ابھار بھی دکھائی نہیں دیتا۔ پھر حد درجہ صاف اور شفاف پانی میں ان کا عکس بے حد دلآویز ہوتا ہے[1]۔"

ایڈون ہاڈر

ایڈون ہاڈر[2] نے اپنی کتاب "بلادِ عالم"[3] میں استنبول کے متعلق لکھا ہے:

"بحیرۂ مرمرا سے قسطنطنیہ کے قریب پہنچتے ہی جو مناظر رونما ہوتے ہیں، انھیں معرضِ بیان میں نہیں لایا جا سکتا، اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ ہر سیّاح نے اپنے اپنے تجربات مرتّب کیے ہیں اور تبیین و تفصیل سے ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش کی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ منظر نہایت عجیب و غریب ہے، درختوں کے بہت وسیع جھنڈ سے حسین و جمیل اور مخروطی مینار اوپر اٹھے ہوئے ہیں، نادرِ روزگار مسجدیں، عالیشان سرکاری عمارتیں، بدمعول اور برجوں والی دیواریں، قطار در قطار نظر آتی ہیں اور ان کے درمیان سرو سر اٹھائے کھڑے ہیں تو اس طرح حقیقت حال واضح نہیں ہو سکتی۔ ہمارا خیال ہے کہ جو تصویریں ہم شائع کر رہے ہیں، وہ اس نادر شہر کی عمومی کیفیت خوانندۂ کتاب پر واضح کر سکیں گی۔ ساتھ ہی یہ التجا ضروری ہے کہ یاد رکھنا چاہیے، عمارتیں سفید بھی ہیں، خاکی بھی اور زرد بھی۔ مسجدیں اور کوشک پچّی کاری کے کمالات سے مزیّن و منوّر ہیں۔ مسجدوں کے مجلّا گنبدوں کی جگمگاہٹ آنکھوں میں ایک چوندھ پیدا کرتی ہے۔ بیچ بیچ میں متین و پُر وقار سرو بالکل متفاوت منظر پیش کرتے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر اور سب پر برتر یہ کہ مطلع صاف دھوپ خاصی تیز ہے اور یہ پوری تصویر نیلگوں پانیوں کے چوکھٹے میں جڑی ہوئی ہے[3]۔"

---

[1] CONSTANTINOPLE ٹامس ایلم کی کتاب ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

[2] EDWIN HORDER [3] CITIES OF THE WORLD اس کتاب میں قسطنطنیہ یا استنبول کی بہت تصویریں ہیں جو سب قابلِ دید ہیں، لیکن ٹامس ایلم کی تصویروں کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔

والٹر واٹسن

والٹر واٹسن کی کتاب ۱۸۵۴ء میں شائع ہوئی[1] تھی۔ اس نے قسطنطنیہ یا استنبول سے رخصت ہوتے وقت مناظر کے باب میں اپنے تاثرات پیش کیے۔ وہ لکھتا ہے کہ روسی قسطنطنیہ کو "شہر قیاصرہ"[2] (زار وگراڈ) کہتے ہیں۔ وہاں خاصی مدت گزار چکنے کے بعد عین روانگی کے وقت مناظر کا بیان شروع کرنا تعجب انگیز معلوم ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو سیاح روا روی میں گزرے تو یہاں کے گوناگوں مناظر دل پر ایک کیفیتِ استعجاب پیدا کر دیتے ہیں اور سیاح انھیں اپنے سیاحت نامے کا موضوع بنا لیتا ہے لیکن کچھ مدت قسطنطنیہ میں گزار چکنے کے بعد ندرت کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور تمام چیزیں ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا کسی تھیٹر میں آرائش کر لی گئی ہو۔ میں خوانندۂ کتاب سے گزارش کروں گا کہ وہ میرے ساتھ جہاز پر سوار ہو جائے اور تصور کر لے کہ جہاز آہستہ آہستہ شاخ زریں سے حرکت کر رہا ہے۔ جون کی بیسویں تاریخ اور آٹھ بجے شام کا وقت ہے:

> مجھے اجازت دیجیے کہ گرد و پیش کے جن مناظر کو ہم پیچھے چھوڑ رہے ہیں، ان کے متعلق اپنے بیان کو ذرا طول دوں۔ بازار، گلیاں اور ان کے مختلف اللسان باشندوں کا نظارہ کتنا ہی عام ہو، لیکن باسفورس اور شاخ زریں آئینہ عکس نما کی طرح ہر موڑ پہ حسن و جمال کے نئے مرقعے پیش کرتی ہیں اور ناظر انھیں دیکھتے ہوئے کبھی نہیں تھکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسلسل مرقعے کے اس سحر انگیز سلسلے کی قدر شناسی کا کوئی بھی جوہر اس میں موجود نہ ہو۔ بلکہ ماحول سے دیرینہ تعارف اس کے حسن و خوبی کی اندازہ شناسی کا احساس بڑھا دیتا ہے۔ یہ یہاں کی مستقل اور پائدار خصوصیت ہے۔ کسی فنی کارنامے کو بار بار دیکھا جائے تو اس کی خامیاں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ لیکن تخلیق کے عجائبات میں نئے حسن و جمال کے چہرے سے نقاب اٹھتے ہیں۔[3]

---

[1] HOMEWARD FROM CONSTANTINOPLE BY WALTER WATSON

[2] THE CITY OF CAESARS (TZAROGRAD) واضح رہے کہ زار روس میں قیصر کا تلفظ اور گراد شہر کی علامت ہے جیسے ہماری زبان میں گڑھ قلعے کی علامت اور آباد یا نگر (احمد آباد، مظفر نگر) شہر یا بستی کی۔

[3] واٹسن کی کتاب ص ۲-۴

ایڈورڈ مٹ خورڈ

ایڈورڈ مٹ خورڈ ستمبر ۱۸۳۹ء میں قسطنطنیہ سے گزرا تھا[۱]۔ وہ رقمطراز ہے کہ خشکی کی طرف سے یہاں آئیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تصویر کا اُلٹا حصہ سامنے آگیا۔ اصل شاندار تصویر سمندر کی طرف سے نظر آتی ہے اور کشتی میں سوار ہو کر آبنائے سے گزریں تو اس کا اعلیٰ ترین حسن مسحور نگاہوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے:

اس میں عظمت و شان موجود نہیں۔ دوسری سرزمینوں میں زیادہ عظیم الشان مناظر موجود ہیں۔ اس میں رفعت و برتری بھی نہیں، لیکن یہ کسی ایسے نظارے کا تصور بھی نہیں جس میں حسن و جمال کے اتنے عناصر موجود ہوں، جتنے آبنائے باسفورس میں ہیں۔ یہ حسین ہیں! حسن میں اس کا پایہ سب سے اونچا ہے۔ بحیرۂ اسود سے بحیرۂ مرمرا تک آبنائے کی لمبائی تقریباً پچیس میل ہوگی۔ آبنائے کے دونوں جانب حد درجہ دل آویز مناظر ہوتے جاتے ہیں۔ پہاڑیاں درختوں سے لدی ہوئی ہیں، وادیاں نیچے اُترتی اُترتی لبِ آب تک پہنچ گئی ہیں۔ جہاں نہایت خوبصورت قصروں اور عمارتوں کے ایک عجیب و غریب رو کار دھندلے آئینے (آبنائے کا پانی) میں منعکس ہوتے ہیں۔ کوشک اور مینار درختوں کے بیچ میں سے اوپر اُٹھ رہے ہیں۔ دیہات اور مکان پہاڑیوں کی ڈھال پر معلق معلوم ہوتے ہیں۔ آبنائے کے جنوبی اختتام پر پہنچیں تو سمندر کے سینے پر گنبد کے بعد گنبد شاہانہ شکوہ بکھیرتا ہوا نظر آتا ہے۔ سرائے قدیم کے دلکشا خطّے پر نظر ڈالو، جہاں نہایت خوبصورتی کے ساتھ بڑے بڑے مینار آسمان بوس ہیں، بیچ میں قبرستانوں کے سروِ سیاہ تکونوں کی شکل میں نمایاں ہیں اور ان کے سایوں کی تاریکی منظر کی چمک دمک میں اعتدال پیدا کر رہی ہے[۲]۔

---

[۱] A LAND MARCH FROM ENGLAND TO CEYLON BY EDWARD LEDWICH MITFORD

[۲] مٹ فورڈ کی کتاب جلد اوّل ص ۶۲

مولانا شبلی

مولانا شبلی فرماتے ہیں:
"کہتے ہیں کہ دُنیا کا کوئی شہر قسطنطنیہ کی برابر خوش منظر نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ منظر کے لحاظ سے اس سے زیادہ خوش نما ہونا خیال میں بھی نہیں آتا... کہیں کہیں عین دریا کے کنارے عمارتوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا ہے۔ عمارتوں کے آگے جو زمین ہے، وہ نہایت ہموار اور صاف ہے۔ اس کی سطح سمندر کی سطح کے بالکل برابر ہے اور وہاں عجیب خوش نما منظر پیدا ہو گیا ہے۔"[۱]

استنبول کی سات پہاڑیاں

رومہ کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی آبادی سات پہاڑیوں پر محیط تھی۔ چونکہ استنبول کا نام قسطنطین اعظم نے نیا رومہ رکھا تھا، اس لیے یہاں کی آبادی کے معاملے میں بھی مختلف لوگوں نے سات پہاڑیاں پُوری کر دینے کی کوشش کی، مثلاً ایڈون ہاڈر نے سات پہاڑیوں کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

۱ - پہلی پہاڑی، جس پر قدیم شاہی قصر یعنی سرائے قدیم، ایا صوفیہ، جامع سلطان احمد، ہپوڈروم یا اَت میدان وغیرہ مشتمل ہیں۔

۲ - دوسری پہاڑی، جس کی ممتاز ترین عمارت جامع عثمانیہ یا نُورِ عثمان ہے۔ اس سے آگے بازار جامع بایزید سے جامع سلطانہ والدہ تک چلے گئے ہیں۔

۳ - تیسری پہاڑی، جس پر جامع سلیمان واقع ہے۔ قریب ہی سرعسکرت کا عالی شان بُرج ہے، جو وزارت حربیہ کے صحن میں واقع ہے۔ یہاں کسی زمانے میں قسطنطینِ اعظم کا محل تھا۔

۴ - چوتھی پہاڑی پر جامع سلطان فاتح واقع ہے۔

۵ - پانچویں پہاڑی جامع سلطان سلیم سے مزیّن ہے۔

۶ - چھٹی پہاڑی پر پہنچیں تو سامنے یہودیوں کی آبادی نظر آتی ہے اور استنبول میں اُس وقت کم و بیش ساٹھ ہزار یہودی آباد تھے۔ قریب ہی سے بلاشرن[۲] کے حواشی شروع ہو جاتے ہیں۔ اس حصے میں آخری مسیحی شہنشاہوں کا محل تھا اور اسی کے آس پاس جسٹینین کے مشہور سلاسہ

---

[۱] سفرنامہ روم و شام و مصر ص ۳۰ [۲] BLACHERNE یہی آخری مسیحی شہنشاہوں کا محل تھا۔

بیلی ساریوس کا محل نما مکان تھا، لیکن مدت ہوئی ان میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

۷۔ ساتویں پہاڑی سب سے زیادہ سربلند تھی۔ یہاں کسی زمانے میں شہنشاہی یادگاریں تھیں، جو ۱۶۹۵ء کے زلزلے میں تباہ ہوگئیں۔[۱]

عام کیفیت

آج کل شہر کی آبادی پندرہ لاکھ بتائی جاتی ہے اور یہ بہت پھیل گیا ہے۔ ابتدائی شہنشاہوں کے زمانے میں کسی شخص نے لکھا تھا کہ کالجوں اور تھیٹروں کے علاوہ شہر میں آٹھ حمام ایسے تھے، جن میں عام لوگ جا کر نہاتے تھے۔ نجی حماموں کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ واضح رہے کہ ان حماموں کو واقعی اعلیٰ درجے کے حمام سمجھنا چاہیے۔ عام غسل خانے ان سے بالکل مختلف حیثیت رکھتے ہیں، جو تقریباً ہر گھر میں موجود ہوتے ہیں۔ پانی کے پانچ بڑے ذخیرے تھے۔ آٹھ چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں، جن کے ذریعے سے پانی شہر میں آتا تھا۔ چودہ عالی شان عبادت گاہیں تھیں۔ چودہ شاہی محل تھے اور چار ہزار تین سو اٹھاسی محل نما عمارتیں تھیں۔ عام مکانوں اور عمارتوں کا شمار نہیں بتایا گیا۔

ابن بطوطہ

مشہور سیاح ابن بطوطہ نے ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) میں یہ شہر دیکھا تھا، جب یہاں مسیحیوں کی حکومت تھی۔ مولانا شبلی مرحوم ابن بطوطہ کا بیان مندرجۂ ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> "یہ نہایت عظیم الشان شہر ہے اور ایک نہر کے حائل ہونے کی وجہ سے دو حصوں میں منقسم ہوگیا ہے۔ ایک حصہ، جو نہر کے غربی کنارے پر ہے، استنبول کہلاتا ہے اور قیصرِ روم اور ارکانِ دولت و امراء اسی حصے میں رہتے ہیں۔ دوسرا حصہ غلطہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں عموماً یورپ کے بڑے بڑے تاجر رہتے ہیں، جن کو قیصر بزور اپنی اطاعت میں رکھتا ہے۔ ابن بطوطہ نے ان سوداگروں کی وسعتِ تجارت کی تعریف اور ان کے نچلے پن کی ہجو کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب میں اس شہر میں داخل ہوا تو چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے

---

[۱] کتاب "بلادِ عالم انگریزی" ص ۳۲۳-۳۲۵

علاوہ قریباً سو بڑے جہاز موجود تھے، لیکن تمام بازار نہایت نجس اور کثیف ہیں اور گرجے تک اس سے مستثنیٰ نہیں۔[۵۱]

مولانا شبلی نے ۱۸۹۲ء میں استنبول کا سفر کیا تھا، جب سلطان عبدالحمید ثانی سلطنت عثمانیہ کے فرمانروا تھے۔ مولانا شہر کی وسعت اور تمدّن کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خاص استنبول میں پانسو جامع مسجدیں، ایک سو اکہتّر حمام، تین سو چھبیس سرائیں، ایک سو چونسٹھ مدارسِ قدیم، پانسو مدارسِ جدید، بارہ کالج، پینتالیس کتب خانے، تین سو پانچ خانقاہیں اور اڑتالیس چھاپے خانے ہیں۔ کاروبار اور کثرتِ آمد و رفت کی یہ کیفیت ہے کہ متعدّد ٹرمیوے گاڑیاں، بارہ دخانی جہاز، زمین کے اندر کی ریل اور معمولی ریلیں ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ ریلیں اگرچہ ہر آدھ گھنٹے کے بعد چھوٹتی ہیں، تاہم سڑکوں پر پیادہ چلنے والوں کا اس قدر ہجوم رہتا ہے کہ ہر وقت میلا سا معلوم ہوتا ہے۔ غلطہ اور استنبول کے درمیان جو پُل ہے، اس پر سے گزرنے کا محصول ایک پیسانی کس ہے اس کی روزانہ آمدنی پانچ چھ ہزار سے کم نہیں۔ قہوہ خانے چار پانچ ہزار تو ضرور ہوں گے۔[۵۲]

---

[۵۱] سفرنامہ روم و مصر و شام صفحہ ۲۸، ۲۹۔ یہاں یہ عرض کر دینا چاہیے کہ بظاہر نہر سے ابن بطوطہ کا مقصود "شاخِ زرّیں" ہے، جو غلطہ پیرا کو استنبول سے جُدا کرتی ہے۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ استنبول اس نہر کے مشرقی کنارے پر ہے۔ اگر یہ ابن بطوطہ نے لکھا تو غلط لکھا۔ اگر مولانا سے نقل میں لغزش ہوئی تو میں نے اس کی تصحیح کر دی ہے۔ یہ استنبول کی اُس وقت کی حالت ہے، جب اسے صلیبیوں کے ہاتھوں برباد ہوئے کم و بیش ایک سو چھبیس سال گزر چکے تھے۔

[۵۲] سفرنامہ روم و مصر و شام صفحہ ۳۰۔

دُوسرا باب

بازار، سرائیں اور سیرگاہیں

ہپوڈروم یا اَت میدان استنبول کی تاریخی اور قابلِ دید عمارتوں کا ذکر آگے آئے گا۔ یہاں ہپوڈروم یا اَت میدان کی کیفیت اجمالاً بیان کر دینا مناسب ہے۔ کتاب کے پہلے حصّے سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہپوڈروم وہی میدان تھا، جہاں گھوڑوں اور جنگی رتھوں کی دوڑ کے مقابلے ہوتے تھے۔ جوانمرد خونخوار درندوں سے لڑتے تھے اور وہ تمام کھیل ہوتے تھے، جو پہلے پہل یونان اور روم میں جاری ہوئے۔ وہاں سے رومی شہنشاہوں کے ساتھ استنبول پہنچے۔ عثمانیوں کے عہد میں یہاں تُرک سوار نیزہ بازی کے جوہر دکھاتے تھے یا مقامِ خلافت کے بیان کے مطابق "جرید" کھیلتے تھے۔ ایڈورن ہاڈر لکھتا ہے کہ یہ میدان نہایت شاندار ستونوں سے مزیّن تھا اور جگہ جگہ دیوتاؤں، بہادروں، شہنشاہوں اور جنگجوؤں کے مجسّمے نصب تھے:

"لیکن یہ سب چیزیں مُدّت ہوئی، ناپید ہو چکیں۔ تانبے کی جتنی بھی چیزیں تھیں، وہ تقریباً سب کی سب اندھے اور سن رسیدہ ڈنڈولو[1] کے ماتحت اہلِ وینس نے پگھلا لیں۔ یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے، جب ۱۲۰۴ء میں صلیبیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا تھا۔"

سر عبدالقادر کا بیان سر عبدالقادر مرحوم "مقامِ خلافت" میں فرماتے ہیں کہ ینی چری فوج کی سب سے بڑی بغاوت جو ۱۸۲۶ء میں ہوئی تھی اور کشت و خون کے بعد فرو ہوئی، اسی میدان کا واقعہ ہے:

"اب ہپوڈروم (اَت میدان) کی کچھ زمین ایک مکتبِ صنائع اور دفترِ زراعت نے

---

[1] "بلادِ عالم انگریزی" ص ۳۹ ڈنڈولو حاکمِ وینس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اس نے لاطینی صلیبیوں کے ساتھ مل کر ۱۲۰۴ء میں قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا۔ وہ سن رسیدگی کے باعث نابینا ہو گیا تھا۔

گھیر لی ہے۔ ایک طرف کو جیل خانہ بن گیا۔ دوسری طرف کچھ اور سرکاری عمارتیں بن گئیں۔ ایک گوشے میں امپراطور ولیم (قیصرِ جرمنی) اپنا یادگاری چشمہ بنوا گئے اور عہدِ قدیم کی یادگار صرف دو پُرانے مینار رہ گئے"۔

پھر ان کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک مینار مصری ہے، جو ساٹھ فٹ بلند ہے، اس پر ہیپوڈروم کے بعض سین کندہ ہیں۔ دوسرے کو اژدہا مینار کہتے ہیں۔ اس پر تین اژدہا ایک دوسرے کے گرد لپٹے ہوئے ہیں، جن کی دُمیں نیچے اور منہ اُوپر کو ہیں۔ یہ مینار یونانیوں نے ۴۷۹ ق م میں ایرانیوں کے حملے سے نجات پاکر بنوایا اور ڈلفی کے مشہور مندر میں رکھوایا تھا۔ اژدہاؤں کے سر کٹ چکے ہیں[1]۔

دو بُرج اور دو پُل

پہلے پیرا اور استنبول کے درمیان "شاخِ زرّیں" پر ایک پُل بنا ہوا تھا۔ اب دو پُل ہیں، جن میں سے ایک کو غلطہ کا پُل کہتے ہیں اور دوسرا کمال اتاترک سے منسوب ہے۔

ٹامس ایلم رقم طراز ہے کہ "شاخِ زرّیں" میں بندرگاہ کے پاس پہنچیں تو دونوں جانب دو اُونچے بُرج نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ ایک غلطہ کی جانب، جسے غلطہ کا بُرج کہتے ہیں، دوسرا استنبول کی جانب، جس کا نام ینی چریوں کا بُرج ہے۔ دورِ جدید کے انتظامات سے پیشتر استنبول کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ آگ عموماً لگتی رہتی تھی اور اسے بُجھانے کے لیے فائر بریگیڈ موجود نہ تھے۔ جب کہیں آگ لگتی، لوگ جمع ہوتے اور پانی ڈال ڈال کر بُجھاتے۔ یہ دو بُرج خاصے اُونچے تھے اور ان کی چوٹیوں سے شہر کے تمام حصے بخوبی نظر آتے تھے۔ ان کی بالائی منزل پر پہرے دار بٹھا دیے گئے تھے اور ان کے پاس بڑے بڑے نقارے رکھ دیے گئے تھے۔ وہ دن رات شہر کے مختلف حصوں پر نگاہ رکھتے۔ جب کہیں آگ لگنے کی علامتیں دیکھتے تو فوراً زور زور سے نقارے بجاتے اور لوگوں کو بتا دیتے کہ کہاں آگ لگی ہے۔ یوں اسے جلد از جلد بُجھا دیا جاتا۔

زاویے اور خانقاہیں

جب مولانا شبلی مرحوم استنبول گئے تھے تو شہر کے علاوہ پورے

---

[1] مقامِ خلافت ص ۵۸، ۵۹۔

ملک میں تکیوں یا خانقاہوں کا عام رواج تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب حمل ونقل کے وسائل بہت معمولی حالت میں تھے، تیز رفتار سواریاں، مثلاً ریلیں یا موٹریں یا ہوائی جہاز کہیں موجود نہ تھے تو رفاہی اور خیری امور میں خانقاہوں، زاویوں یا تکیوں کا رواج تھا۔ انھیں عام سرایوں سے ایک مختلف چیز سمجھنا چاہیے۔ سرایوں میں صرف رہنے کے لیے جگہ مل جاتی تھی۔ بعض مقامات پر رہنے کا کرایہ لیا جاتا تھا۔ بعض مقامات پر لوگ مفت دو چار روز گزار لیتے تھے۔ تکیوں اور خانقاہوں میں مسافروں کے لیے رہنے کے علاوہ کھانے کا انتظام بھی ہوتا تھا اور بعض خانقاہوں یا تکیوں میں لوگ خاصا وقت گزار لیتے تھے۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں:۔

"تم نے عربی تاریخوں میں پڑھا ہوگا کہ تمام ممالک اسلامی میں سیاحوں اور طالب علموں کا ایک تانتا بندھا رہتا تھا۔ وہ انھیں خانقاہوں اور زاویوں کی بدولت تھا۔ ابن بطوطہ کو اپنے عالمگیر سفر میں اسی طریقے کی وجہ سے مدد ملی تھی۔ چنانچہ اس نے سفر نامے میں ان زاویوں کو نام بنام لکھا ہے[1]۔"

یہ خانقاہیں امیر اور رئیس قائم کرتے تھے اور مصارف کے لیے تکیے یا خانقاہ کی مناسبت سے جائداد وقف کر دیتے تھے۔ اسی وقف سے مصارف پورے ہوتے تھے۔ مولانا شبلی مرحوم کے سفرِ استنبول کے وقت خانقاہوں اور تکیوں کے متعلق جو رپورٹ مرتب ہوئی تھی، اس کے مطابق ایسے وقف اداروں کی تعداد تین سو پانچ تھی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ تمام بڑے بڑے شہروں میں ہر ملک اور ہر فرقے کے لیے جدا جدا خانقاہیں ہیں:

"اس ملک اور فرقے کا مسافر وہاں آ نکلتا ہے تو بغیر کسی قسم کی روک ٹوک کے خانقاہ میں جا سکتا ہے اور جب تک چاہے، قیام کر سکتا ہے۔ کھانا اور ایک وقت کی چاے مفت ملتی ہے ۔۔۔ ہر خانقاہ میں ایک شیخ ہوتا ہے جس کو معقول تنخواہ و خوراک ملتی ہے اور خانقاہ کا تمام انتظام اس سے متعلق رہتا ہے۔ میں نے متعدد خانقاہوں کی سیر کی۔ بعض کی عمارت خوش فضا اور موزوں ہے۔

---

[1] سفرنامہ روم و شام و مصر ص ۶۷

کھانے کی نوعیّت اور مقدار بھی کافی ہے۔ خاص قسطنطنیہ کی خانقاہوں کے سالانہ مصارف کا تخمینہ چار پانچ لاکھ سے کم نہیں کہا جاسکتا۔[1]"

یہ ۱۸۹۲ء کی کیفیت تھی۔ مرورِ زماں سے اس قسم کے ادارے مفت خوری اور بد دیانتی کے شکار ہو گئے۔ حمل و نقل کے وسائل نے ترقی کی تو ان کی چنداں ضرورت بھی نہ رہی۔

سلسلہ ہائے تصوّف

رابرٹ کالج (استنبول) کے استاذ اجتماعیات کلارنس رچرڈ جانسن کی سرکردگی میں استنبول کی زندگی کے مختلف اجتماعی پہلوؤں کی چھان بین ہو رہی تھی، جس کے نتائج ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئے۔ اس روئداد سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے شہر میں تصوّف کے ایک سو اُنسٹھ سلسلوں کی فہرست مرتّب کی تھی، مگر کچھ سلسلے نظر انداز ہو گئے۔ انھیں بھی شامل کر لیا جائے تو تمام سلسلے ایک سو ستر بنتے تھے۔ ان میں سے ہر سلسلے کے الگ الگ تکیے تھے۔ تیرہ سلسلوں کی تصریح اس روئداد میں کر دی گئی تھی، جن کے تکیے پانچ یا پانچ سے زیادہ تھے۔ مثلاً مولویہ، بکتاشی، بدویّہ، خلوتیّہ، مہریّہ، جلوتیّہ، شیبانیّہ، روفیہ، نقشبندیہ (غالباً نقشبندیّہ) قادریّہ۔ واضح رہے کہ نقشبندیّہ کے تکیے پینسٹھ اور قادریّہ کے ستاون تھے۔ ان تکیوں میں اہلِ سلسلہ کے ہفتہ وار اجتماع ہوتے تھے۔ اجتماعات کے لیے جمعرات یا جمعہ کے دن زیادہ مبارک سمجھے جاتے تھے۔[2]

بازارِ مسقّف

سر عبدالقادر مرحوم نے مقامِ خلافت میں استنبول کے جن مقامات کا ذکر بطورِ خاص کیا ہے، ان میں مسقّف بازار بھی ہے جو بیسیوں بازاروں اور گلیوں کی ایک بھول بھلّیاں ہے۔ گرد مضبوط دیوار، اوپر چھت، اندر داخل ہونے کے بہت سے دروازے، ہر دروازہ اور اس کے سامنے کا بازار ایک خاص تجارت کے لیے مخصوص۔ ۱۸۹۴ء کے شدید زلزلے میں اس کا ایک حصّہ گر گیا تھا۔

اس بازار میں پہلے بہت رونق تھی۔ شیخ عبدالقادر مرحوم نے اس کے متعلق ایک انگریز سیاح کا بیان یوں نقل کیا ہے:

---

[1] سفرنامہ روم و شام و مصر ص ۶۶ [2] CONSTANTINOPLE TODAY ص ۱۵۱

"دکانوں کی یہ مسقّف قطاریں جمع کی جائیں تو میلوں لمبی ہوں گی۔ متحیّر سیّاح کی آنکھ یکے بعد دیگرے ان خوش منظر گلیوں کو دیکھتی ہے، جہاں دُنیا بھر کی مصنوعات کی نمائش ہے۔ گھنٹہ بھر ان گلیوں میں گھومتے رہیں تو ایک جگہ دو دفعہ آنے کی ضرورت نہیں اور اس سارے عرصے میں آنکھ کہیں ہیروں پر پڑتی ہے، کہیں سونے پر۔ کہیں کشمیر کے دوشالے ہیں، کہیں چین کے ریشم، چمکتے ہوئے اسلحہ، مہکتی ہوئی خوشبوئیں، مجلا آئینے اور مطلّا ظروف، زردوزی کے عجیب عجیب نمونے، مزیّن پاپوش، عنبر کے مہنال مرصّع بہ جواہرات سب یہاں رکھے ہیں ... غرض یہ بالکل نرالا نظارہ، اس کا شور، اس کی حرکت اور اس کی جدّت پہلے پہل انسان کو بالکل محوِ حیرت کر دیتی تھی[1]۔

ایک زمانے میں مسقّف بازار استنبول کے اہم اور قابلِ دید مقامات میں سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس میں زمانہء قدیم کے بغداد کی افسانوی حکایات کا پرتو نظر آتا تھا۔ پھر زمانے کے حالات بدلتے گئے۔ ایک تو ان چیزوں کا رواج کم ہو گیا، جو اس بازار کی خاص متاع تھیں اور ان کی جگہ نئی یورپی چیزوں نے لے لی۔ دوسرے دَورِ گزشتہ کا وہ تموّل باقی نہ رہا، جو قیمتی جنسوں کی خرید کے لیے تیار رہتا تھا۔ سلطانی زمانے کے امراء کا سلسلہ مٹ گیا اور اس کی جگہ نئے تمدّن نے لے لی، جو نہ تو ایسی چیزوں کا خواہاں تھا اور نہ اس میں دولت کی پہلی سی کیفیت باقی رہی۔

خانِ والدہ

"خان" ترکی میں سرائے کو کہتے ہیں۔ "مقامِ خلافت" میں اس کارواں سرائے کو بھی خاص اہمیت دی گئی ہے، جو مسقّف بازار کے قریب ہی تھی اور اسے ایرانیوں نے اپنا خاص مرکز بنا لیا تھا۔ سر عبدالقادر مرحوم کے بیان کے مطابق استنبول میں چھوٹی بڑی دو سو کے قریب سرائیں تھیں۔ ان میں اکثر اینٹ اور پتھر سے کام لیا گیا تھا۔ لکڑی استعمال نہیں کی گئی تھی۔ چاروں طرف حجروں کی قطاریں تھیں اور بیچ میں صحن۔ جو مسافر آتا، ضرورت کے مطابق ایک یا زیادہ حُجرے کرایے پر لے لیتا۔ "خانِ والدہ" کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں تقریباً سب کے سب

---

[1] "مقامِ خلافت" صفحہ ۷۵، ۷۶

ایرانی رہتے تھے۔ دولت مند تاجر باہر سے سامان لاکر استنبول میں فروخت کرتے اور استنبول سے سامان خرید کر بیرونی ملکوں میں لے جاتے۔ خود انکا اور اِن کی تجارت کا مرکز یہی کارواں سرائے تھی۔ صحن میں درخت لگے ہوئے تھے۔ حجروں کے سامنے جو برآمدہ تھا، وہ انگور کی بیلوں سے آراستہ تھا۔ موسم گرما میں شام کے قریب چھڑکاؤ کرا کے یہ لوگ درختوں کے نیچے محفلیں جمالیتے۔ اُس وقت کاروبار کا کوئی ذکر نہ ہوتا۔ علم وفن اور شعر وسخن کا چرچا رہتا۔[1]

یدی قلہ یا ہفت بُرج

استنبول کی ایک مشہور تاریخی عمارت یدی قلّہ یا ہفت برج ہے۔ یہ اُس مقام پر واقع ہے، جہاں سے خشکی کی جانب کی فصیل ساحل مرمرا سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے سامنے جو دروازہ ہے، اسے یدی قلّہ قپوسی کہتے ہیں۔ کچھ معلوم نہیں کہ عثمانیوں سے پیشتر یہاں کون سی عمارت تھی، لیکن اتنا معلوم ہے کہ پانچ بُرج کا ایک قلعہ سا تھا۔ سلطان فاتح نے اسے از سرِ نو تعمیر کرایا اور اس کے سات بُرج بن گئے، جن کی وجہ سے عمارت کا نام یدی قُلّہ پڑ گیا۔ یہاں ابتدا میں سرکاری خزانہ رہتا تھا۔ پھر اس عمارت کو شاہی محبس کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ ایلیٹ نے لکھا ہے کہ ینی چریوں نے اس محبس میں سات سلطان قید کیے، پھر انھیں قتل کر دیا۔[2] بہت سے دوسرے اصحاب بھی یہاں قید رہے ہے بلکہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب کوئی حکومت سلطنت عثمانیہ کے خلاف جنگ شروع کر دیتی تھی تو اس کے سفیر کو اسی جگہ قید کیا جاتا تھا۔ سب سے آخر میں فرانس کا سفیر یہاں قید ہوا تھا۔[3]

سیر گاہیں

مولانا شبلی نے اپنے سفرنامہ میں استنبول کے جوار و اطراف کی بعض پُر لطف قدرتی سیر گاہوں کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ ساتھ ہی وہ لکھتے ہیں کہ غنیمت ہے، شہر والے اس نعمت کے قدر شناس ہیں۔ ہر سیرگاہ کے لیے ایک خاص دن مقرر ہے۔ اُس دن وہاں پُر لطف مجمع ہوتا ہے۔

ان میں سے ایک سیرگاہ خونگر صوئی ہے یعنی شاہی چشمہ۔ مولانا فرماتے ہیں:

---

[1] "مقامِ خلافت" ص ۸۰-۸۶۔ [2] DIARY OF AN IDLE WOMAN IN CONSTANTINOPLE۔ ص ۱۱۶، [3] "مقام خلافت" ص ۹۲

"یہ مقام شہر سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر ہے۔ پہاڑوں کا ایک سلسلہ دُور تک چلا گیا ہے اور نہایت شاداب و سرسبز ہے۔ اس میں ایک قطعہ نہایت موزوں نکل آیا ہے، جو پہاڑ کی بلند سطح پر واقع ہے۔ خاص جس جگہ تماشائیوں کا مجمع ہوتا ہے، وہ نہایت پُر لطف مقام ہے۔ سایہ دار درختوں کی دو رویہ قطاریں ہیں۔ جہاں تک نظر کام کرتی ہے، سبزہ نظر آتا ہے۔ ایک طرف آبشار ہے، جس کا پانی ایک حوض میں جمع ہو جاتا ہے۔ درختوں کے نیچے جابجا دو دو چار چار آدمیوں کی ٹکڑیاں ہوتی ہیں۔ چائے اور قہوے کا دَور چلتا ہے۔ حوض پر باجا بجتا ہے۔ فرنچ اور ترکی گانا ہوتا ہے[1]۔"

مولانا کے بیان کے مطابق پانچ چھ زینے چڑھ کر پہاڑ کی اصل چوٹی پر پہنچ جاتے تھے، جو نہایت مسطح اور سایہ دار تھی۔ یہ خاص عورتوں کی جگہ تھی۔ عورتوں کے لیے بیس بیس میل کی مسافت، پہاڑ کی چڑھائی، گھوڑے یا خچر کی سواری کچھ کم تکلیف کی بات نہیں، لیکن جگہ اتنی دلآویز تھی کہ اس کے لیے سب تکلیفیں برداشت کر لی جاتی تھیں۔ دوسری نہایت مشہور سیرگاہ کا نام مولانا نے سقری کھی بتایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ یہ ایک قہوہ خانہ ہے، جو سمندر کے کنارے پر ہے اور نہایت پُر فضا مقام ہے۔ موجیں بار بار کگاڑے سے آکر ٹکراتی ہیں اور عجیب مزہ آتا ہے[2]۔

کاغذ خانہ

ایک سیرگاہ کا ذکر سر عبد القادر مرحوم نے "مقامِ خلافت" میں کیا ہے، جسے وہ مقامِ ایوبؓ سے تھوڑے فاصلے پر بتاتے ہیں۔ "شاخِ زریں" کے شمالی گوشے پر دو ندیاں اس میں شامل ہوتی ہیں، جن میں سے ایک کا نام علی بیگ کوئی صُو ہے اور دوسری کا نام کاغذ خانہ صُو۔ کاغذ خانہ صُو والی وادی بہت شاداب ہے۔ سر عبد القادر لکھتے ہیں: درختوں کے جُھنڈ نظر کو لُبھاتے ہیں۔ لہلہاتے ہوئے کھیت آنکھوں کو طراوت بخشتے ہیں۔ یہاں ایک شاہی محل بھی ہے، جسے کاغذ خانہ کوشک کہتے ہیں۔ سلطان عبد الحمید ثانی زمانۂ شہزادگی میں وہیں رہتے تھے۔

شیخ صاحب کے بیان کے مطابق موسمِ بہار میں یہاں بہت ہجوم ہوتا تھا۔ اس مقام سے

---

[1] سفرنامہ ص ۷۳ ۔ [2] سفرنامہ روم و شام و مصر ص ۷۳

آبنائے باسفورس کے مختلف بہار آفریں مقامات تک راستے گئے تھے مثلاً باغچہ کوئی اور بیوک درہ۔ یہیں سے بعض لوگ بلغراد کے مشہور جنگل تک جاتے تھے، لیکن اس میں سارا دن صرف کرنا پڑتا تھا۔[1]

ساحلی تفریح گاہیں

یورپ میں مدت سے رواج چلا آتا ہے کہ مرد و زن سمندر میں نہاتے ہیں اور ساحل کی ریت پر دھوپ تاپتے ہیں۔ تمام یورپی اور امریکی ملکوں میں یہ عام تفریح ہے۔ جن ایشیائی ملکوں نے یورپی تمدن کی پیروی کی، انھوں نے اپنے ہاں بھی ایسی تفریح گاہوں کا انتظام کر لیا۔ اس کے لیے ساحل کے وہ حصے چُنے جاتے ہیں، جہاں سمندر اتھلا ہو اور کنارے پر دُور تک خوب صورت ریت کا فرش بچھا ہُوا ہو۔ نیز گرد و پیش کے مناظر حسین و جمیل ہوں۔ استنبول میں بھی ایسی تفریح گاہیں بن گئی ہیں، جن کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یورپی باشندے اپنے ذوق و تفریح کے مطابق تمام چیزیں مہیا پا کر بے تکلف سیاحت کی غرض سے استنبول پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ بحیرۂ مرمرا کے ساتھ یورپی اور اناطولی ساحل پر بعض نہایت خوب صورت غسل گاہیں موجود ہیں۔ ایک عمدہ غسل گاہ سامنے کے جزیروں میں سے بیوک اطہ میں ہے اور غلطہ کے پُل سے کشتی دو گھنٹے میں وہاں پہنچا دیتی ہے۔ واضح رہے کہ ان تفریح گاہوں کے ساتھ ویسی عمارتیں اور ہوٹل موجود ہیں، جیسے یورپ کے خاص مقامات میں ملتے ہیں اور آبنائے باسفورس تو پوری کی پوری ایک بہترین غسل گاہ اور تفریح گاہ ہے۔

قبر یکۂ ہمایوں

استنبول کے جوار و اطراف کی ایک اور سیرگاہ کا ذکر بھی ضروری ہے، جو ایشیائی ساحل پر حیدر پاشا سے تھوڑی دُور واقع ہے۔ یہاں سلطان عبدالحمید کے عہد میں شال و ابریشم کا کارخانہ بن گیا تھا۔ شیخ عبدالقادر فرماتے ہیں:

> "کارخانے کے لیے جو موقع چُنا گیا ہے، اسے قدرت نے اس قدر دل لگا کر سجایا ہے کہ بہشت کا ایک چھوٹا سا قطعہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف سبزہ پوش پہاڑ اور ان کے شفّاف پانی کے قدرتی چشمے، دوسری طرف سمندر، جس کی لہریں مدام پہاڑوں کے قدم چوم رہی ہیں۔ دونوں کے دریا دامن کوہ میں یہ خوب صورت آبادی اور کارخانے کی عمارتیں، جن کے قریب مختلف چشموں کا پانی مل کر ایک

---

[1] "مقامِ خلافت" ص ۹۵ - ۹۷

نہر بن گیا ہے۔ پانی ایسا صاف ہے کہ اس کی تہ میں جتنے سنگریزے ہیں، ہر ایک
کا رنگ متمیّز نظر آتا ہے۔"[1]

اس کارخانے میں لڑکوں کے علاوہ لڑکیاں بھی کام کرتی تھیں۔ شیخ عبدالقادر فرماتے ہیں:
ان غریب لاوارث لڑکیوں کی زندگی اس طرح بسر ہوتی ہے کہ اس پر بہت سی گھر بار والی لڑکیاں بھی فخر کرسکتی ہیں۔ ریشم اور قالین کے علاوہ یہاں ہر قسم کا کپڑا بھی بننا شروع ہوگیا تھا۔ حکومت نے کارکنوں کی تعلیم کا انتظام بھی ساتھ ہی کر دیا تھا۔" یہاں فارسی کے ایک مدّرس راشد آفندی رہتے تھے، جو قفقاز کے ایک مقام قبہ کے رہنے والے تھے۔ وہ استنبول آگئے۔ یہیں عمر بسر کردی۔ رخصت کے وقت انھوں نے دو شعر شیخ عبدالقادر کو سنائے۔ خود بھی تڑپے اور شیخ صاحب کو بھی تڑپا گئے۔ شعر درج ذیل ہیں:

در غربت اگر مرگ بگیرد بدنِ من — آیا کہ کند قبر کہ دوزد کفنِ من
تابوتِ مرا جائے بلندے بگزارید — تا باد بُرد بوئے مرا در وطنِ من[2]

---

[1] "مقامِ خلافت" ص ۱۰۹ [2] "مقامِ خلافت" ص ۱۱۷

تیسرا باب

استنبول کی مسجدیں

مسجدوں کی تعداد مولانا شبلی مرحوم کا یہ بیان اُوپر نقل ہو چکا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں شہر کے اندر کم و بیش پان سو جامع مسجدیں تھیں۔ بدائع آثار عثمانیہ نے مسجدوں کا ایک نقشہ شائع کیا تھا، جس کی ایک نقل رچرڈ جانسن کی کتاب میں بھی شامل ہے۔ اس کے سرسری معائنے سے مسجدوں کی کیفیت یہ معلوم ہوتی ہے:

حلقہ	تعداد
داخل استنبول	۲۸۷
فصیل سے باہر	۳۸
قاسم پاشا و یک اوغلی (پیرا، غلطہ وغیرہ)	۱۱۱
اسکدار یعنی سقوطری	۶۲

یہ کُل تعداد چار سو اٹھانوے بنتی ہے اور یہ وہی مسجدیں ہیں، جنھیں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ عام مسجدیں بہت زیادہ ہوں گی۔

یہاں تمام مسجدوں کی کیفیت نہ بتائی جا سکتی ہے اور نہ معلوم ہے، لیکن چند بڑی مسجدوں کا مختصر سا خاکہ پیش کر دینا ضروری ہے، اگرچہ مولانا شبلی کے بیان کے مطابق باشندگانِ پاک و ہند کے مذاق کے لحاظ سے ان مسجدوں کو خوب صورت اور موزوں نہیں کہہ سکتے[1]۔

ایا صوفیہ ان میں سب سے پہلے قابلِ ذکر ایا صوفیہ[2] ہے۔ یورپ کے سیّاحوں نے بھی اس کے بیان و تشریح پر خاص توجہ مبذول رکھی، کیونکہ تسخیرِ قسطنطنیہ سے پہلے یہ بہت مشہور

---

[1] "سفرنامہ" صہ ۶۸ - [2] ترک اسے حاجیہ صوفیہ بھی کہتے ہیں۔

گرجا تھا اور جیسا کہ پیشِ نظر کتاب کے پہلے حصے میں بتایا جا چکا ہے، قیصر جسٹینین نے اسے اپنے خیال کے مطابق ہیکل سلیمانی سے بڑھا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ مسلمان سیاحوں نے بھی خاص زور اسی کی تفصیلات پر صرف کیا ہے۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ لوگوں کے بیان کے مطابق کئی ہزار پادری اور رہبان اس گرجے میں دن رات رہتے تھے۔ ابن بطوطہ نے جو صورت بیان کی ہے وہ باقی نہیں رہی۔ پہلے مسجد کے اردگرد احاطہ تھا، جس میں ایک نہر بہتی تھی۔ اب احاطہ مسجد سے باہر ہے:

"واقعی یہ عمارت عجیب و غریب اور حیرت افزا ہے۔ بیچ کے گنبد کا قطر ۱۱۵ فٹ اور چھت کا ارتفاع ۱۸۰ فٹ ہے۔ ۱۷۰ ستون ہیں اور کل سنگِ سماق اور رخام کے ہیں۔ ان ستونوں کا قطر تین تین چار چار ہاتھ سے کم نہیں۔"

جب تک یہاں گرجا تھا، یہ عمارت کئی مرتبہ برباد ہوئی(۱)، مثلاً ۴۰۴ء میں آگ لگی۔ چونکہ گرجے میں زیادہ تر لکڑی کا کام تھا، اس لیے پوری عمارت جل کر راکھ کا ڈھیر رہ گئی۔ قیصر تھیوڈوسیس ثانی (۴۰۸ء۔۴۵۰ء) کے عہد میں گرجا پھر بنا۔ ۵۳۲ء میں پہلے جیسا حادثہ پیش آیا اور یہ پھر تباہ ہو گیا۔ اس کی تفصیل کتاب کے پہلے حصے میں بتائی جا چکی ہے۔ قیصر جسٹینین (۵۲۷ء۔۵۶۶ء) نے بڑے اہتمام سے اسے بنوایا۔ ۵۵۸ء میں زلزلے سے اس کا گنبد گر پڑا۔ ۵۶۱ء میں گنبد از سرِ نو تیار ہوا اور اسے پہلے سے بھی پچیس فٹ بلند تر رکھا گیا۔ اس کے بعد بھی گرجے پر کئی مرتبہ آفتیں آئیں۔ ایک آفت لاطینی صلیبیوں کی بھی تھی، جس میں یہ بری طرح تباہ ہوا۔ ۱۴۵۳ء میں استنبول فتح ہوا تو سلطان فاتح نے اسے تھوڑی سی ترمیم سے مسجد میں تبدیل کر لیا اور یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ بعد میں مسلم سلاطین نے جو مسجدیں بنوائیں، وہ فی الجملہ ایا صوفیہ ہی کے نمونے کی تھیں۔

شیخ عبدالقادر مرحوم اس کی کیفیت یوں پیش کرتے ہیں کہ اس کے گنبد کا قطر ایک سو اُناسی فٹ ہے اور یہ چار بڑے محرابوں پہ قائم ہے، جو طول میں چھتّر فٹ اور عرض میں پچاس فٹ ہیں۔ گنبد کے نیچے کا حصہ جسے وسطی قطعہ کہنا چاہیے، ایک بڑا مستطیل ہال ہے جو دو سو چالیس فٹ لمبا

۱؎ سفرنامہ ص ۶۵

اور ایک سو فٹ چوڑا ہے۔ اس کے دائیں بائیں دو منزلہ عمارت ہے، جس کی ایک طرف کی گیلری کا طول دو سو پانچ فٹ اور عرض چھتیس فٹ ہے۔ مسجد میں داخلے کے نو دروازے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا دروازہ نہایت شاندار ہے[۵]۔ غالباً یہی دروازہ ہے، جس کے متعلق مولانا شبلی نے فرمایا کہ یہ چاندی اور سونے کے پتروں سے منڈھا ہوا ہے[۶]۔

ایک قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ پہلے ایا صوفیہ کی عمارت کی کرسی ارد گرد کی زمین سے بلند تھی اور لوگ چند سیڑھیاں چڑھ کر اندر جاتے تھے۔ اب ارد گرد کی زمین اونچی ہو گئی ہے اور چند سیڑھیاں اُتر کر اندر جانا ہوتا ہے۔

"مقامِ خلافت" کا بیان

مسجد میں داخل ہوتے ہی سنگِ مرمر کا ایک بہت بڑا مٹکا پانی سے بھرا رکھا رہتا تھا۔ یہ وضو کے لیے تھا۔ شیخ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ مسیحی عہد میں بھی یہاں پانی کا ایک برتن تھا، جس پر یہ عبارت مرقوم تھی: "صرف مُنہ دھونا کافی نہیں، اپنے گناہوں کو دھونا چاہیے"۔

روشنی کے لیے مسجد میں بڑے بڑے جھاڑ لٹکا دیے گئے تھے اور ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے بلوری چراغ جگہ جگہ آویزاں تھے۔ منبر نہایت بلند تھا اور ایا صوفیہ کا امام خطبہ پڑھتے وقت ہاتھ میں تلوار لے کر کھڑا ہوتا تھا۔ بعد میں یہ طریقہ ترک کر دیا گیا[۷]۔ اس مسجد کے نہایت خوبصورت مخروطی مینار مسلمانوں نے بنوائے۔

ایا صوفیہ کی موجودہ حالت

آخر میں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ ایا صوفیہ اب مسجد نہیں رہی۔ قیامِ جمہوریت کے ساتھ ہی غازی کمال اتاترک نے اسے مسجد کی جگہ میوزیم میں (عجائب خانہ) تبدیل کر دیا تھا۔ غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ بیرونی دنیا پر واضح ہو جائے، ترک مذہبی امور و معاملات میں پہلے سے زیادہ کشادہ دل ہو گئے ہیں، حالانکہ جس دَور میں استنبول اسلامی شہر بنا تھا، اس دَور میں دُوسروں کی عبادت گاہوں پر قبض و تصرف عام تھا، خصوصاً اس لیے کہ عبادت گاہوں میں حاضر ہونے والے لوگ ہی موجود نہیں رہے تھے اور ان کی جگہ مسلمانوں نے لے لی تھی۔ سلطان فاتح نے بعد میں یونانی مسیحیوں کو

---

[۵] "مقامِ خلافت" ص ۳۳؛ [۶] "سفرنامہ" ص ۶۸، ۶۹؛ [۷] "مقامِ خلافت" ص ۲۵۶

جمع کیا تو ان کا سقف بھی بحال کر دیا اور بعض گرجے بھی انھیں دے دیے۔ ایا صوفیہ کا گرجا اُس وقت تک مسجد بن چکا تھا۔ اس واقعے سے بہت مدت پہلے مسیحیوں نے جامع قرطبہ کو گرجا بنا لیا تھا۔ وہ اب تک گرجا ہی ہے۔ فتح استنبول سے چالیس سال بعد غرناطہ مسیحیوں کے قبضے میں آیا تو وہاں کی کوئی مسجد، مسجد نہ رہی اور اب بھی مسجد نہیں۔ بہر حال آج کل ایا صوفیہ عجائب خانہ ہے۔

جامع سُلطان احمد یہ عالی شان مسجد ہپوڈروم یا ات میدان کے مشرق کی طرف سلطان احمد اول (۱۶۰۳ء۔۱۶۱۷ء) نے بنوائی تھی اور استنبول کی نہایت اہم عمارتوں میں سے ہے۔ اس کے چھ مینار ہیں۔ چاروں طرف وسیع احاطہ ہے، جس میں بہت سے درخت مسجد کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ طلبہ کے لیے الگ حجرے بنا دیے گئے تھے۔ مسجد کا اندرونی حصہ دو سو تیس فٹ لمبا اور دو سو دس فٹ چوڑا ہے۔ "مقامِ خلافت" میں ایک فرانسیسی سیاح کا بیان اس مسجد کے متعلق یوں مرقوم ہے:

"چار بڑے بڑے ستون وسطی گنبد کو سنبھالے ہوئے ہیں، جس کا قطر چھتیس گز ہے۔ نیلگوں، سبز اور سفید روغنی اینٹیں دیواروں کو ڈھانپے ہوئے ہیں، جن پر پسندیدہ نقش و نگار بنے ہیں.... سُنہری حروف میں آیات قرآنی نصف بلندی کے قریب لکھی ہوئی ہیں۔ محراب کے پتھر نادر اور قیمتی ہیں... منبر سنگ مرمر کے کام کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ دونوں طرف بڑی بڑی بتیوں والے پیتل کے جھاڑ ہیں۔ جنوب مشرقی گوشے میں داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ سلاطین کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے، جو بہت آراستہ ہے... قرآن کے نہایت عمدہ قلمی نسخے خوب صورت رحلوں پر دھرے ہیں اور رحلوں پر سیپ کا کام ہے[1]۔"

ایک انگریز رقم طراز ہے:

"اگر اس مسجد کو چار حصوں میں تقسیم کریں تو چاروں حصے بالکل یکساں معلوم ہوں گے... ہر دیوار کا نقشہ بھی ایک سا ہے۔ ایک ہی قسم کی کھڑکیاں ایک دوسری سے یکساں

---

[1] "مقامِ خلافت" ص ۶۵

فاصلے پر دیواروں میں لگی ہوئی ہیں... دو سو فٹ مربع کا ہال، جس کی پتھر کی چھت صرف چار ستونوں پر کھڑی ہے، اپنی جگہ ایک شاندار چیز ہے۔[۱]

بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان احمد تعمیرِ مسجد کے دوران میں خود ہر ہفتے ایک دن کے لیے جاتا تھا اور تبرکاً معماروں کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ اس کے اوقاف کی آمدنی کم و بیش پچیس ہزار روپے سالانہ تھی۔[۲]

جامع فاتح

سلطان محمدؒ فاتح کی یہ مسجد استنبول کی تمام مساجد میں سب سے زیادہ پرانی ہے۔ سلطان نے مسجد کے علاوہ علومِ قدیمہ کی تدریس کا بھی خاص انتظام کیا تھا۔ گویا یہ استنبول کا ایک مشہور دارالعلوم بھی تھی۔ مصطفیٰ ثالث (۱۷۵۷ء تا ۱۷۷۶ء) کے عہد میں زلزلے کے باعث اس مسجد کو بہت نقصان پہنچا۔ اب یہ اصل حالت میں نہیں بلکہ مرمت شدہ حالت میں ہے:

"محراب اور منبر سفید سنگِ مرمر کے ہیں۔ مسجد کے گرد جو باغ ہے، اس میں سلطان جنت مکان محمد ثانی کا مزار ہے۔ جو لوگ اس جامع شریف کی زیارت کو آتے ہیں، وہ مرحوم فاتح کے مزار پر بھی ضرور فاتحہ پڑھتے ہیں"۔[۳]

یہ مسجد ۱۴۶۳ء سے ۱۴۷۰ء تک سات سال میں تعمیر ہوئی۔ حاجی احمد اس کا معمارِ اعلیٰ تھا۔ مزارِ فاتح کے ساتھ ہی اس کی ملکہ گُل بہار خاتون کی بھی آرام گاہ ہے۔ اس کے گراں بہا کتب خانے کا ذکر آگے آئے گا۔

جامع بایزید

یہ مسجد سلطان بایزید ثانی (۱۴۸۱ء-۱۵۱۲ء) نے بنوائی تھی۔ گویا سلطان فاتح کی مسجد اور جامع ایوبؓ کے بعد یہ استنبول کی سب سے پرانی مسجد ہے۔ یہ ۱۵۰۱ء اور ۱۵۰۵ء کے درمیان تعمیر ہوئی اور خیر الدین اس کا معمار تھا۔ مسجد کے صحن میں چنار کے چند عالی شان درخت بہار کا خاص سماں پیدا کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی بہت بڑا کتب خانہ تھا، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

جامع سلیمانیہ

یہ مسجد خاندانِ عثمانیہ کے سب سے بڑے سلطان سلیمان اعظم نے ۱۵۵۰ء اور ۱۵۵۷ء کے درمیان تعمیر کرائی تھی۔ خواجہ سنان اس کا معمار تھا۔ اس سے پیشتر وہ سلطان سلیمان کے حکم سے "شہزادہ جامع" تعمیر کر چکا تھا، جو سلطان سلیمان نے اپنے دو بیٹوں اور ایک

۱؎ "مقامِ خلافت" ص ۶۶ ۲؎ ایضاً ص ۶۷، ۶۸ ۳؎ ایضاً ص ۶۹، ۷۰

بیٹی کی یادگار میں بنوائی تھی۔ مشہور ہے کہ سنان نے کہا تھا، میں نے جب "شہزادہ جامع" بنائی تو نو آموز تھا۔ جامع سلیمانیہ بناتے وقت میری حیثیت نگرانِ کار کی تھی اور ایڈریانوپل میں جامع سلیمیہ بناتے وقت مجھے فنّی کمالات کی نمائش کا پورا موقع ملا۔

خالص عثمانی تعمیرات میں یہ مسجد سب سے زیادہ خوب صورت سمجھی جاتی ہے۔ ارد گرد حجرے بنے ہوئے ہیں۔ چھت پر چوبیں چھوٹے گنبد ہیں۔ فرش سنگِ مرمر کا ہے۔ مسجد کا اندرونی حصہ طول میں سو ادو سو فٹ اور عرض میں دو سو فٹ ہے۔ مسجد کے چاروں طرف ایک گیلری ہے، جو ستونوں کے سہارے کھڑی ہے۔ اس گیلری کے شمالی حصّے میں لوگوں کی امانتیں رکھی جاتی تھیں، گویا اسے سیف ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت حاصل تھی۔ امانتیں رکھنے والوں کو باقاعدہ رسیدیں دی جاتی تھیں۔ درمیانی گنبد کا قطر چھیاسی فٹ تھا اور بلندی ایک سو چھپّن فٹ تھی۔ سلطان کے نماز پڑھنے کی جگہ پر سنگِ مرمر کا نہایت نادر کام کیا گیا ہے۔ دریچوں میں رنگین شیشے لگے ہوئے ہیں، جو سلیمانی عہد کے بہترین آئینہ ساز ابراہیم سرخوش کی یادگار ہیں۔ اس کے اوقاف کی آمدنی سینتیس ہزار روپے تھی۔ مسجد کے باغ میں سلطان سلیمان اور ملکہ خرّم (جسے اہلِ فرنگ راکسالینا کہتے ہیں) کے مرقد ہیں۔ شہزادہ جامع کے متعلق سرسری ذکر آچکا ہے، الگ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

جامع سلیمیہ یہ مسجد بھی سلطان سلیمان نے اپنے والد سلطان سلیم کی یادگار میں بنوائی تھی۔ یہ بہت بلند اور بڑی عالی شان ہے، اگرچہ سلیمانیہ کے رتبے کو نہیں پہنچتی۔ اس کے ساتھ بھی کتب خانہ اور مدرسہ تھا۔ استنبول کی بڑی مسجدوں سے غالباً کوئی نہیں، جس کے ساتھ حمام اور مہمان سرائے نہ ہو۔

نوری عثمانیہ اس مسجد کی تعمیر سلطان محمود اوّل (۱۷۳۰ء - ۱۷۵۴ء) نے شروع کی تھی، لیکن اس کی زندگی میں مکمّل نہ ہو سکی۔ اس کے جانشین سلطان عثمان ثالث نے اسے مکمل کرایا۔

ان مسجدوں کے علاوہ استنبول میں جامع مہرمہ، جامع رستم پاشا، جامع عتیق علی پاشا، والدہ جامع اور ینی والدہ جامع قابلِ ذکر ہیں۔ آخری دو مسجدیں بالترتیب والدہ سلطان محمد رابع اور

---

۵ "مقامِ خلافت"، ص ۲۰۷۔

والدہ سلطان عبدالعزیز نے بنوائی تھیں۔

جامع حمیدیہ

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، استنبول کی طرح پیرا اور غلطہ میں بھی عالی شان مسجدیں تعمیر ہوئیں، مثلاً جامع ابشکطاش، جو ساحلِ بحر کے قریب واقع ہے۔ چونکہ سلطان عبدالحمید ثانی کبھی کبھی اس مسجد میں بھی نمازِ جمعہ ادا کرنے کے لیے پہنچ جاتے تھے، اس وجہ سے سلطان کے لیے سنگِ مرمر کا ایک نہایت خوبصورت مقصورہ بنا دیا گیا۔ یہیں توپ خانے کے قریب دو اور مسجدوں کا ذکر آیا ہے یعنی جامع محمود اور جامع قلیج علی۔ لیکن اس حصے میں سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر مسجد جامع حمیدیہ ہے، جو سلطان عبدالحمید ثانی نے بنوائی تھی اور یہاں سلطان مرحوم کے عہد میں سلاملق کی رسم ادا ہوتی رہی۔ یہ مسجد عام مساجد کے برعکس نئے انداز پر تعمیر ہوئی۔ اگرچہ اس میں بھی گنبد اور مینارے ہیں، لیکن یہ پرانی مسجدوں سے بالکل مختلف ہیں۔

جامع حضرت ابو ایوبؓ

استنبول میں جس مقام کو سب سے زیادہ مقدس اور متبرک سمجھا جاتا ہے، وہی ہے، جہاں رسولِ اکرم صلعم کے مشہور صحابی حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا مزار ہے۔ حضرت ابو ایوبؓ نے استنبول کے ابتدائی اسلامی حملے میں وفات پائی تھی اور آپ کی وصیت کے مطابق میت کو استنبول سے قریب تر لے جا کر دفن کیا گیا تھا۔ مرقد کی جگہ ہموار کر دی گئی تھی تاکہ کوئی شخص بے حرمتی کا مرتکب نہ ہو سکے۔ مسیحیوں کو انتباہ بھی کر دیا گیا تھا کہ اگر اس مقدس مقام کی بے حرمتی ہوئی تو سلطنتِ اسلامیہ میں کہیں بھی ناقوس نہ بج سکے گا۔

ویسے بھی کم و بیش آٹھ سو سال تک مرقد کا نشان باقی رہنا ممکن نہ تھا کیونکہ کوئی اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنے والا نہ تھا۔ فتح استنبول کے بعد سلطان فاتح کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ اس مرقد کا صحیح نشان مل جائے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان کے عہد میں شیخ شمس الدین ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے، انھیں خواب میں حضرت ابو ایوبؓ کے مرقد کا نشان دکھایا گیا اور انھوں نے سلطان کو اس سے مطلع کیا۔ چنانچہ شیخ شمس الدین کے نشان دادہ مقام پر مزار تعمیر ہوا۔ ساتھ ہی ایک جامع مسجد بنوا دی گئی، جس کا سنِ تعمیر ۱۴۶۳ء سے ۱۴۶۹ء تک بتایا جاتا ہے۔ گویا یہ جامع مبارک بھی استنبول کی

---

۱۵ "مقامِ خلافت" ص ۱۰۰

قدیم ترین اور آباد ترین مسجدوں میں سے ہے۔ اگرچہ شہر سے باہر اور آبادی سے دور ہے، تاہم وہاں ہر روز میلا سا لگا رہتا ہے اور جمعہ کے دن تو زن و مرد بکثرت زیارت کے لیے وہاں پہنچتے ہیں۔

سلاطین عثمانیہ کے زمانے میں یہ دستور تھا کہ ہر سلطان تاج پوشی کے بعد حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مزار پر پہنچتا اور تبرک و تیمن کی غرض سے وہاں بانیِ خاندان سلطان عثمان کی تلوار کمر میں باندھتا۔ یہاں ایک بہت بڑا قبرستان بھی بن گیا ہے کیونکہ اکثر لوگ رسولِ اکرم صلعم کے مقدس صحابی کے قریب دفن ہونا باعثِ برکت سمجھتے تھے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی نظم "بلادِ اسلامیہ" میں استنبول کو بھی شامل کیا تھا اور اس سلسلے میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ بہ طور خاص ان کے پیشِ نظر رہے تھے۔ فرماتے ہیں:

نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تربتِ ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا
اے مسلماں! ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر[1]

"مقامِ خلافت" کا بیان

شیخ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ اس مقام پر ایک چھوٹی سی آبادی ہے۔ غیر مذاہب کے لوگوں کو نہ مسجد میں آنے کی اجازت ہے۔ نہ وہ یہاں زمین یا مکان خرید سکتے ہیں۔

لوگ کشتی میں سوار ہو کر براہِ "شاخ زریں" بھی وہاں جاتے ہیں اور دوسرے راستے بھی ہیں۔ مزار کے ایک گوشے میں ایک کنواں ہے، جس کا پانی تبرگاً لے جاتے ہیں۔ مسجد میں لوگ بکثرت ادائے نماز کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ اس مقام کے قریب "شاخ زریں" ختم ہو جاتی ہے۔ خواتین کے لیے جامع کا ایک حصہ الگ کر دیا گیا ہے اور بیچ میں لوہے کی جالی لگا دی گئی ہے۔ مردوں کی طرح خواتین بھی بکثرت یہاں آتی ہیں۔ مسجد میں نماز پڑھتی ہیں اور جمعہ کے دن وعظ بھی سنتی ہیں۔

مسجدوں کی آراستگی

آخر میں مولانا شبلی مرحوم کا یہ بیان ضرور ملاحظہ فرمالینا چاہیے، جو اگرچہ ۱۸۹۲ء کے حالات پر مشتمل ہے تاہم یقین ہے کہ اس میں کسی ترمیم کی ضرورت پیش نہیں آئی، یعنی مسجدوں کی آراستگی کا جیسا اہتمام پہلے تھا ویسا ہی اب بھی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

---

[1] بانگِ درا، ص ۱۵۶، ۱۵۷

تمام مسجدیں پُر تکلف اور آراستہ ہیں۔ روزمرہ معمولی چٹائی اور جمعہ و عیدین کو عمدہ و بیش قیمت قالین کا فرش بچھتا ہے۔ مسجد کے ایک طرف کچھ زمین چھوٹی ہوتی ہے۔ اس میں وضو کرنے کے لیے سقاوہ بنا ہوتا ہے۔ میں نے اس بات کو نہایت پسند کیا کہ یہاں (استنبول میں) حوض کا مطلق رواج نہیں[1]۔

مولانا یہ بھی فرماتے ہیں، مسجد میں کئی کئی سو بتیوں کے آہنی جھاڑ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جھاڑ کا رواج بہت قدیم زمانے سے ہے۔ اسپین کی عربی تاریخوں میں "ثریا" کے لفظ سے غالباً اسی قسم کے جھاڑ مراد ہیں، البتہ اتنا فرق ہے کہ وہاں شیشے اور بلّور کے ہوتے تھے، یہاں لوہے کے ہیں[2]۔

---

[1] "سفرنامہ" ص ۶۸ [2] ایضاً ص ۶۸

چوتھا باب

شاہی محل، تاریخی عمارتیں اور عجائب خانے

استنبول کی عمارتیں

استنبول میں بہت سی قابلِ ذکر عمارتیں ہیں، لیکن ان سب کی تفصیل بیان کرنا مشکل ہے۔ عثمانیوں کے دورِ اقتدار سے پیشتر وہاں چودہ شاہی محل بتائے جاتے تھے۔ ان میں سے بعض انقلابات میں منہدم ہوئے، بعض زلزلوں میں گر گئے، بعض اس وجہ سے بے اعتنائی کی نذر ہوئے کہ بادشاہوں کی توجہ نئی عمارتوں پر مبذول ہو گئی۔ سلاطین عثمانیہ کے زمانے میں بھی چھوٹے بڑے متعدد محل بنائے ہوں گے۔ مولانا شبلی نے ان کی تعداد بیس یا اکیس بتائی ہے [1]۔ اسی طرح امراء و وزراء نے بھی جگہ جگہ محل نما عمارتیں تیار کرائیں۔ چونکہ استنبول اور اس کے ماحول، خصوصاً آبنائے باسفورس کے کناروں پر قدرتی حسن و جمال کے متعدد مقامات موجود تھے، جن کے عقب میں درختوں کے جھنڈ نے دلآویز بہار کا سماں پیدا کر دیا تھا، اس لیے خوش ذوق فرمانرواؤں نے جگہ جگہ عالی شان عمارتیں بنا لیں، جہاں وہ کچھ مدت کے لیے تفریح کی غرض سے جا ٹھہرتے تھے۔ بعض محل عالی منزلت مہمانوں کے لیے وقف ہوتے رہے، جو وقتاً فوقتاً استنبول آ جاتے تھے۔ ہم یہاں صرف چند بڑے اور مشہور شاہی محلوں کا ذکر کریں گے۔

سرائے قدیم

یہ سلاطین عثمانیہ کا پرانا شاہی محل ہے، جو سلطان فاتح کے وقت سے سلطان محمود ثانی تک حکومت و ریاست کا خاص مرکز رہا۔ سلطان عبدالحمید ثانی کے زمانے میں یلدز کو "سرائے ہمایوں" کہتے تھے۔ حاجی خلیفہ کاتب چلپی نے اپنی کتاب "جہاں نما" کے ساتھ استنبول کا جو نقشہ دیا ہے، اس میں "سرائے قدیم" ہی کو "سرائے ہمایوں" لکھا ہے۔ گویا "سرائے ہمایوں" کسی خاص محل کا نام نہ تھا، سلطان وقت جس محل میں رہتا تھا، اسی کو عام لوگ "سرائے ہمایوں" کہنے لگتے تھے۔ اس قدیم شاہی محل کو بعد میں ترک "طوپ قپی سرائے" کہنے لگے۔

اب اس قدیم شاہی محل کی پہلی عمارت باقی نہیں رہی کیونکہ اس کی جگہ سر عسکریت کی عمارت [2]

۱؎ سفرنامہ، ص ۲۳۲   ۲؎ "مقام خلافت" ص ۱۰۹

بن گئی ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ مفصل کیفیت مسز میکس بلر اور فرانسس ایلیٹ نے اپنے سفرناموں میں پیش کی ہے۔ میں وہی کیفیت خلاصتہً یہاں پیش کروں گا۔ اس مقام کے عجائب خانوں کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

موقع اور مقام یہ قدیم شاہی محل استنبول والے خطّے کے عین آخری گوشے میں واقع تھا۔ غالباً یہی مقام تھا، جہاں پہلے پہل بزنطیم کے نام سے اس شہر کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اور اسی جگہ شاہی محل نیز بالا حصار تعمیر ہوئے تھے۔

اس ٹکڑے کے جنوب اور مشرق میں بحیرۂ مرمرا اور شمال میں "شاخ زرّیں" واقع ہے۔ سرسری نظر سے دیکھا جائے تو "سرائے قدیم" میں خشکی کا جتنا حصہ شامل ہُوا اس کے تین درجے ہیں۔ ہر درجہ پہلے سے کسی قدر بلند ہوگیا ہے۔ بحیرۂ مرمرا کی طرف کے دو آخری درجے باغات کے لیے وقف تھے۔ تیسرے اور بلند ترین درجے میں مختلف کوشک اور دوسری عمارتیں تھیں، جن کی تفصیل آگے آتی ہے۔ جب ریلوے لائن بنی تو وہ مغربی جانب سے اس حصّے میں شہر کے اندر داخل ہوئی جو بحیرۂ مرمرا پر واقع ہے اور سمندر کے ساتھ ساتھ چکّر کاٹتی ہوئی اپنے منتہا پر پہنچی۔ اس وجہ سے "سرائے قدیم" کے باغات کی پہلی صورت میں تغیّر پیدا ہوگیا کیونکہ ریلوے لائن کے باعث شکست و ریخت کا عمل جاری ہُوا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ریلوے لائن کے لیے کھدائی کرتے وقت ایک پختہ سُرنگ بھی نکلی تھی، جو محل سے بحیرۂ مرمرا تک جاتی تھی۔

محل کے بیرونی حصّے بیرونی دروازے کے اندر جا کر [illegible] پیش آتی تھی۔ سب سے پہلے اس عمارت کے سامنے پہنچتے تھے، جسے "چینلی کوشک" کہتے تھے۔ اسے عجائب خانے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ "چینلی کوشک" اور بعض دوسرے کوشکوں کے پاس سے گزرتے ہوئے سیّاح "باب ہمایوں" پر پہنچتا تھا۔ یہ "سرائے قدیم" کا پہلا دروازہ تھا۔ عید شوّال کی تقریب پر دربار منعقد کرنے کے لیے عثمانی سلاطین آتے تھے تو اسی دروازے سے گزر کر اندر جاتے تھے۔ اس دروازے کے پاس ہی سلطان احمد کا چشمہ ہے، جس کی کیفیت آگے چل کر بیان ہوگی۔

"باب ہمایوں" سے گزرتے ہی وہ مشہور صحن آجاتا تھا، جو ینی چیریوں سے منسوب ہُوا۔ یہاں سے

بحیرۂ مرمرا نیز ایشیائی ساحل کے برف پوش پہاڑوں کا بڑا ہی دلکش منظر آنکھوں میں طراوت پیدا کرتا تھا۔ اسی صحن میں چنار کا وہ عالی شان درخت تھا، جس کے نیچے جمع ہو کر ینی چری بغاوتوں کے مشورے کیا کرتے تھے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب بغاوت کا فیصلہ کر لیتے تو اپنی کیتلیاں الٹ دیتے۔ یہ اس حقیقت کا نشان ہوتا کہ وہ سلطان سے آیندہ کوئی چیز لینے کے روادار نہ ہوں گے۔ جب ان کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا تو یہی درخت اور یہی صحن ان کے تمام مشوروں کا مرکز رہا۔ یہیں آس پاس سان آئرین اور اسلحہ خانہ تھے۔ سان آئرین مسیحیوں کے زمانے میں گرجا تھا، پھر یہاں عام روایت کے مطابق قدیم یونانی مخطوطات جمع کر دیے گئے اور اسے عجائب خانہ بنا دیا گیا۔

اس صحن کے اطراف میں اصطبل نیز خدّام کے مکانات تھے۔ اس کے آگے وہ دروازہ تھا، جسے اورتہ قپو (وسطی دروازہ) کہتے تھے۔ یہاں اجازت نامۂ خصوصی دکھائے بغیر کوئی اندر نہیں جا سکتا تھا۔ اورتہ قپو کے اندر وہ مقام تھا، جسے عام اصطلاح میں "قتل گاہ" کہا جاتا تھا۔ ابتدائی دَور میں جن لوگوں کے لیے موت کی سزا کا حکم ہوتا تھا، وہ اسی جگہ مارے جاتے تھے۔ بعد میں اس مقام پر درخت لگا دیے گئے اور پھولوں کی کیاریاں بنا دی گئیں۔ اس کی دائیں جانب نو گنبد تھے۔ یہ محل سے متعلقہ باورچی خانے تھے۔

اصل محل

اس سے آگے کے دروازے کا نام "بابِ سعادت" تھا اور باورچی خانوں سے "بابِ سعادت" تک سروں کی دو رویہ قطار نہایت خوش نما معلوم ہوتی تھی۔ "بابِ سعادت" اصل شاہی محل کے داخلے کا دروازہ تھا۔ اسی حصے میں مختلف کوشک تھے، مثلاً مجیدیہ کوشک، بغداد کوشک[1]، گلخانہ کوشک۔ محل کے باقی حصّوں کی تفصیل پیش کرنا مشکل ہے۔ ایلیٹ نے اپنی کتاب میں اس محل کی بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں، مثلاً "بابِ سعادت" کی بائیں جانب ایک بُرج تھا اور دروازے کے قریب بنک طاشی نام ایک پتھر تھا، جہاں سلطان کے سوا سب کو سواری سے اُترنا پڑتا تھا اور بڑی بڑی سلطنتوں کے سفیر بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ "بابِ سعادت" کے اندر ایک ہال تھا، جسے دیوان کہتے تھے۔

---

[1] یہ کوشک سلطان مراد رابع نے فتح بغداد کے بعد بنوایا تھا اور اس کے دروازے پر یہ شعر کندہ کرایا تھا:

کشادہ باد بہ دولت ہمیشہ ایں درگاہ   بحقِ اشھدُ ان لا الٰہ الّا اللہ!

بہت سے کوشک تھے، مثلاً کوشک لُولُو، کوشک گُل، پالی کوشک، کوشک نو، آئینہ خانہ، طوپ کوشک، کوشک بحر، کوشک عرض، کوشکِ علائی۔ نہایت عالی شان حمام تھے، جو سلطان سلیم نے بنوائے تھے۔ سنگ مرمر کے بے شمار ایوان تھے، جن پر بیل بوٹے کا نہایت عمدہ کام ہُوا تھا۔ کھڑکیاں شیشے کی تھیں۔ ان پر بھی رنگین بیل بوٹے بنے ہوئے تھے اور باہر کا کوئی آدمی اندر کی کوئی چیز دیکھ نہ سکتا تھا۔ بادشاہوں کے حرم، ان کی مائیں، پھوپھیاں، بیٹیاں، بہنیں انھیں محلوں میں رہتی تھیں۔ ان کے ساتھ کنیزیں اور ملازمائیں تھیں۔ ان سب کے رہنے کا عمدہ انتظام تھا۔ پھر سلطانوں کے لیے راحت گاہیں اور خواب گاہیں الگ تھیں۔ ہر ایوان کا سامان بڑا ہی نادر تھا[۵]۔ یہاں مختلف ہال بھی تھے، مثلاً دربار ہال، جسے تخت گاہ سمجھنا چاہیے، خزینۂ ہمایوں، کتب خانہ، سفرا سے ملاقات کا ہال وغیرہ۔ اب پورے محل کو عجائب خانے میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس کے نوادر کا صحیح اندازہ کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ بے شائبۂ مبالغہ کہا جاتا ہے کہ جتنی قیمتی اور نایاب چیزیں یہاں موجود ہیں، وہ شاید ہی کسی دوسرے مقام پر ملیں۔

دُوسرے محل

سُلطان محمود ثانی کے زمانے سے سلاطین عثمانیہ کی توجہ اس قدیم شاہی محل کو چھوڑ کر موزوں مقامات پر نئے محل بنانے کی طرف منعطف ہوئی۔ چنانچہ سلطان محمُود نے بشکطاش کی چوٹی پر ایک چھوٹا سا کوشک بنوایا، جس کے لیے یلدز نام تجویز کیا۔ یلدز ترکی میں ستارے کو کہتے ہیں۔ سلطان عبدالمجید اور سلطان عبدالعزیز نے قصرِ بشکطاش، دولمہ باغچہ، قصرِ چراغاں وغیرہ تعمیر کرائے۔ سلطان عبدالعزیز زیادہ تر قصرِ چراغاں ہی میں رہتا تھا اور وہیں اس نے خودکُشی کی تھی۔ بعد ازاں سلطان مراد نے زندگی کے دن قصرِ چراغاں ہی میں گزارے۔ سلطان عبدالحمید کو معزولی کے بعد سالونیکا بھیج دیا گیا تھا۔ جنگ بلقان میں سالونیکا کے لیے خطرہ پیدا ہُوا تو سلطان کو استنبول لے آئے اور بیگلر بیگی محل میں رکھا۔ وہیں اس کی وفات ہوئی۔

جمہوریہ ترکیہ کے زمانے میں باہر کے معزز مہمانوں کے لیے قصرِ دولمہ باغچہ مخصوص ہو گیا ہے۔

قصرِ یلدز

سلاطین کے آخری دور میں قصرِ یلدز کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ جیسا کہ پہلے بتایا

۵۔ ایلیٹ کی کتاب ص ۲۶۸ - ۲۸۴

جا چکا ہے۔ ابتدا میں یہاں ایک چھوٹا سا کوشک بنایا گیا تھا (۱۸۳۲ء)۔ سلطان عبدالمجید نے ۱۸۵۳ء میں دولمہ باغچہ کا قصر تعمیر کرایا۔ سلطان عبدالحمید ثانی نے یلدز کو اپنا مرکز بنا کر ایک عظیم الشان محل تیار کرا دیا۔ اس کی عمارت جدید طرز کی تھی۔ جس حصے میں سلطان اور شہزادے رہتے تھے اس کے گرد ایک شش پہلو دیوار بنا دی گئی تھی۔ خود سلطان اور شہزادوں کی قیام گاہ کے درمیان بھی ایک اونچی دیوار حائل تھی۔ پھر باغات اور دوسرے ضروری مکانوں کے ارد گرد ایک اَور بڑی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی، جس کے گرد ہر وقت پہرا رہتا تھا۔

۱۸۹۴ء میں شدید زلزلہ آیا۔ اس کے بعد سلطان نے گیارہ کمروں کی ایک ایسی عمارت بنائی، جس میں آتش زدگی اور زلزلے دونوں سے محفوظ رہنے کا انتظام تھا۔

یلدز میں ایک تھیئٹر بھی تھا، جس میں معزز مہمانوں کی مدارات کے لیے کھیل دکھائے جاتے تھے۔ باغ میں ایک مصنوعی جھیل تھی، جس میں سلطان کبھی کبھی کشتی رانی کیا کرتے تھے۔

محل کی آرائش

محل کی آرائش ترکی قالینوں اور سلطانی کارخانے کے نفیس ریشمی پردوں سے کی گئی تھی۔ ان کے علاوہ شیشے یا آرائش کے دوسرے سامان یورپ سے بھی منگوا لیے گئے تھے۔ یہاں ایک عمارت "قصرِ مراسم" کے نام سے موسوم تھی، جس میں مشہور مصوروں کی تصویریں جمع تھیں اور یہ ذخیرہ بہت قیمتی سمجھا جاتا تھا۔ یہ عمارت شش پہلو اور سہ منزلہ تھی۔ قیصر ولیم ثانی فرمانروائے جرمنی استنبول گیا تھا تو اسے اسی عمارت میں ٹھہرایا گیا تھا۔

یلدز کے متعلقات

محل کے اندر مرمت کے مختلف کارخانوں کے علاوہ ظروفِ چینی کا بھی ایک کارخانہ تھا، جس میں نہایت نفیس برتن بنتے تھے۔ ایک سلح خانہ تھا، جس میں ہر قسم کے نئے اور پرانے اسلحہ رکھے گئے تھے۔ اسے بیک وقت میگزین اور عجائب خانے کی حیثیت حاصل تھی۔ علاوہ بریں ایک عجائب خانے میں قلمی کتابوں کا بڑا عمدہ ذخیرہ تھا۔ نیز پرانے چینی ظروف، جواہرات، مختلف صنعتوں کے نمونے اور نیچرل ہسٹری کا ایک نہایت عمدہ ذخیرہ تھا۔

محل کے ساتھ چار اصطبل تھے، جن میں سواری خاصہ کے گھوڑے رہتے تھے۔ ایک خاص عمارت حاجبِ اعلیٰ یا لارڈ چیمبرلین کے لیے تھی، جس کا نام "مرآۃ خلافت" میں "مابین ہمایوں" بتایا گیا ہے۔ "مابین ہمایوں" کا ایک دروازہ جامع حمیدیہ کے اُس صحن کی طرف کھلتا تھا، جہاں سلاملق کی

رسم ادا ہوتی تھی۔ جامع حمیدیہ یلدز کی بیرونی دیوار سے باہر تھی۔

بابِ عالی شاہی محلات کے بعد سلاطین عثمانیہ کے عہد کی جو عمارت بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے، وہ بابِ عالی ہے۔ دراصل یہ اسی عمارت کا نام تھا، جس میں وزیرِ اعظم، وزیرِ خارجہ اور وزیرِ داخلہ کے دفاتر تھے کیونکہ وزرائے سلطنت میں انھیں تین عہدوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ یہ عمارت، پرانے شاہی محل کے قریب واقع تھی اور اس کے پاس ہی مجلسِ وکلاء اور مجلسِ شورائے دولت کی عمارتیں تھیں۔ شیخ عبدالقادر مرحوم فرماتے ہیں کہ بابِ عالی کی عمارت اطالوی طرز پر بنی ہوئی ہے۔

اب ذرا ۱۹۰۷ء کے دفاتر کی کیفیت بھی ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ ہفتے میں کم و بیش اڑھائی دن تعطیل ہوتی تھی۔ جمعہ کو اسلامی تعطیل اور اتوار کو اس لیے تعطیل ہوتی تھی کہ دفتروں میں مسیحیوں کی تعداد خاصی تھی اور ان کے لیے وہ یوم تعطیل تھا۔ چہارشنبہ کو عموماً مجلسِ وکلاء منعقد ہوتی تھی۔ محکموں کے افسر مجلس کے کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔ باقی لوگ عملاً تعطیل مناتے تھے۔

۲۔ بابِ عالی کے دفاتر کوئی چار پانچ گھنٹے کے لیے کھلتے تھے۔

۳۔ دفتروں کے کمروں میں اہلکار سگرٹ اور قہوہ پیتے اور ملاقاتیوں کو پلاتے رہتے تھے۔

۴۔ اہلکاروں کی کرسیاں عموماً گدے دار، مخمل پوش اور نیچی ہوتی تھیں۔

۵۔ اہلکار کاغذ اور پرانی وضع کی روشنائی سے لکھتے تھے اور ریت سے سیاہی خشک کی جاتی تھی۔

۶۔ ہر سرکاری عمارت کے ساتھ ایک فراخ کمرہ مامورین کی نماز کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔[1]

عجائب خانے مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ عجائب خانے دو ہیں۔ ایک سرکاری، جہاں نہایت قدیم زمانے کے پتھر اور کتبے اور اس قسم کی یادگاریں ہیں۔ دوسرا کسی عیسائی سوداگر نے قائم کیا ہے۔ اس میں دنیا کے مختلف حصوں کے آدمیوں کی مورتیاں ہیں۔ یہ اس خوبی سے بنائی گئی ہیں کہ بالکل اصلی معلوم ہوتی ہیں۔[2]

---

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو "مقامِ خلافت" ص ۲۵-۲۹۔ [2] سفرنامہ ص ۷۱، ۷۲

بظاہر مولانا کو زیادہ چیزیں دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ "مقامِ خلافت" سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا نہایت نادر عجائب خانہ قدیم شاہی محل میں تھا۔ اسی کا مفصل ذکر مسز میکس مُلر نے کیا ہے۔ اس کی مختلف قیمتی چیزیں شیخ عبدالقادر کے بیان کے مطابق یہ تھیں:

۱ ۔ شاہ اسمٰعیل صفوی کا زرّیں تخت، جو سلطان سلیم اوّل کے عہد میں استنبول پہنچا۔ اس میں نادر جواہرات جڑے ہیں۔

۲ ۔ سلطان عبدالعزیز کا برنجی مجسمہ، جس میں وہ گھوڑے پر سوار دکھائے گئے ہیں۔

۳ ۔ ترکی زرہ بکتر کے نمونے اور آخری مسیحی فرمانروا کی تلوار۔ زمرد کے دستہ ہائے شمشیر۔

۴ ۔ لولو و مرجان سے بھرے ہوئے سونے چاندی کے طاس۔ طلائی کام کے زینے۔ مرصع زین پوش۔

۵ ۔ عثمانی ساخت کا تخت، جو صندل اور آبنوس سے بنایا گیا تھا، جس میں قیمتی سیپ اور ہیرے موتی جڑے تھے۔

۶ ۔ زمرّد کا ایک بڑا دانہ چھت سے آویزاں تھا، جس کا قطر چار انچ سے کم نہ ہوگا۔

۷ ۔ سلطان مراد رابع کا جڑاؤ زرہ بکتر، جو ۱۶۳۸ء میں فتح بغداد کے وقت پہنا تھا۔ پاس ہی ان کا خنجر رکھا تھا، جس کا دستہ نیز میان کا ایک حصہ الماس سے مرصع تھا۔

۸ ۔ سلاطینِ عثمانیہ کے لباس کے نمونے محمّد فاتح سے محمود مصلح تک۔

۹ ۔ رومہ، یونان، عرب اور روم کے بیش بہا سکّے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سی قیمتی چیزیں وہاں موجود ہیں، مثلاً مختلف عثمانی سلاطین کے تخت۔ قیمتی جواہرات اور نویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی عیسوی تک ظروف چینی کے مختلف نمونوں کا نہایت نادر اور بیش بہا مجموعہ، جن کی تعداد چھ ہزار ہے اور ایسا کوئی مجموعہ دوسری جگہ موجود نہیں۔

سب سے آخر میں اور سب سے بڑھ کر بیش بہا وہ تبرّکات ہیں، جو سلاطینِ عثمانیہ کے پاس حرمین شریفین کے خادم ہونے کی حیثیت میں پہنچے۔ مثلاً نبویؐ پرچم، عصائے مبارک، تلوار اور کمان، خرقہ مبارک۔ اسی طرح خلفاء سے منسوب متفرق چیزیں۔ وہ قرآن مجید بھی استنبول ہی میں ہے، جو حضرت عثمانؓ شہادت کے وقت تلاوت کر رہے تھے۔ جنگ کے زمانے میں ترک یہ قرآن مجید اور دوسرے نادر تبرکات حفاظت کے لیے مدینہ منورہ سے استنبول لے گئے تھے۔

عجائب خانۂ ینی چری

دوسرا عجائب خانہ، جس کی تفصیل "مقامِ خلافت" میں بیان کی گئی ہے، ینی چری عجائب خانہ تھا، جو اٰت میدان کے جنوب مغرب میں سلطان عبدالمجید اوّل نے قائم کیا تھا۔ بظاہر مقصود یہ تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے عہد بہ عہد لباس کی کیفیت زیادہ سے زیادہ اصل شکل میں پیش کی جائے۔ اس غرض سے مٹی کے نہایت عمدہ بُت بنا کر انھیں ایسے رنگ روغن سے آراستہ کر دیا گیا کہ بالکل اصلی انسان معلوم ہوں اور انھیں مختلف عہدوں اور عُہدوں کے لباس پہنا دیے گئے۔ "مقامِ خلافت" میں ان بُتوں کے پندرہ گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی

۱ - حرم کے خواجہ سراؤں کا افسر، حاجب، چند بَونے اور دیگر خادم۔

۲ - دو فوجی افسر نیز فوجی مطبخ کا باورچی اور سقّا۔

۳ - امیر البحر و ناظر بحریّات، ترجمانِ وزارت اور دیگر بحری افسر۔

۴ - ینی چریوں کا کمانڈر اعلیٰ، شاہی شمشیر بردار، میر تشریفات اور شاہی گارد کے سپاہی۔

۵ - ناظرِ خارجہ، بابِ عالی کا مفتی، سفیرِ عثمانی کا اردلی، ہرکارہ اور سارجنٹ۔

۶ - ناظرِ داخلہ، باش کاتب، میر جلوس وکلاء، اردلی وغیرہ۔

۷ - شیخ الاسلام، قاضی عسکر روم ایلی، سبز عمّامہ داروں کا افسر، قاضی استنبول، قاضئ مکّۂ مکرّمہ اور ادیب و کاتب عثمانی، مؤذن اور اردلی۔

۸ - صدرِ اعظم، محلّات کا افسر، دربانوں کا افسر، کاتب ثانی، سائیس، اردلی۔

۹ - معینِ وزارت اور دوسرے اہلکارانِ محکمہ۔

۱۰ - رئیسِ بلدہ، خفیہ پولیس کے افسر وغیرہ۔

۱۱ - نائب مہتمم اور اہلکارانِ توپ خانہ۔

۱۲ - خزانچی، مہتمم دار الضرب وغیرہ۔

۱۳ - توپچی، عَلَم بردار، ینی چری سپاہی۔

۱۴ - جلّاد اور اس کے ساتھی۔

۱۵ - سلطان سلیم کی اصلاح شدہ فوج کے افسر اور سپاہی، نیز سلطان محمود کے سوار اور پیادے۔[۱]

ان سے لباس کے تغیرات کا اندازہ ایک ہی نظر میں ہو سکتا ہے۔

---

[۱] "مقامِ خلافت" ص ۶۰ - ۶۲

تازہ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت استنبول میں کم از کم گیارہ عجائب خانے ہیں، جن میں آثار قدیمہ، اعلیٰ مصنوعات اور دوسری قیمتی چیزوں کے علاوہ تصویروں اور مجسموں کے بھی نادر نمونے موجود ہیں۔ ایک عجائب خانہ صرف بحریات کے لیے مخصوص ہے۔

چشمے

چشموں میں سب سے زیادہ شہرت چشمۂ سلطان احمد کو حاصل ہے۔ یہ سلطان احمد ثالث نے نہایت عمدہ سنگ مرمر کا بنوایا تھا اور اس میں بڑے ہی خوب صورت بیل بوٹے ہیں۔ یہ عمارت مستطیل ہے۔ جو عبارتیں اس کی زینت ہیں، وہ سنہری حروف میں سبز اور فیروزی زمین پر لکھی گئی ہیں[۱]۔

مسز میکس ملر اس چشمہ کے متعلق لکھتی ہیں کہ یہ بڑا ہی خوب صورت ہے۔ اسے ایک چھوٹا سا مکان سمجھنا چاہیے۔ سفید سنگ مرمر پر سنہری بیل بوٹے ہیں اور ان کے حاشیے نیلے اور سبز ہیں۔ اگرچہ یہ گزشتہ صدی (اٹھارھویں صدی) میں بنایا گیا تھا، لیکن اتنا صاف اور مجلا ہے کہ معلوم ہوتا ہے، کل مکمل ہوا ہوگا[۲]۔

ماہرین فن کے نزدیک یہ چشمہ ترکوں کی آرائش کاری کا نفیس ترین نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی استنبول میں چشمے یا سبیلیں موجود ہیں، مثلاً "مقام خلافت" میں چشمۂ توپ خانہ، چشمۂ زینب سلطان، صعوق چشمہ، سبیل محمود ثانی، سبیل عبدالحمید اول، سبیل ینی والدہ سلطان اور سب سے آخر میں قیصر ولیم فرمانروائے جرمنی کا چشمہ، جو اس نے سیاحت استنبول کی یادگار میں بنوایا تھا۔

۱۔ "مقام خلافت" ص ۵۰

۲۔ LETTERS FROM CONSTANTINOPLE ص ۲۶

پانچواں باب

کتابوں کے بیش بہا گنجینے

سب سے بڑا سرمایۂ فخر استنبول کے لیے سب سے بڑا سرمایۂ فخر اس کے بیش بہا علمی خزینے یعنی کتابوں، خصوصاً مخطوطات کے نادر گنجینے ہیں، جن کی وجہ سے اسے نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ پوری مشرقی اور مغربی دُنیا میں ممتاز ترین مقام حاصل ہے۔ ممکن ہے کسی جگہ استنبول سے زیادہ مخطوطات موجود ہوں، لیکن جیسے مخطوطات استنبول میں ہیں، وہ شاید ہی کہیں مل سکیں۔ کتابوں کی خاصی تعداد ایسی ہے، جو مصنفوں نے اپنے قلم سے لکھ کر سلاطین اور وزراء کی خدمت میں پیش کی۔ پھر تمام بڑی بڑی اسلامی سلطنتوں کی لُٹی ہوئی علمی دولت زیادہ تر تُرکوں ہی کے ہاتھ آئی اور انھوں نے اسے کمال احتیاط سے محفوظ کر دیا۔ اگرچہ بعض انقلابات میں پوری حفاظت نہ ہو سکی۔

ان کتب خانوں کے متعلق جو معلومات ہمارے سامنے آئیں، ان کے بڑے ذریعے دو ہیں۔ اوّل مولانا شبلی مرحوم، جنھوں نے ۱۸۹۲ء میں استنبول کا سفر کیا تھا۔ دوم مولانا محمد شفیع (صدر ادارۂ دائرۂ معارف اسلامیہ)، جنھوں نے ۱۹۵۶ء میں اور ایک مرتبہ اس کے بعد ان کتب خانوں کو دیکھا۔

کُتب خانوں کی تعداد مولانا شبلی کی سیاحت کے زمانے میں قصرِ ہمایوں کے علاوہ کتب خانوں کی تعداد پینتالیس تھی، جن میں کتابیں مجموعی طور پر پچاسی ہزار تھیں۔ مولانا نے ان میں سے اُنتیس کتب خانوں کے نام درج کر دیے تھے، جن میں سے جامع ایاصوفیہ، جامع بایزید، جامع محمد فاتح، جامع نوری عثمانیہ، جامع سلیمیہ کے کتب خانے بھی شامل تھے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ان میں سے چودہ کی فہرست ہائے کتب مکمل ہو چکی تھیں۔ ہر کتب خانے کے ساتھ اتنی جائداد وقف کر دی گئی تھی کہ معمولی مصارف، خصوصاً ملازموں کی تنخواہیں ادا ہوتی رہیں[1]۔

---

[1] سفرنامہ روم و شام و مصر ص ۶۰، ۶۱

اہتمام کی کیفیت اوقاف کا پورا انتظام حکومت کی تحویل میں تھا اور کتب خانوں کا انتظام بھی وقف ہونے کی حیثیت سے حکومت نے سنبھال رکھا تھا، لہٰذا کوئی چیز ضائع ہونے نہ پائی۔ مولانا لکھتے ہیں:

"ملازمین باوجود قلتِ تنخواہ کے نہایت متدیّن اور راست کردار ہیں۔ کتب خانۂ عاشر آفندی کا وقف اس قدر کم ہے کہ لائبریرین کو معمولی خوراک اور دو روپے ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے، لیکن جو شخص لائبریرین مقرّر کیا گیا ہے، اس قدر دیانت دار اور فرائض کا پابند ہے کہ اس سے زیادہ ہونا ممکن نہیں۔ کتب خانے کی دیواروں پر انگوری بیلیں چڑھی ہیں۔ ایک دن میں نے اس سے کہا کہ: اگر تم انگوروں کو بیچ ڈالو تو تم کو معقول آمدنی ہو سکتی ہے۔ بولا کہ واقف کی شرط کے موافق یہ انگور صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جو کتب خانے میں کتاب پڑھنے کی غرض سے آئیں، اس لیے میں ان سے کسی طرح فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔"[1]

لائبریرین کی دیانت مسلّم، لیکن کتب خانہ وقف کرنے والے بزرگ کا اہتمام ملاحظہ ہو کہ کتابیں مطالعہ کرنے والوں کے لیے کتب خانے میں انگوروں کا انتظام کر دیا۔ اس سے اصل شخص کے جذبۂ خیر و صلاح کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

کتابوں کی خصوصیات مولانا نے یہاں کے کتب خانوں کی جو خصوصیتیں بتائی ہیں، وہ قابلِ ملاحظہ ہیں۔ مثلاً:

۱۔ جو کتابیں یہاں موجود ہیں، عموماً قدیم الخط، صحیح اور اساتذۂ سابقہ کی صحیح کردہ ہیں۔ قدیم اور نایاب کتابیں، جن کے دو ہی چار نسخے دُنیا میں ہوں، ان کا صحیح ہونا سب سے زیادہ مقدّم ہے۔ مصر کے کتب خانے میں بھی قدیم کتابیں کچھ کم نہیں، لیکن اکثر زمانۂ حال کی لکھی ہوئی ہیں۔

۲۔ بعض کتب خانوں، خصوصاً حمیدیۂ قدیم میں یہ خصوصیت ہے کہ اکثر کتابوں کا کاغذ زرّیں یا زر افشاں ہے اور حاشیے پر سنہری بیل بوٹے بنے ہیں۔ ان تکلفات کے ساتھ خط نہایت

---

[1] سفرنامہ روم و شام و مصر ص ۶۱، ۶۲

اعلیٰ درجے کا ہے۔

۳۔ دولتِ عباسیہ کے عہد میں یونانی و مصری کتابوں کے جو ترجمے ہوئے تھے، میرا خیال تھا کہ وہ دنیا سے ناپید ہو گئے، لیکن یہاں آکر ثابت ہُوا کہ یہ خیال صحیح نہ تھا۔ پورے ترجمے تو موجود نہیں، لیکن جس قدر بھی موجود ہیں، غنیمت ہیں۔

۴۔ قضات کے حالات میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں، مگر کسی نے اس طرف توجہ نہ کی کہ حالاتِ زندگی کے ساتھ ان کے فیصلے اور احکام بھی نقل کرتا۔ یورپ کی تصنیفاتِ حال کے سوا ایسی تصنیف کا کہیں پتا نہ تھا، لیکن کتب خانۂ ینی جامع میں ایک کتاب ایسی موجود ہے۔ اس میں ہر شخص کے حال کے ساتھ اس کے بہت سے فیصلے اور تجویزیں نقل کی ہیں اور مقدمات کی صورت بیان کی ہے۔

۵۔ فنِ ادب میں ایسی کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی، جس میں مضامینِ شعری کی تاریخ ہو، یعنی فلاں مضمون اوّل فلاں شاعر نے لکھا۔ پھر فلاں فلاں نے اس میں اضافے کیے، صورتیں بدلیں۔ عاشر آفندی کے کتب خانے میں ایک ضخیم کتاب خاص اس موضوع پر دیکھی۔ مصنّف نے دعویٰ کیا کہ ہر قسم کے مضامین عرب جاہلیت نے ایجاد کیے۔ پھر متاخرین نے انھیں ترقی دی اور نئے نئے پیرایے نکالے۔ مثلاً وہ سب سے پہلے ہر مضمون کے لیے عرب جاہلیت کے شعر لکھتا ہے۔ پھر بتاتا ہے، اسلامی شعراء میں سے فلاں شاعر نے یہ مضمون بدل کر اس طرح لکھا۔ عہدِ بنو امیہ میں اس کی یہ صورت تھی۔ عہدِ بنو عباس میں اس کی یہ صورت رہی۔

۶۔ مشہور حکماء اور ائمۂ فن کی کتابیں جس کثرت سے یہاں موجود ہیں، اور کہیں نہیں مل سکتیں۔ ابنِ رشد نے ارسطو کی تصانیف کا ایک نہایت مفید اور جامع خلاصہ لکھا تھا۔ اصل کتاب مفقود ہو گئی، اس کا لاطینی ترجمہ یورپی کتب خانوں میں رہ گیا۔ ایک ترکی عالم نے لاطینی کا ترجمہ عربی میں کیا اور اس میں کچھ اضافے بھی کیے۔ یہ راحت پاشا کے کتب خانے میں تھا۔[۱]

---

[۱] "سفرنامہ روم و شام و مصر" ص ۶۲ - ۶۴

عام حالات

مولانا نے تاریخ و ادب کی بعض نادر کتابوں کے نام بھی لکھے ہیں، جن میں سے متعدد کتابیں اب چھپ چکی ہیں۔

کتابوں کی فراہمی اور اہتمام اپنی جگہ مسلّم تھا، لیکن انھیں رکھنے کا طریقہ وہی پرانا تھا۔ مثلاً مولانا کے بیان کے مطابق بعض کتب خانوں میں الماریاں تک نہ تھیں۔ ایک چبوترے پر کتابوں کا ڈھیر رکھ کر اردگرد لوہے کا کٹہرا لگا دیا گیا تھا۔ مولانا کے زمانۂ سیاحت میں سب سے اچھی حالت کتب خانۂ حمیدیہ جدیدہ کی تھی۔ مختلف کتب خانوں میں خوانندگانِ کتب کے بیٹھنے کے لیے فرش تھا، البتّہ سامنے بنچیں بچھادی گئی تھیں تاکہ ان پر رکھ کر کتابیں پڑھ سکیں۔ حمیدیۂ جدیدہ کی عمارت بھی خوب صورت اور وسیع تھی۔ میز کرسیاں بلکہ کاؤچ بھی تھے، جن پر ریشمی گدّے پڑے تھے، لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ یہ کتب خانہ بھی الٰہ آباد کی پبلک لائبریری کی برابری نہیں کرسکتا۔[۱]

مولانا محمد شفیع کے ارشادات

مولانا محمد شفیع نے اسلامی کتب خانوں کی تاریخ کا ذکر مجملاً کرچکنے کے بعد لکھا ہے کہ عربی، فارسی اور ترکی مخطوطات کی تعداد پروفیسر احمد زکی ولیدی طوغان کے بیان کے مطابق ایک لاکھ پنتیس ہزار ہے۔ فرماتے ہیں:

۱۔ آلِ عثمان کی فتوحات بحرِ خزر سے اٹلانٹک تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان بادشاہوں نے کتاب دوستی کی وجہ سے مفتوحہ ممالک کے بعض ذخائرِ کتب مسجدوں اور مدرسوں پر وقف کردیے۔

۲۔ سلاطین عثمانی نیز ان کے امراء، وزراء اور "شیوخِ اسلام" کی قدردانی کے باعث بہت سی کتابیں خود مصنّفین نے اپنے قلم سے لکھ کر انھیں بھیجیں، مثلاً مولانا جامی نے سلطان بایزید دوم کو اپنا کلیات بھیجا۔

۳۔ ۱۸۸۲ء کے حدود میں ایک فرانسیسی مجلّہ میں لکھا گیا تھا کہ استنبول کے کتاب خانوں کے بہت سے مخطوطات لوگوں نے مستعار لیے، پھر واپس نہ کیے اور ان میں سے بعض یورپی کتب خانوں میں پہنچ گئے۔ اس وقت صرف آٹھ کتب خانوں میں، جن کا تعلق مشہور مسجدوں سے تھا، تقریباً ایک لاکھ مخطوطات باقی تھے۔

---

[۱] "سفرنامہ روم و مصر و شام" ص ۶۱

۴ - سلطان عبدالمجید اوّل کے زمانے میں کتب خانے کی عمارت مرمّت طلب ہوئی تو کتابیں مسجد سلطان احمد کے تہ خانے میں رکھ دی گئیں اور نم آلود ہونے کے باعث ناقابلِ استفادہ ہوگئیں۔

کتب خانوں کی فہرستیں

مولانا محمد شفیع فرماتے ہیں کہ کتابوں کی جو فہرستیں پہلے مرتب ہوئی تھیں، وہ کم و بیش چالیس سال پیشتر کی تھیں اور ان میں صرف کتابوں کے نام درج تھے۔ اور ان میں بھی صحت کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی فہرستیں شائقین کے لیے زیادہ کار آمد نہیں۔ ۱۹۵۱ء مستشرقین کی ایک بین الاقوامی کانگرس بمقام استنبول منعقد ہوئی تھی۔ اس موقع پر ایک مختصر فہرست نوادر اور مخطوطات کی مرتب کی گئی تھی۔

حال میں یونیسکو نے تین پروفیسروں کی ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے جو فارسی دواوین و مجموعہ ہائے اشعار کی فہرستیں مرتب کر رہی ہے۔

مخطوطات کی وسعت کا اندازہ صرف اس امر سے ہو سکتا ہے کہ دانش گاہِ تہران کے ایک فاضل نے چودہ مہینے استنبول میں رہ کر صرف عربی، فارسی منتخب مخطوطات کی نقلیں مائیکروفلم کے ذریعے سے حاصل کیں، جو آٹھ سو تھیں۔ کتابوں کی تعداد زیادہ ہونے کے علاوہ تجلید و تذہیب اور مصوّری کے نادر نمونے بھی ایسے ہیں کہ کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہ چاہے۔ اس کے بعد مولانا نے مختلف نادر مخطوطات کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> "مخطوطات کے علاوہ استنبول میں خزینۂ اوراق و اسناد بھی ہے، جس میں آلِ عثمان کی تاریخ اور ثقافت کا نہایت اہم مواد موجود ہے۔"

یگانہ علمی کارنامے

ظاہر ہے کہ ماضی کے شاندار علمی کارناموں کا مطالعہ کیے بغیر ہم اپنی تہذیب کی مکمل تاریخ ترتیب نہیں دے سکتے اور اس سلسلے میں سروسامان کا جتنا نادر ذخیرہ استنبول میں ہے، کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتا۔ عربی، فارسی اور ترکی کے ایسے مخطوطات، جو خود مصنفوں نے لکھے تھے، کم از کم پانسو اور سات سو کے درمیان ہوں گے۔

بہرحال یہ کتب خانے اس حقیقت کا روشن ثبوت ہیں کہ ترک صرف رزم و پیکار اور کشورستانی ہی میں یگانۂ روزگار نہ تھے، علم و فضل کے دائرے میں ان کے کارنامے حرب و ضرب سے بھی بدرجہا زیادہ شاندار تھے۔ وسیع سلطنت کی داستان صرف تاریخ کے اوراق پر باقی رہ گئی، لیکن ان کے علمی کارنامے استنبول کو دنیا بھر کے اہلِ علم کا بہت بڑا مرجع و مرکز بنا رہے ہیں۔

چھٹا باب

باسفورس اور جزیرے

باسفورس استنبول کا ذکر باسفورس کا سرسری نقشہ پیش کیے بغیر مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔ دُنیا میں آبناؤں کی کوئی کمی نہیں اور بعض کو تاریخی و جغرافیائی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے، لیکن اس اہمیت کے علاوہ حُسن و جمال، خوبیِ مناظر اور دلآویزیِ ماحول میں شاید ہی پانی کا کوئی تنگ دھارا اُنیس میل کے اس رقبے کا مقابلہ کر سکے، جس میں سے باسفورس گزرتی ہے اور اس بحیرۂ اسود اور بحیرۂ مرمرا کے پانیوں میں اتصال پیدا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ و جغرافیہ کے نقطۂ نگاہ سے ایسی اہمیت کسی آبنائے کو حاصل نہیں جو دردانیال کو حاصل ہے اور جسے قدرت نے بحیرۂ روم اور بحیرۂ مرمرا کے اتصال کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہ دونوں آبنائیں استنبول کے حصے میں آئیں۔ ایک اس کے مشرق میں ہے، دوسری مغرب میں۔

باسفورس، جسے یونانی میں باسپورس کہتے ہیں، دو یونانی لفظوں سے مرکب ہے، جس کے معنی ہیں راہِ گاؤ یعنی گائے کے گزرنے کا راستہ۔ یونانی اساطیر کی ایک کہانی یہ ہے کہ سب سے بڑا یونانی دیوتا جسے اہلِ یونان زیوس[1] اور اہلِ رومہ جو پیٹر کہتے تھے، آرگوس[2] کے بادشاہ کی بیٹی پر عاشق ہو گیا، لیکن اپنی بیوی (ہیرا یا جونو) سے خوف زدہ تھا، لہٰذا اس نے محبوبہ کو گائے کی شکل میں تبدیل کر کے بحیرۂ اسود میں بٹھا دیا۔ بیوی کو اس خفیہ عشق کا پتا چل گیا۔ اس نے صد چشم مخلوق کو، جسے یونانی آرگُس کہتے تھے، اس بچھڑے کی نگرانی کے لیے مقرر کر دیا۔ اس مخلوق کی صرف دو آنکھیں ایک وقت میں سوتی تھیں اور باقی بیدار رہتی تھیں۔ زیوس نے اپنے ایک کارندے کو بھیجا کہ پہریدار کو قتل کر دے۔ جونو نے ایک گئو مکھی گائے پر مسلط کر دی۔ اُس نے اسے اتنا بیتاب کیا کہ وہ پہاڑوں کو چیرتی ہوئی پہلے بحیرۂ مرمرا میں اور وہاں سے مصر پہنچ گئی۔ مصر پہنچتے ہی آرگوس کی شہزادی کو اس کی اصل صورت مل گئی۔ اس نے شادی کی اور بیٹا پیدا ہوا۔ عموماً اسے چاند کی دیوی بتایا جاتا ہے۔

---

[1] ZEVIS [2] ARGOS جنوبی یونان کا ایک شہر اور اس نام کی ایک خلیج بھی یونان کے جنوب مشرق میں ہے۔

پہاڑوں کو چیرتے ہوئے بحیرۂ مرمرا میں پہنچنے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بحیرۂ اسود اور بحیرۂ مرمرا کے درمیان یہ آبنائے پیدا ہوگئی۔ اسی بنا پر اس کا نام راہِ گاؤ رکھا گیا، یعنی وہ راستہ جو گائے نے پیدا کیا۔

ترک اسے بوغاز کہتے ہیں۔ بوغاز کے لفظی معنی ہیں وہ درہ، جو دو پہاڑوں کے درمیان ہو۔ گویا یونانیوں کے افسانوی نام کے بجائے بوغاز اس کا زیادہ موزوں نام ہے۔ بہر حال شیخ عبدالقادر مرحوم کے بیان کے مطابق تمام سیاح متفق اللفظ ہو کر کہتے ہیں کہ بوغاز سے زیادہ خوش منظر جگہ دُنیا بھر میں ملنی مشکل ہے[۵]۔

عام کیفیت

جیسا کہ اُوپر بتایا جا چکا ہے، آبنائے کُل اُنیس میل لمبی ہے اور اس کے دونوں کنارے جمہوریۂ ترکیہ کے قبضے میں ہیں۔ آبنائے کا سب سے کم عرض اُس جگہ ہے، جہاں ایشیائی یا اناطولی ساحل پر بایزید یلدرم نے اناطولی حصار اور یورپی ساحل پر محمّد فاتح نے روم ایلی حصار بنوایا تھا۔ یہ عرض زیادہ سے زیادہ آٹھ سو گز یعنی تقریباً نصف میل ہوگا اور سب سے زیادہ عرض استنبول کی جانب سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر بمقام بیوک درہ ہے، جو غالباً دو میل کے قریب ہوگا۔

استنبول سے ہر وقت کشتیاں چلتی رہتی ہیں، جو اس آبنائے کے مختلف حصّوں میں جاتی ہیں تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر سٹیشن بنے ہوئے ہیں۔ یہ کشتیاں تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے ہر سٹیشن پر ٹھہرتی ہیں تاکہ اترنے والے مسافر اُتر جائیں اور سوار ہونے والے سوار ہو جائیں۔

یورپی سفرا نے آبنائے کے مختلف حصّوں میں خاص مکانات بنا لیے تھے اور وہ وقتاً فوقتاً وہاں جا کر رہتے تھے ترک سلاطین اور امرا نے بھی محل تعمیر کر لیے تھے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، بعض شاہی محل کنارِ آب تک پہنچ گئے تھے بعض اصحاب نے پنجرہ دار چوبی عمارتیں بنالی تھیں، جنھیں ترکی میں یالی کہتے تھے۔

دولت مندوں کو جہاں پہاڑ اور آبنائے کے درمیان تھوڑی سی بھی جگہ مل گئی تو تین تین چار چار منزل کی عمارتیں کھڑی کر لیں۔ ہر منزل کے چھجّے تھوڑے تھوڑے بڑھا کر اوپر کی منزل کے لیے خاصی جگہ پیدا کر لی۔ ٹامس ایلم نے اپنی کتاب ۱۸۳۹ء میں شائع کی تھی۔ اس میں ایسی عمارتوں کی نہایت خوب صورت تصویریں موجود ہیں۔

---

[۵] "مقام خلافت" ص ۹۹

"مقامِ خلافت" میں آبنائے کے دونوں کناروں کے سٹیشن اٹھائیس بتائے گئے ہیں۔ پندرہ یورپی ساحل پر اور تیرہ ایشیائی ساحل پر، لیکن میرا خیال ہے کہ بحیرۂ اسود کی جانب روشنی کے جو مینار آبنائے کی آخری حد پر واقع ہیں، ان تک دونوں جانب کے سٹیشنوں کی تعداد زیادہ ہو گی۔ شیخ عبدالقادر مرحوم نے شیخ مشیر حسین قدوائی مرحوم کے ساتھ آبنائے میں اس مقام تک سفر کیا تھا، جسے اُنھوں نے نراپیہ قرار دیا۔ اہلِ یورپ تھراپیہ کہتے ہیں۔ ممکن ہے، اصل یونانی نام یہی ہو، لیکن حاجی خلیفہ کاتب چلپی کے نقشے میں اسے طربیہ بتایا گیا ہے اور یہ بڑا موزوں نام ہے۔ شیخ صاحبان برطانوی سفیر سے ملنے کے لیے وہاں گئے تھے اور یہ مقام بیوک درہ کے قریب واقع ہے۔ گویا شیخ صاحبان نے اس سے آگے آبنائے میں سفر نہیں کیا تھا۔ اسی مقام کے متعلق ایلیٹ نے لکھا تھا:

> "طربیہ میرے حافظے میں ہمیشہ کسی ایسے ستارے کے شاعرانہ خواب کی حیثیت سے گھومتا رہے گا، جو زہرہ یا مریخ سے قریب تر ہو۔"[1]

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ایران کے کیانی بادشاہ زرکسیز (اخشیارشا) نے یونان پر حملہ کیا تھا تو اپنی فوج اس جگہ سے گزاری تھی، جہاں آج کل اناطولی حصار اور روم ایلی حصار واقع ہیں۔ نیز سکندرِ اعظم یہیں سے گزرتا ہُوا ایرانی سلطنت پر حملہ آور ہُوا تھا۔ یہ دونوں بیان غلط ہیں۔ زرکسیز اور سکندر دونوں نے دردانیال کو عبور کیا تھا۔

سُلطانی جلُوس کی سالگرہ شیخ عبدالقادر مرحوم نے سلطان عبدالحمید ثانی کے جلوس کی سالگرہ پر بھی آبنائے کی سیر کی تھی۔ فرماتے ہیں کہ سالگرہ کی رات کے وقت جلوہ ہی اُور تھا:

> "یوں تو تمام شہر میں چراغاں کی رونق اور تماشائیوں کا ہجوم دیکھنے کے لائق ہوتا ہے، مگر بوغاز کی سجاوٹ آدمی کو دنگ کر دیتی ہے۔ امرائے دولت اور اقربائے شاہی کے مکانات بقعۂ نور نظر آتے ہیں۔ ہزاروں چراغوں اور قندیلوں کی روشنی کا عکس پانی پر پڑتا ہے اور عجب بہار دیتا ہے۔ مکانوں کے پیچھے پہاڑیوں کی

---

[1] DIARY OF AN IDLE WOMAN IN CONSTANTINOPLE ص ۲۰۴

بلندی پر آتش گلزار بنی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔ روشنی کرنے والے اپنی خوش مذاقی اور صنعت کے جوہر دکھاتے ہیں اور ہر شخص آرائش میں جدت پیدا کرنا چاہتا ہے ۔۔۔ جہازوں اور کشتیوں پر جو روشنی ہوتی ہے، وہ اس کے علاوہ ہوتی ہے۔ کئی چھوٹی کشتیوں پر اس خوبی سے روشنی کی جاتی ہے کہ معلوم ہوتا کہ بط آتشی پانی میں تیر رہی ہے۔ جب چاروں طرف روشنی کا یہ عالم میلوں تک چلا جائے تو اندازہ ہو سکتا ہے، منظر کیسا دلفریب ہوگا۔ حسنِ اتفاق دیکھیے کہ جلوس کے موقع پر شب ماہ ہمیں میسر آگئی، شب ماہ کو بوغاز کے پانی کا نظارہ نہایت ہی پیارا ہوتا ہے۔

آبنائے کے ساحل آبنائے باسفورس عین استنبول کے نیچے بحیرہ مرمرا سے ملی ہے اور اس کی ایک تنگ شاخ شمالی جانب نکل گئی ہے، جسے "شاخِ زریں" کہتے ہیں۔ اس طرح اصل استنبول نیز مقابل کے خطّے (غلطہ، پیرا) نے جزیرہ نماؤں کی صورت اختیار کر لی ہے ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرف کے ممتاز مقامات کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

"یورپی ساحل": غلطہ سے چلیں تو سب سے پہلے توپ خانہ آتا ہے ۔ پھر دولمہ باغچہ، بشکطاش، اورتہ کوئی، قورو چشمہ، ارنود کوئی، بیک۔ اسی حصے میں خدیوِ مصر کا محل تھا۔ بیک سے آگے روم ایلی حصار۔ حصار سے آگے بالطہ اوغلی لیمان۔ دستنیہ، ینی کوئی، قلندر، طربیہ، کرج بورنو، کفہ لی کوئی، بیوک درہ، صاری یار، روم ایلی کاورک، بیوک لیمان، روم ایلی منار

ایشیائی ساحل: بحیرۂ مرمرا سے بحیرۂ اسود تک ۔ حیدر پاشا، اسکدار یا سقوطری، سلطان سرائے، قوزقونچو، استاورو ز سرا سے، بیگلر بے کوئی، چنگل کوئی، وانی کوئی، کوچک صو، کوک صو، اناطولی حصار، قندیلو باغچہ، چبوقلو، سلطان کوشک، بیک کفر، یالی کوئی، امور کوئی، اناطولی کاواک، اناطولی منار۔

ان مقامات کے عقب میں نہایت خوش منظر جگہیں ہیں۔ ان میں سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر بلغراد ہے، جہاں کا جنگل بہت مشہور ہے۔ کاغذ خانہ سے براہِ راست بھی بیوک درہ اور بلغراد جاتے ہیں۔ آبنا کے راستے جائیں تو بیوک درہ سے اتر کر بلغراد پہنچتے ہیں۔

جزیرے بحیرۂ مرمرا میں بہت سے جزیرے ہیں، مثلاً درہ دانیال سے آگے بڑھتے ہی جزیرے آجاتے ہیں، جن میں سب سے بڑے جزیرے کا نام مرمرا ہی ہے، لیکن یہاں جن جزیروں کا ذکر مقصود ہے،

وہ استنبول کے سامنے واقع ہیں، جنھیں عموماً "جزائر شہزادگان" کہتے ہیں کیونکہ ایک روایت کے مطابق شہزادوں کو وہاں نظر بند رکھا جاتا تھا تاکہ ملک تاج و تخت کے لیے جنگ کے فتنوں سے محفوظ رہے۔

ان کی صحیح تعداد کے بارے میں یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ سولہ سے کم نہ ہوں گے۔ چار خاصے بڑے ہیں۔ چار پانچ چھوٹے چھوٹے ہیں۔ باقی محض پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں، جو سمندر سے اوپر نکل آئی ہیں۔ ان میں سب سے بڑے جزیرے کو پرنکپو[1] کہتے ہیں اور ترکی میں اس کا نام بیوک اطہ ہے، جس کے معنی ہیں بڑا جزیرہ۔

عثمانیوں سے پیشتر ان جزیروں میں مسیحیوں نے بہت سی خانقاہیں بنائی تھیں۔ اب یہ نہایت عمدہ سیرگاہیں ہیں اور جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، بیوک اطہ میں ایک تفریح گاہ اور غسل گاہ بھی بن گئی ہے۔

قز قلعہ سی

آبنائے باسفورس کے مغربی دہانے پر اسکدار یا سقوطری کے سامنے ایک چٹان پر روشنی کا مینار میتول کمنی نسوا (۱۱۴۳ء - ۱۱۸۰ء) نے بنوایا تھا۔ ترکوں نے اس کا نام قز قلعہ سی رکھا۔ اہلِ یورپ اسے لیانڈر کا برج[2] قرار دیتے ہیں۔ ایک قصہ مشہور ہے، جو ہمارے ہاں کے قصۂ سوہنی مہینوال سے ملتا جلتا ہے۔ لیانڈر ایک یونانی نوجوان تھا جو سسٹوس کے مندر کی ایک پجارن پر عاشق ہو گیا۔ وہ ہر رات دردانیال سے تیرتا ہوا اپنی محبوبہ کے پاس پہنچتا تھا۔ ایک رات سسٹوس کے منار کی روشنی بجھ گئی، لیانڈر کو منزلِ مقصود کا پتا نہ چل سکا اور وہ سمندر میں ڈوب گیا۔ اہلِ یورپ نے دردانیال کے واقع کو غلطی سے آبنائے باسفورس کے دہانے کا واقعہ قرار دے لیا اور قز قلعہ سی کو لیانڈر کا برج کہنے لگے۔

1ے PRINKIPO

2ے LEANDER'S TOWER

ساتواں باب

سلاملق یا موکبِ سُلطانی

عہدِ سلاطین کی ایک اہم یادگار ہیرلڈلیم نے عہدِ جسٹینین کے حالات بیان کرتے ہوئے ہپوڈروم کے کھیلوں کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ سلاطین عثمانیہ کے عہد کی بھی ایک رسم کا ذکر سُن لیجیے، جو جمہوریت سے پیشتر استنبول پہنچنے والے ہر سیّاح نے خاص اہتمام سے دیکھی اور اس کا مفصل ذکر کیا۔ سلاطین کا دَور جاچکا اور اس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں۔ ان کے ساتھ مختلف شاہانہ مراسم بھی گئے۔ لیکن استنبول کی تاریخ کے صفحات کم ازکم ایک رسم سے خالی نہ رہنے چاہئیں، جو صدیوں تک ہر جمعہ اور عیدین کی تقریبات پر پوری شان وعظمت سے ادا ہوتی رہی۔ یہ سلاملق کی رسم تھی، جس کا لفظی ترجمہ ترکی میں "سلام کرنا" ہے۔ غالباً اس کی ابتدا سرداران فوج کے سلام خصوصی ہی سے ہوئی تھی اور سلاطین نے ایک وقت میں اجتماعی سلام کے لیے سلاملق کی بنا ڈال دی۔

مسز میکس مُلر، فرانسس ایلیٹ اور دوسرے سیّاحوں کے علاوہ شیخ عبدالقادر مرحوم نے بھی اس رسم کا ذکر بہ طورِ خاص کیا ہے، لیکن سب سے اچھّا اور مکمل بیان مولانا شبلی مرحوم کا ہے، جس کے مختلف حصّے ہم یہاں اقتباساً درج کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں، اس رسم میں:

"جو شان وشوکت اور عظمت وجلال ظاہر ہوتا ہے، زبان یا قلم کے ذریعے سے اس کی تصویر کھینچنی مشکل اور سخت مشکل ہے۔ باوجودیکہ مہینے میں چار بار اور سال میں اڑتالیس دفعہ یہ موقع آتا ہے۔ اس وجہ سے اس کو ایک معمولی چیز خیال کیا جاتا ہے، تاہم ہمیشہ تماشائیوں کا یہ ہجوم ہوتا ہے کہ لوگ درختوں اور آدمیوں کے کندھوں پر چڑھ کر تماشا دیکھتے ہیں۔ یورپ کے اکابر اور سیّاح، جو قسطنطنیہ کی سیر کو آتے ہیں، اس موقع کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ موکبِ ہمایونی کی گزرگاہ پر ایک بالاخانہ ہے۔ معزّز لوگوں کو ٹکٹ لے کر بیٹھنے کی اجازت ملتی ہے چنانچہ ہر جمعہ کو ان تماشائیوں کا ایک معتدبہ مجمع موجود رہتا ہے[۱]۔

[۱] "سفرنامہ روم وشام ومصر" ص ۷۵

سلطانی وُرُود کا نظارہ

مولانا وطن ہی میں سلاملق کی کیفیت سُن چکے تھے، لہٰذا استنبول پہنچ کر اس کی سیر کا ارادہ کیا۔ ایک شامی عرب کو ساتھ لے کر جامع حمیدیہ جا پہنچے۔ وہاں دُور دُور تک سپاہیوں کے پرے جمے تھے اور موکبِ سلطانی تک نظر کی رسائی بھی مشکل پائی تو لوٹ آئے۔ پھر حسین حسیب آفندی سے ملے جو بمبئی میں قونصل رہ چکے تھے اور مولانا نے محاربۂ روس کے زمانے میں تین ہزار کی رقم انھیں کے ذریعے سے استنبول بھیجی تھی۔ اس بنا پر تعارف تھا۔ وہ پولیس کمشنر تھے۔ انھوں نے کہا کہ جمعہ کو مسجد میں آجانا ٹکٹ لے رکھوں گا۔ چنانچہ — مولانا وہاں پہنچے تو حسین حسیب آفندی نہ ملے۔ دیر تک مسجد کے دروازے پر ان کا انتظار کرتے رہے:

"قریباً ایک بجے سلطان کی آمد آمد کا غُل ہُوا تو فوجیں دُور دُور تک پھیل کر ہلال کی شکل میں صف آرا ہوگئیں اور تمام راستے رُک گئے۔ میں مایوس ہو کر مسجد میں داخل ہُوا اور افسوس کرتا تھا کہ یہ جمعہ بھی خالی گیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ گرج کی سی ایک آواز آئی اور تمام میدان گونج اُٹھا۔ معلوم ہُوا کہ سلطان کی سواری قریب آپہنچی اور یہ "بادشاہم چوق یشا"[۱] کا نعرہ تھا، جو ترکوں کا قومی نعرہ ہے۔ یہ نعرے پے در پے تین بار بلند ہوئے۔ کوکبۂ سلطانی مسجد تک آپہنچا اور نعروں کی گونج ابھی تھم نہیں چکی تھی کہ مؤذّن نے جو سلطان کے مشاہدۂ جمال کا نظارہ کر رہا تھا، اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ دونوں آوازیں مل کر دل پر عجیب اثر کرتی تھیں۔ سلطان کھلی گاڑی پر سوار تھے۔ صحن داخلِ مسجد نہیں۔ گاڑی صحن تک آئی اور دیوار کے قریب آکر ٹھہری۔ مسجد دو منزلہ ہے۔ اوپر گیلری بنی ہے، جو خاص سلطان کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ سلطان گاڑی سے اُتر کر اوپر کی منزل میں گئے۔ ساتھ ہی گیلری کے دریچوں پر اطلسی پردے چھوڑ دیے گئے کہ ان پر کسی کی نگاہ نہ پڑ سکے۔"[۲]

خُطبہ

لوگ اطمینان سے بیٹھ چکے تو خطبہ شروع ہو گیا۔ خطیب ترک تھا، اس لیے اس کے لہجے میں

---

[۱] ہمارا بادشاہ دیر تک زندہ رہے۔ [۲] "سفرنامہ"، ص ۷۵، ۷۶۔

وہ کیفیت نہ تھی، جو عرب سے مخصوص ہے۔ دوسرے خطبے میں سلطان المعظم کی طرف اشارہ کر کے یہ الفاظ پُرجوش آواز میں پڑھے اللّٰھم انصر ھٰذ السلطان .... السّلطان ابن السّلطان... تو عجیب کیفیت پیدا ہوئی:

"میرا یہ حال تھا کہ آنکھ سے متصل آنسو جاری تھے اور دیر تک بے اختیار زبان سے دُعائیہ الفاظ نکلتے رہے... نماز کے بعد اتفاق سے حسین حسیب آفندی ملے اور شکایت کی کہ میں ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ کہاں غائب ہو گئے تھے؟ بالاخانے کا ٹکٹ تو اب مل نہیں سکتا۔ میں تمھارے لیے اس سے زیادہ عمدہ موقع نکالتا ہوں... افسرانِ فوج اور پاشا صحن کے داہنے طرف صف باندھ کر کھڑے تھے۔ حسین نے مجھے اسی صف میں لا کر کھڑا کر دیا اور لوگوں سے کہا کہ یہ ہمارے مہمان ہیں۔ ایک معزز افسر پیچھے ہٹ گیا اور میرے لیے جگہ خالی کر دی"[۱]

فوج کی سلامی سلطان نماز کے بعد گیلری سے اُترے تو ایک زینے پر ٹھہر گئے، جہاں کوئی شخص انھیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد فوجوں کی آمد شروع ہوئی۔ ہر فوج ایوانِ شاہی کے سامنے سے گزرتی ہوئی مسجد کے صدر دروازے سے داخل ہوتی تھی اور دوسرے دروازے سے نکل جاتی تھی:

"صفوں کی ترتیب، سوار، پیادہ، بحری، بری، توپچی، برق انداز، تُرک، کُرد، عرب کے جُدا جُدا دستے موزوں اور باقاعدہ رفتار، زرق برق اسلحہ، مختلف اور خوش نما وضع کی وردیاں، فوجوں کا پے در پے آنا اور وفادارانہ جوش کے ساتھ شہنشاہ کے سامنے سے گزرنا ایسا عجیب و غریب سماں تھا، جو کسی طرح بیان نہیں ہو سکتا۔ عربوں کا رسالہ، جو امپیریل گارڈ ہے، ان کے سروں پر عمامے تھے اور سبز شملے ہوا میں اُڑ کر عجیب لطف دکھاتے تھے۔ متصل تین گھنٹے تک یہ فوجی دریا لہریں لیتا رہا اور کم و بیش دس ہزار سپاہی گزرے۔ اخیر میں سلطان کے دونوں

---

[۱] "سفرنامہ" ص ۷۶، ۷۷

شہزادے آئے اور عجب شان سے آئے۔ فوجی لباس تھا اور کمر سے تلواریں بندھی تھیں۔ اگرچہ دس دس بارہ بارہ برس کا سن تھا، لیکن جس انداز سے گھوڑوں پر سوار تھے اور ان کے چہروں سے جس جرأت وشان کا اظہار ہوتا تھا، بیان میں نہیں آسکتا۔[1]

مولانا کی بیخودی

سلطان زینے سے اُترے تو پاشاؤں کی صفیں، جن میں خود مولانا بھی شامل تھے، دفعتہً سلام کو جھکیں۔ خود مولانا کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے:

"میں ابتدا سے محوِ حیرت تھا اور آنکھوں کو ٹکٹکی لگ گئی تھی۔ پہلے سے ارادہ تھا کہ سُلطان کی زیارت ہوگی تو نہایت نیازمندی کے ساتھ آداب بجالاؤں گا، لیکن ازخود رفتگی کا یہ عالم ہُوا کہ تمام صف کی صف دیر تک رکوع میں رہی اور میں اسی طرح ٹکٹکی باندھے کھڑا رہا، البتہ زبان پر دعائیہ الفاظ جاری تھے اور وہ بھی قصداً نہیں بلکہ ایک بے اختیاری حالت تھی۔"[2]

سلطان سلامی ختم ہونے کے بعد زینے سے اُتر کر گاڑی کی طرف بڑھے تو مولانا سے صرف تین چار ہاتھ کے فاصلے پر گزرے۔ مولانا نے اس واقعے سے متأثر ہو کر بڑے پُرجوش شعر کہے۔[3]

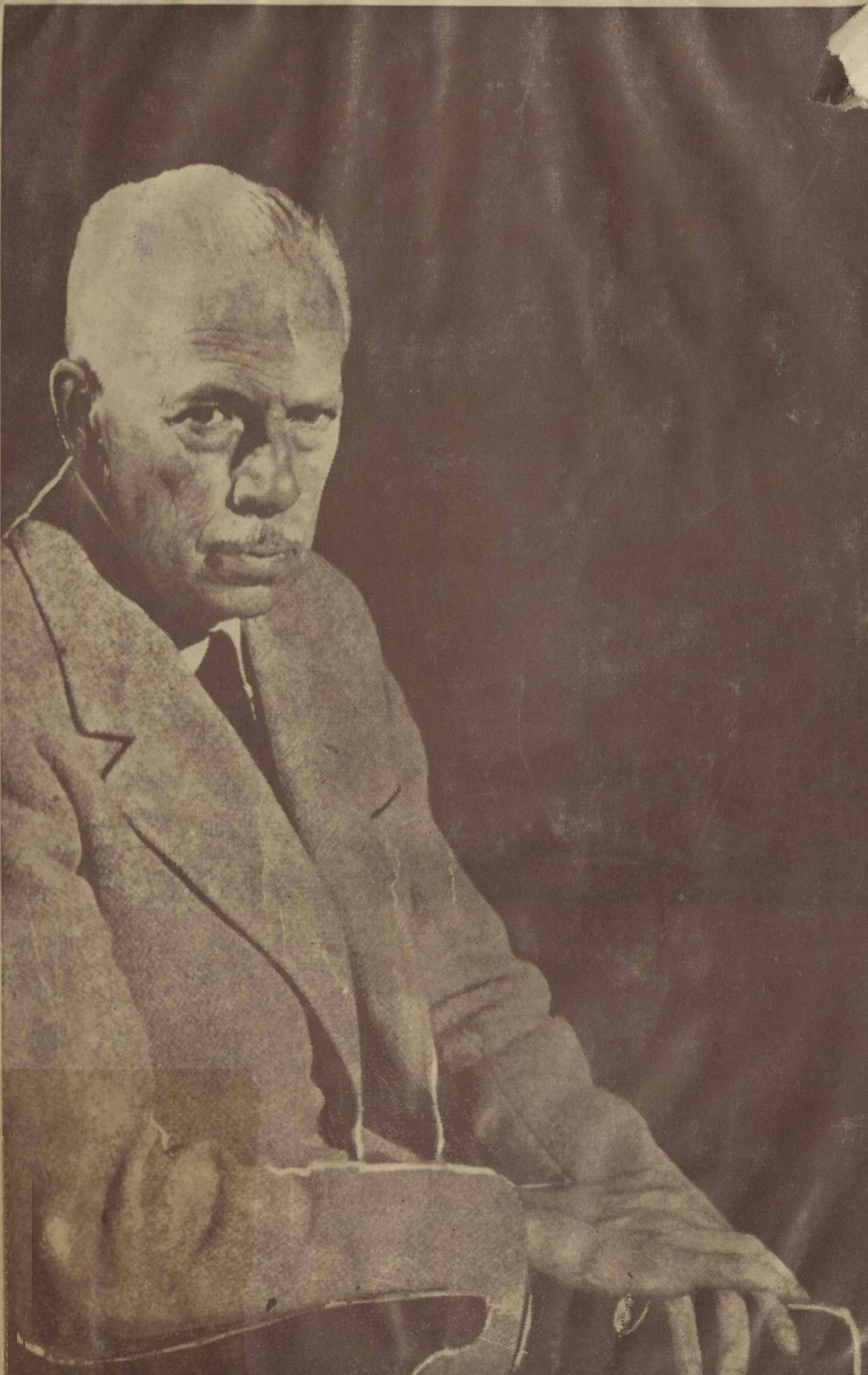
ہر شے مسافر، ہر چیز راہی

یہ سلاملق کی رسم تھی، جو پادشاہی کے قیام تک جمعہ کے جمعہ ادا ہوتی تھی۔ عیدین کے موقع پر یہ رسم زیادہ شان وشوکت سے ادا کی جاتی تھی۔ استنبول کی سرزمین نے جہاں شہنشاہوں کے جلال کی دوسری تقریبیں دیکھیں، وہاں یہ تقریب بھی صدیوں تک اس کے دلکشا مناظر کا جزو بنی رہی، لیکن دوام کسی بھی شے کو حاصل نہیں؛

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں!

---

[1] "سفرنامہ" ص ۷۷۔ [2] ایضاً ایضاً۔ [3] ایضاً ص ۷۸



ہیرلڈ لیم (وفات ۱۹۶۲ء)